ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی

۔خواب وخیال۔

''خواب وخیال'' میں فکروفن اور شعروسخن کا ایک دل آسا جہاں آباد ہے۔اگرچہ میرٹھ نے بہت سے شاعروادیب اور سخنوروہنرور پیدا کیے لیکن جوہرایک ہی پیدا کیا ہے۔یعنی بی۔ایس۔جین جوہر۔ان کے شخصی جوہراور شعری گوہر کی پرتیں راقم مضمون پرایک دم نہیں کھلیں، دھیرے دھیرے ان کی صنفی صفات اور انسانی کرامات عیاں ہوتی گئیں۔جوہر صاحب سادہ دل اور سادہ مزاج شخص وشاعر ہیں۔اپنے اوپر کسی طرح کا ملمّع نہیں چڑھاتے۔مجھے یہ کہنے میں تکلف نہیں بلکہ تکلیف ہورہی ہے کہ انہوں نے اردوزبان وادب کی بڑی اور بے بہا خدمت کی ہے۔نیز اردو کی عظمت کے عہدِ طفلی سے ہی سداگیت گائے ہیں۔تاہم اردو والوں نے، اردو قلم قبیلے نے اور ادب ادب کے سرپرستوں نے ان کا ابھی تک مکمل اور صحیح طور پر اعتراف نہیں کیا ہے اور نہ ہی ان کو اردو سے غیر معمولی محبت کا صلّہ ہی دیا ہے۔اب وقت آ گیا ہے کہ نقّادانِ ادب اور ادبی ادارے اس جانب خصوصی توجہ مبذول کریں، کیونکہ جوہر صاحب کی شعری خدمات کا سلسلہ نصف صدی سے تجاوز کر چکا ہے......ڈاکٹر خالد حسین

۔دال میں کچھ کالا ہے۔

''دال میں کچھ کالا ہے'' وقار مسعود خان کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔کتاب پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک باشعور قلمکار کی طرح اپنے گردوپیش میں موجود بہت سے مضحک کرداروں کا بغور مشاہدہ کیا ہے۔یہ وہ مضحک کردار ہیں جن میں سے اکثر کو اس معاشرے میں معزز اور محترم سمجھا جاتا ہے۔وقار مسعود نے بہت سلیقے اور احترام کے ساتھ ان مضحک ومعزز کرداروں کو اپنی تحریروں کا حصہ بنا دیا۔یہ مضامین درحقیقت اس معاشرے کا حقیقی چہرہ ہیں جس میں ہم اور آپ زندہ رہنے کی تگ ودو کر رہے ہیں۔وقار مسعود نے معاشرے کی بدصورتیوں کو ہنس کر قبول کرلیا ہے۔وہ ان بدصورتیوں پر تنہا ہنسنے کی بجائے قاری کو بھی مسکرانے اور بعض مقامات پر قہقہہ لگانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔وہ ایک مسیحا کی طرح طنز کے نشتر استعمال کرتا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ مسیحا اگر پیشہ ورنہ ہو تو اپنا نشتر جان لینے کی بجائے جان بچانے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ان کی رواں دواں شگفتہ تحریریں پڑھنے والے کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں۔وہ بعض معروف مزاح نگاروں کی طرح لطیفوں اور پرائے جملوں کی مدد سے اپنی تحریر کو خوبصورت نہیں بناتے بلکہ اس میں وہ تخلیقی حسن پیدا کرتے ہیں جو فی زمانہ مزاحیہ تحریروں سے معدوم ہوتا جارہا ہے۔آخری بات یہ کہ بارود سے اٹے ہوئے اس دکھ بھرے معاشرے میں مسکراہٹیں بکھیرنا ہی اصل جہاد ہے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ وقار مسعود خان نے یہ جہاد اپنے قلم کے ذریعے کیا ہے......رضی الدین رضی

۔اردوشعروادب کی معمار خواتین۔

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نے اردو شعروادب کی معمار خواتین کے عنوان سے کتاب لکھ کر ہمارے ادب کی ایک دیرینہ ضرورت کو پورا کیا ہے۔اس تنقیدی کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں جن خواتین کے شعروادب کو موضوع اظہار بنایا گیا ہے وہ فی الحقیقت رنگارنگ تخلیقی اوصاف کی حامل ہیں۔یہ شاعر نقاد اور افسانہ نگار خواتین ہر اعتبار سے عالمی اور نسوانی ادب کی روایات سے مکمل طور پر واقف ہیں۔ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کا اختصاص یہ ہے کہ انہوں نے جدید ترین علمی وفکری رجحانات سے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے اپنے قومی اور سماجی تناظر میں عورتوں کی حیثیت متعین کرنے کی سنجیدہ کوشش کی ہے۔ہماری خواتین انسانی سطح پر جس قسم کی برابری کی تمنا رکھتی ہیں اس کا عکس شبیہ الحسن صاحب کے زیرِ نظر مضامین میں بخوبی نظر آتا ہے..........ڈاکٹر سعادت سعید

N.P.R- 063

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو

جلد۱۹ شمارہ: مارچ، اپریل ۲۰۱۱ء

مجلسِ مشاورت

قارئین چہارسُو

زرِ سالانہ

دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ

"فیض کا فلسفہ"

جہاں میں امن وچین ہو
یہ فلسفہ ہے فیضؔ کا
اسی لیے سخن سخن
پکارتا ہے فیضؔ کا
نہ جبر ناگہاں کرو
خدا کی کائنات پر
رکھو نہ اپنے ہاتھ تم!
ستمگروں کے ہاتھ پر
یہ زندگی حسین ہے
تباہ کررہے ہو کیوں؟
فضا میں نفرتوں کا تم
یہ زہر بھر رہے ہو کیوں؟
بچھا رہے ہو تیرگی کو
نُور کے جہان میں
بنا رہے ہو نخلِ جاں
سِتم کے سائبان میں
خدا کی بارگاہ میں
نہ پستیاں بساؤ تم!
بلندیوں کی چاہ میں
مٹا کے کرگسوں کو تم
امان کے فاختہ کو دو
سبے کو جس پہ فخر ہو
وہ شان فاختہ کو دو
بقا کا راستہ ہے وُہ
جو راستہ ہے فیضؔ کا
جہاں میں امن وچین ہو
یہ فلسفہ ہے فیضؔ کا

تنویر ظہور
(لاہور)

بانی مدیرِ اعلیٰ
سید ضمیر جعفری

❍❍❍

مدیر مسؤل
گلزار جاوید

❍❍

معاون مدیران
بینا جاوید
فاری شا
محمد انعام الحق

❍

چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو

رابطہ: 537، ویسٹریج-III، راولپنڈی۔ فون: 92-51-5462495 فیکس: 5490181 ای۔میل: chaharsu@gmail.com

پرنٹر: فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

متاعِ چہارسو

☆

قرطاسِ اعزاز

مسعود مفتی

کے نام

''وطن کی آبروُ''

م مثالِ شمع تیری زندگی ہے ترے دم سے ہر اِک سُو روشنی ہے

س "سرِ [۱] راہے" "کھلونے [۲] " رکھ دیے ہیں سرِ صحرا چمن، تجھ سے کھلے ہیں

ع عقیدت اور محبت کا مُرقع تری تحریر کا ہر لفظ ارفع

و وفا و مہر کو معنی دئے ہیں گُلوں کے چاک دامن بھی سِئے ہیں

د دئے جلتے ہیں تیری گفتگو سے ''رگِ سنگ [۳]'' آج بھی اُس سے ہی دھڑکے

ا ابھی تک قول تیرے دل نشیں ہیں ترے افکار دل میں جاگزیں ہیں

ل لہُو سے تُو نے جو تحریر لکھی وہ ہے تفسیر گویا زندگی کی!!

ر رکھا تُو نے بھرم انسانیت کا ستارہ بن کے تیرا نام چمکا

ح حقیقت کا مرقّع بات تیری وطن کی آبرو ہے ذات تیری

م مقامِ دوستی سے آشنا ہے سخن میں سوز بھی تیرے بھرا ہے

ا ابھی تک نقش تیرا نام دل پر تری باتوں سے ذہن اب بھی مُعطّر

ن نہیں تجھ کو صلہ کی کوئی پروا ہے مدّاح آج بھی ہر کوئی تیرا

م مزاجِ حرف تُو پہچانتا ہے!! تو لفظ ومعنی سے بھی آشنا ہے

ف فروزاں تیرے دم سے آدمیت ترے دم سے ہویدا ہے شرافت

ت ترا نوکِ قلم ہے تیری حُرمت ہے ایوانِ ادب میں تیری عظمت

ی یہ تیرا ''ہم نفس [۴] '' اور ''سالگرہ [۵] '' یہ تیرے نام کو رکھیں گے زندہ

[۱]، [۲]، [۳]، [۴]، [۵] تخلیقاتِ مسعود

سرورانبالوی (راولپنڈی)

پیہم رواں

ڈاکٹر مقصودہ حسین

(راولپنڈی)

ا۔تعلیمی پس منظر

☆ مڈل۔اسلامیہ ہائی سکول راولپنڈی

☆ میٹرک(1947)میونسپل کارپوریشن ہائی سکول لاہور۔

☆ ایف ایس سی۔پری میڈیکل(1949)۔اسلامیہ کالج لاہور۔

☆ بی ایس سی(1951)۔اسلامیہ کالج لاہور۔

☆ پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ۔انٹرنیشنل افیئرز(1953)پنجاب یونیورسٹی لاہور۔

☆ ڈپلومہ ان جرنلزم(1954)پنجاب یونیورسٹی لاہور۔

☆ ایم اے انگلش لٹریچر(1956)گورنمنٹ کالج لاہور۔

☆ پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ ان پبلک ایڈمنسٹریشن(1960)سینٹ کیتھرین کالج۔کیمبرج یونیورسٹی انگلینڈ

۲۔پیشہ ورانہ مصروفیات

(الف)بعدازملازمت

☆ اردوادب

☆ صحافت اردواورانگریزی روزناموں میں سیاسی وسماجی مضامین

☆ سیاست۔ایک مختلف اورغیرروایتی سیاسی پارٹی۔''پاک جمہور''کے بانی

(ب)دورانِ ملازمت

☆ لیکچرارشعبہ انگریزی۔دیال سنگھ کالج لاہور۔ستمبر1956تادسمبر1958

☆ سول سروس آف پاکستان میں شمولیت1958

☆ سول سروس اکیڈمی لاہور۔20دسمبر1958تامئی1959

☆ ڈسٹرکٹ ٹریننگ۔کاکسز بازار۔چٹاگانگ مشرقی پاکستان مئی 1959 تا ستمبر1959

☆ ڈپلومہ، پبلک ایڈمنسٹریشن ۔کیمبرج یونیورسٹی انگلینڈ ستمبر 1959 تا جولائی1960

☆ اسسٹنٹ کمشنر بہاولپور۔جولائی1960تافروری1961

☆ ایس ڈی ایم پنڈدادنخان۔فروری1961تاجنوری1962

☆ ایس ڈی ایم پنڈی گھیب۔جنوری1962تااپریل1963

☆ سیکشن آفیسر فنانس ڈیپارٹمنٹ لاہور۔اپریل1963تااگست1963

☆ ڈپٹی سیکرٹری فنانس ڈیپارٹمنٹ لاہور۔اگست1963تااپریل1964

☆ ڈپٹی سیکرٹری اسٹیبلشمنٹ لاہور۔اپریل1964تاستمبر1964

☆ ڈپٹی کمشنر/ پولیٹیکل ایجنٹ لورالائی بلوچستان۔ستمبر 1964 تااپریل 1967

☆ ڈپٹی کمشنرلائلپور(فیصل آباد)۔اپریل1967تامارچ1969

☆ ڈپٹی کمشنرلاڑکانہ۔مارچ1969تاجنوری1970

☆ ڈپٹی کمشنرلاہور۔جنوری1970تامئی1971

☆ سیکرٹری ایجوکیشن حکومت مشرقی پاکستان۔مئی1971تادسمبر1971

☆ جنگی قیدی ہندوستان۔دسمبر1971تاجنوری1974

☆ ڈپٹی سیکرٹری اکنامک افیئرزڈویژن۔اپریل1974تااپریل1974

☆ کمشنرراولپنڈی ڈویژن۔اپریل1974تاجولائی1975

☆ جائنٹ سیکرٹری اکنامک افیئرزڈویژن۔جولائی1975تامارچ1980

☆ ایشین ڈویلپمنٹ بنک۔منیلا(ڈیپوٹیشن پر)فلپائن۔مارچ 1980 تا اپریل1991

☆ ممبرفنانس اینڈایڈمنسٹریشن۔نیشنل ہائی وے اتھارٹی۔مئی 1991 تانومبر 1992

☆ او۔ایس۔ڈی۔نومبر1992تامئی1993

☆ ایم۔ڈی نیشنل زکوٰۃ فاؤنڈیشن۔مئی1993تاجون1994

☆ ریٹائرمنٹ بطورایڈیشنل سیکرٹری۔10جون1994

ریٹائرمنٹ کے بعدپنجاب پبلک سروس کمیشن میں بطورممبرنامزدکیاگیا۔جس پرمعذرت کرلی۔

۳۔مطبوعات

(الف)قومی ادب

نام	عنوان	پہلی اشاعت
☆ رگِ سنگ(افسانے)	1965 کی جنگ کے پس منظر میں لکھے ہوئے افسانے۔چھ ستمبر ادبی انعام یافتہ	1962
☆ چہرے(رپورتاژ)	مشرقی پاکستان کے آخری لمحوں کی داستان۔آدم جی انعام یافتہ	1974
☆ ریزے(افسانے)	1971 کی جنگ کے پس منظر میں لکھے ہوئے افسانے	1975
☆ لمحے(ڈائری)	1971 میں مشرقی پاکستان کے شب وروز	1976
☆ ہم نفس(رپورتاژ)	مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی داستان۔ہجری انعام یافتہ(ڈاکٹر عبدالحق انعام)	1996

(ب)دیگرادب

☆ سرِراہے(مزاح) انشایئے اورافسانے 1964

☆ محدب شیشہ جابرمعاشرے اوراقدار میں فرد کے المیے 1964 (افسانے)

☆ کھلونے(ناول) بیمار معاشرے میں رزمِ خیروشر۔ٹیلی 1964 ویژن سیریئل ''جنون'' کا ماخذ

☆ تکون(ڈرامے) تقصیر،تعذیراورتقدیرمیں جکڑے ہوئے 1982 افراد کے المیے

☆ سالگرہ(افسانے) روایت سے الجھنےوالی سوچ کی گونج 1996

☆ توبہ(افسانے) مشکل زندگی اور پریشان فرد 2006

(ج) 1994 سے ان کے مضامین اورکالم اردواورانگریزی روزناموں میں باقاعدگی سے شائع ہورہے ہیں۔ان میں وہ سیاسی اورمعاشرتی مسائل پرلکھ رہے ہیں۔

۴۔اعزازات

(الف)تعلیمی

☆ ایف۔ایس۔سی(میڈیکل) یونیورسٹی میں دوسری پوزیشن

☆ بی۔ایس۔سی یونیورسٹی میں دوسری پوزیشن

☆ پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ یونیورسٹی میں پہلی پوزیشن

☆ ایم اے انگلش یونیورسٹی میں تیسری پوزیشن

☆ رول آف آنر(بی ایس سی)اسلامیہ کالج لاہور

(ب)ادبی

☆ 6 ستمبرادبی انعام۔ 1969 پاکستان رائٹرگلڈ کی جانب سے افسانوی مجموعے ''رگِ سنگ''

☆ آدم جی ادبی انعام۔ 1974 پاکستان رائٹرگلڈ کی جانب سے رپوتاژ ''چہرے'' پردیا گیا۔

☆ قومی ادبی ایوارڈ۔1417ھ ''بابائے اردو مولوی عبدالحق ایوارڈ'' 1997 اکادمی ادبیات کی جانب سے رپورتاژ ''ہم نفس'' پردیا گیا

☆ ان کے ایک افسانے کا انگریزی ترجمہ ''Good Luck'' کے نام سے امریکن میگزین شارٹ اسٹوریز انٹرنیشنل میں 1985ء میں شائع ہوا۔

☆ مسعود مفتی کا نام ''انٹرنیشنل آتھرز اینڈ رائٹرز ہُوازہُو'' میں 1982 کے ایڈیشن میں جوانگلینڈ سے شائع ہوا شامل ہے۔

☆ تمغہ قائداعظم ۔ 1968۔صدر پاکستان کی جانب سے ملک کی اہم خدمات انجام دینے کے صلے میں(بعدازاں حکومت نے فوجی اعزازات منسوخ کردیے)

☆

مسعود مفتی کے ایک قاری کی حیثیت سے میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کا شمار ہمارے بہت بلند پایہ افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ وہ ہمہ وقت ''Full Time'' ادیب نہیں ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں Professional افسانہ نگاروں جیسی تصویرکشی نہیں۔سعادت حسن منٹو،راجندر سنگھ بیدی،احمد ندیم قاسمی اور انتظار حسین کی تحریروں سے مسعود مفتی کی تحریروں کا تقابل اس لئے نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے موضوعات ان سے مختلف،ان کا نکتۂ نظر منفرد اور اسلوبِ بیاں مختلف ہے۔بنیادی طور پر مسعود مفتی ایک سرکاری ملازم اورآفیسر کیڈر میں ہیں اس لئے ان کی تحریروں میں تھوڑی بہت بغاوت کے ساتھ احتیاط بھی دکھائی دیتی ہے۔

احمد فراز (●)

میں شروع ہی میں یہ تسلیم کرلوں کہ مسعود مفتی میرے انتہائی پسندیدہ وچیدہ افسانہ نگارنہیں ہے۔لیکن مجھے جہاں کہیں ان کا افسانہ نظرآتا ہے میں اس کوترجیحی طور پرپڑھتا ہوں اوراس سے(اپنی بساط کے برابر) کچھ نہ کچھ سیکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔کبھی اپنے موضوع کے انتخاب کی وجہ سے یا کبھی اندازِ بیاں اور پیرایۂ اظہار کی وجہ سے،ان کے افسانے پڑھ کرکچھ نہ کچھ سیکھنے کا موقع ضرور ملتا ہے۔کبھی کبھی یہ سبق منفی بھی ہوسکتا ہے اس لیے کہ یہ پڑھنے والے پرمنحصر ہے کہ وہ کیا سیکھتا ہے اور کیا نہیں۔افسانہ نگار نے تو اپنا کام دکھا دیا۔اس کے بعد کھیل ختم۔

آصف فرخی (کراچی)

''اب تو مرجانے کو جی چاہتا ہے''

مسعود مفتی

احمد ندیم قاسمی 10 جولائی 2006ء کو فوت ہوئے۔ اس سے چندروز پہلے تقریباً 20 جون کے آس پاس میری ان سے آخری ملاقات ہوئی۔ مگر اس ملاقات کو سمجھنے کے لیے کچھ اور ملاقاتوں کا ذکر ضروری ہے۔

پہلی ملاقات تو نہیں کہہ سکتا۔ البتہ بے نام سی شناسائی ان کہانیوں کی معرفت ہوئی جو لڑکپن کی ناسمجھی کے باوجود دل ودماغ پر چھا جاتی ہے۔ آنے والے دنوں میں جب شعور کے تارے دھیرے دھیرے ابھرنے لگے تو ساتھ ہی ایک باریک سا چاند بھی طلوع ہونے لگا۔ جو پسندیدہ کہانی کار احمد ندیم قاسمی کا نام تھا۔ پھر یہ چاند وقت گزرنے کے ساتھ ایک رومانٹک سا ہیولیٰ بنتا گیا۔

اس ذہنی اور جذباتی تعلق سے جب میں نے 1957ء میں افسانہ نگاری کا سفر شروع کیا تو دیگر رسالوں میں محدود سی شرکت کی نسبت میری زیادہ تر تحریریں پہلے محمد طفیل کی زیر ادارت نقوش اور پھر احمد ندیم قاسمی کی زیر ادارت فنون میں شائع ہوتی رہیں۔ دونوں سے فرداً فرداً پہلی بالمشافہ ملاقات 1964ء میں ہوئی۔ جب میں لاہور میں تعینات تھا۔ پھر طویل وقفوں سے ملاقاتیں اور مناسب وقفوں سے خط وکتابت جاری رہی۔ محمد طفیل کے زیادہ تر خطوط نئی تحریر کی فرمائش کے لیے ہوتے تھے اور قاسمی صاحب کے زیادہ تر خطوط تحریر کی رسید ہوتے تھے، جن میں اظہار تشکر کے علاوہ مختصر سا تبصرہ بھی ہوتا تھا۔ عام طور پر قاسمی صاحب کی طرف سے فرمائش خال خال تھی۔ اور طفیل کی طرف سے شکریہ خال خال تھا۔ مگر بعض دفعہ دونوں کی طرف سے دونوں ہی قسم کے مراسلے مل جاتے تھے۔

احمد ندیم قاسمی سے میرا ادبی رشتہ کم وبیش بیالیس برس تک قائم رہا۔ بے تکلفی کی حدوں سے، بہت دور اور اتنے فاصلے کے آر پار جو ایک ہمہ وقتی مکمل ادیب اور جزوقتی نامکمل ادیب کے درمیان ہوتا ہے۔ مکمل ادیب یوں کہ قلم پر ایمان کے ساتھ ساتھ وہ اپنے نظریات کے لیے جہاد کی ہمت بھی رکھتے تھے۔ 1951ء اور 1958ء میں اپنے ترقی پسندانہ نظریات کی وجہ سے جیل جا سکتے تھے اور پھر انہی نظریات کو پاکستانی سانچے میں ڈھالنے کے اجتہاد کی ہمت بھی رکھتے تھے۔ میرے جیسا پابجولاں سرکاری ملازم ایسے امکانات سے محروم تھا۔ اس لئے یہ باہمی فاصلہ بھی رہا اور اس میں باہمی خلوص اور احترام کے سمندر بھی لہراتے رہے۔

مگر اس فاصلے کے آر پار ہمارے درمیان ایک غیر ادبی تعلق بھی تھا۔ جو کسی پوشیدہ رابطے کی طرح دھیرے دھیرے ابھرا۔ مگر دو درختوں کے درمیان مکڑی کے بنائے ہوئے پہلے تار کی طرح کسی کو بھی نظر نہ آتا تھا۔ نہ دوسروں کو۔ نہ انہیں۔ نہ مجھے۔ صرف محسوس ہوتا تھا اور اتنا لطیف، غیر واضح اور مبہم تھا کہ اسے بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ پھر بھی آج اسی دوسرے رشتے کے متعلق کچھ کہنے کی کوشش کروں گا۔ یہ رشتہ خالصتاً وطن کے عصری حالات کے حوالے سے تھا۔ جس میں مشرقی پاکستان کے سانحے کا بہت دخل تھا۔

آج پس نظری کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اس رشتے کا آغاز 1967ء میں ہوا۔ مگر بڑے ہی منفی انداز میں۔ 1965ء کی جنگ کے بعد میں نے افسانہ بہ عنوان ''دوخون'' لکھا۔ اور حسب عادت نقوش کو بھیج دیا۔ مگر طفیل صاحب نے اس نصیحت کے ساتھ واپس کر دیا کہ ''اس افسانے کو دفن کر دیں''۔ تب میں نے قاسمی صاحب کو بھیجا تو انہوں نے بذریعہ رجسٹری واپس کر دیا اور 24 ستمبر 1967ء کو خط میں لکھا:

> ''...... افسانہ واپس حاضر خدمت ہے۔ اس سلسلے میں اتنا شرمندہ ہوں کہ بیان نہیں کر سکتا۔ مگر ایک بار پھر (بحیثیت مدیر نہیں بحیثیت دوست) میری درخواست ہے کہ شہیدوں کے خون اور اس خون کو ملانے کا معاملہ بے حد نازک ہے۔ اور خواہ مخواہ ایک بے معنی احتجاج پیدا کر سکتا ہے۔ بہرحال باقی باتیں زبانی ہوں گی.....''

زبانی باتوں کا وعدہ کافی دیر پورا نہ ہو سکا کیونکہ میں دوروز کے سفر کی مسافرت پر بلوچستان میں تھا۔ مگر جب ملاقات ہوئی تو کھل کر بات ہوئی۔ وہ میری بات کے قائل نہ ہوئے۔ میں ان کی بات کا قائل نہ ہوا اور صرف یہی اتفاق ہوا۔ کہ اختلاف قائم ہے۔ مجھے یوں لگا کہ 1965ء کی جنگ نے احمد ندیم قاسمی کی عالمی ترقی پسندی اور قومی پاکستانیت کو تو یک جا کر دیا تھا مگر درون خانہ بندوبست کے معاملے میں وہ ابھی محتاط تھے۔ (یہ افسانہ کوئی دو برس تک مختلف مدیروں سے واپس آتا رہا۔ بالآخر ناصر زیدی نے ادب لطیف میں شائع کیا)

اگلہ مرحلہ تین برس بعد آیا۔ پس منظر یہ تھا کہ بلوچستان میں ملازمت کے دوران اردو اور پشتو کے شاعر رب نواز مائل سے پشتو زبان کے سبق پڑھتا رہا۔ بعدازاں سندھ میں ملازمت کے دوران ایک مقامی استاد سے سندھی زبان کی ٹیوشن لیتا رہا۔ اسی محدود علم کی بنا پر 1970ء میں قاسمی صاحب سے گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ مناسب سکرپٹ کے بغیر پنجابی زبان نظرانداز ہوتی رہے گی۔ اگر ہم پشتو اور سندھی کے حروف ابجد میں سے چند حروف پنجابی کے لیے استعمال کر لیں تو قریباً ہر علاقے کی پنجابی کے تلفظ کے مطابق بڑی موثر سکرپٹ بن سکتی ہے۔ علاوہ ازیں پشتو اور سندھی کے رائج ٹائپ رائٹر اور پریس سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

اس وقت تو بات ختم ہوگئی۔ مگر چند دن بعد مجھے شاہ حسین کالج کی

طرف سے ایک ادبی محفل کا دعوت نامہ ملا اور ساتھ ہی قاسمی صاحب کا یہ پیغام بھی کہ اس موقع پر پنجابی سکرپٹ کے متعلق اپنی تجویز بھی پیش کردوں۔ مقررہ تاریخ پر وہاں پہنچا تو غالباً قاسمی صاحب ہی صدارت کررہے تھے وہاں ایک بلیک بورڈ کی مدد سے میں نے بات ختم کی۔ اس پر نیم دلی سے بحث ہوئی اور وہی حشر ہوا جو آج تک پنجابی سکرپٹ کی ہر اصلاح کا ہوتا رہا ہے۔ اور جس کی وجہ سے یہ معاملہ آج بھی وہیں ہے۔ جہاں 36 برس پہلے 1970ء میں تھا۔

اطلاعاً یہ بھی عرض کردوں کہ اس وقت یحییٰ خان کے مارشل لاء کا زمانہ تھا۔ اور میں لاہور کا ڈپٹی کمشنر تھا۔ مگر چندروز بعد میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب فوجی انٹیلی جنس کے دو نمائندے میرے دفتر میں وارد ہوئے اور پوچھنے لگے کہ آپ شاہ حسین کالج کیوں گئے تھے۔ وہ تو کمیونسٹ ادارہ ہے۔ ان کا یہ طرزِ عمل خلاف ضابطہ بھی تھا اور خلاف توقع بھی اس لیے میں نے ادبی محفل میں شرکت کے جواز کے علاوہ انہیں ذرا سختی سے یہ بھی سمجھایا کہ میرے منصبی فرائض میں ہر چیز شامل ہے۔ قانون اور انتظامی ضرورت کے مطابق میں ہر جگہ جاسکتا ہوں۔

کچھ دن بعد میں نے قاسمی صاحب سے خفیہ اداروں کے اس نئے پھیلاؤ اور جارحانہ انداز کا ذکر کیا تو وہ لطف لیتے ہوئے مسکرا کر کہنے لگے کہ اچھا ہوا کہ آپ نے بھی مزہ چکھ لیا۔ میں تو انہیں بہت بھگت چکا ہوں پھر انہوں نے ترقی پسند تحریک اور اپنی گرفتاریوں کے متعلق کچھ قصّے سنائے۔ جن کے تسلسل میں ہم حالات حاضرہ پر اس طرح گفتگو کرنے لگے کہ میرا سرکاری بُت پاش پاش ہوگیا۔ اور ان کی احتیاط کا دامن تار تار ہوگیا۔ تب میرے اندر ایک خوشگوار احساس جاگا کہ 1967ء والا اختلاف شاید اب سکڑ رہا ہے۔

اس رشتے کا اگلا قدم 1974ء میں بڑھا۔ جب ہندوستان کی قید سے رہا ہو کر میں لاہور پہنچا۔ اور قاسمی صاحب ملنے آئے۔ وہ دیر تک بیٹھے پہلے قید کے زمانے، پھر ہندو پاک سیاست اور بعد ازاں پاکستانی سیاست پر گفتگو کرتے رہے۔ دو چار روز بعد انہوں نے اپنے اخباری کالم میں لکھا کہ مسعود مفتی جسمانی طور پر پہلے سے کمزور مگر نظریاتی طور پر پہلے سے زیادہ طاقتور ہوگئے ہیں۔ انہی دنوں پاکستان کی نیشنل سنٹر لاہور برانچ کی انچارج کشور ناہید نے ایک پرہجوم تقریب مرتب کی۔ جہاں میں نے اپنی رپورتاژ ''چہرے'' کے کچھ حصے پیش کئے تو قاسمی صاحب نے اپنے کالم میں سامعین کی اکثریت کے رونے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ ''جو رو نہ سکے وہ لرزتے رہے کہ تواریخ کے حامل کردار بعض اوقات ملکی آبادیوں سے کیسے کیسے مذاق کرجاتے ہیں۔''

ان کا یہ اشارہ تو 1971ء کے حاکموں کی طرف تھا مگر چند ہی روز بعد مجھے قاسمی صاحب کو بتانا پڑا کہ یہ مذاق تو 1974ء میں بھی حسب سابق جاری تھا۔ اس کا پس منظر یہ تھا کہ پاکستان نیشنل سینٹر راولپنڈی سے ایک صاحب میرے پاس لاہور میں یہ دعوت لے کر آئے کہ میں راولپنڈی کی تقریب میں بھی ''چہرے'' پڑھ کر سناؤں۔ مگر مجھے معذرت کرنا پڑی کیونکہ اس وقت تک حکومت کی طرف سے خاموش رہنے کے اشارے مل چکے تھے۔ اس کے علاوہ پاکستان ٹیلی ویژن سے بھی خط و کتابت ہوچکی تھی۔ جس میں انہوں نے پہلے تو مجھے مشرقی پاکستان کے متعلق کچھ ڈرامے لکھنے کی فرمائش کی اور جب میں نے آمادگی ظاہر کی تو خبردار کیا کہ ان میں 1971ء کے واقعات کا ذکر نہ ہو۔ جس پر میں نے ڈرامے لکھنے سے انکار کردیا۔

اس صورت حال پر گفتگو کے دوران جب میں نے خدشہ ظاہر کیا کہ تواریخ کے حامل کرداروں کا یہ مذاق اب آئندہ بھی جاری رہے گا تو قاسمی صاحب کے لب تو خاموش رہے مگر ان کی آنکھیں بھرپور تائید سے چھلک رہی تھیں اور مجھے نوید دے رہی تھیں کہ سقوطِ ڈھاکہ نے 1967ء والا اختلاف نہ صرف مکمل طور پر تحلیل کردیا ہے بلکہ اس تبدیلی کی ایک توانا لہر درون خانہ بندوبست تک بھی پہنچ گئی ہے۔

اگلے مرحلے میں ہمارا یہ دوسرا باہمی رشتہ اس وقت پوری طرح مستحکم ہوگیا جب مشرقی پاکستان کے متعلق میری دیگر تحریریں دھیرے دھیرے منظر عام پر آنے لگیں اور سرکاری حلقوں کے علاوہ بعض دیگر حلقوں کے لیے بھی قابل اعتراض ٹھہریں۔ اسی وجہ سے رسالہ فنون میں ''اختلافات'' کے عنوان تلے کھلی بحث شروع ہوگئی جس کا ذائقہ آپ قاسمی صاحب کے خط کے اس اقتباس سے چکھ سکتے ہیں۔ جو انہوں نے مجھے 22 جولائی 1976ء کو لکھا:

''...... بحث جس نہج پر چلی ہے اس سے میں مطمئن نہیں ہوں۔ مجھے اس سلسلے میں بہت شدید ایڈیٹنگ کرنا پڑی۔ اور انتہا پسندانہ جملوں کو قلم زد کرنا پڑا۔ اس کے باوجود آپ کو اور دیگر احباب کو اور خود مجھے بھی شکایت ہے کہ لہجہ کہیں کہیں کچھ زیادہ ہی ''گرم'' ہوگیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ لہجہ وہیں گرم ہوتا ہے جہاں عقل و منطق ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔ چنانچہ میں نے اس بحث کو بند کردینا مناسب سمجھا۔ آپ کی ذات کے بارے میں جو کچھ کہا گیا اسے خدارا محسوس نہ کیجیے گا کہ بحث میں یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ بہرحال یہ طے ہے کہ آپ کا نقطہ نظر جو دراصل ہم میں سے بہتوں کا نقطہ نظر ہے' کامیاب رہا......''

قاسمی صاحب کا یہ خط میرا بہت قیمتی سرمایہ ہے۔ کیونکہ مشرقی پاکستان کے بارے میں میرا نقطہ نظر نقادوں کو تو آج تک نظر یا سمجھ نہیں آیا مگر قاسمی صاحب پر 1976ء میں ہی واضح ہوگیا تھا۔ اس لیے جب میں نے 1986ء میں منیلا میں اپنی کتاب ''ہم نفس'' مکمل کی تو چار برس تک پانچ قسطوں میں رسالہ ''فنون'' میں بغیر کسی ترمیم کے اور بلا حیل و حجت شائع ہوتی رہی۔ اسی دوران قاسمی صاحب کے جو خطوط بھی مجھے ملے وہ براہ راست یا بین السطور حوصلہ افزائی سے لبریز ہوتے تھے۔ مشرقی پاکستان کے متعلق میری تمام تحریروں

میں بکھرے ہوئے نقطہ نظر کو صرف چند الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ آمرانہ پاکستان میں فوجی ڈکٹیٹروں اور وڈیروں کا گٹھ جوڑ مشرقی پاکستان کی جمہوریت پسند اور بلند بانگ اکثریت کو اپنے اقتدار کے لیے خطرہ سمجھتا تھا۔اس لیے انہوں نے بہت پہلے سے مشرقی پاکستان سے جان چھڑانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔پھر مناسب حالات پیدا کرنے کے لیے محبِ وطن بنگالیوں کو نظر انداز کر کے علیحدگی پسند بنگالیوں کی حوصلہ افزائی کی گئی۔اور بالآخر ہندوستان سے مصنوعی جنگ کر کے بڑی عجلت میں دانستہ ہتھیار ڈال دیئے گئے تا کہ باقی ماندہ پاکستان ان کی گرفت میں رہے۔

اس زمانے میں حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ ستائیس برس کے لیے زیرِ زمین دفن ہو چکی تھی۔اور میرا نقطہ نظر حکومتی مسلک کے بالکل خلاف تھا۔اس لیے سرکاری فائیلوں اور درباری حلقوں میں تو میں ایک غیر مقبول اور معتوب ادیب ہی رہا۔مگر قاسمی صاحب سے مجھے یوں داد ملی کہ چند برس بعد اپنی کتاب ''پس الفاظ'' عنایت کرتے ہوئے وہ مجھے کہنے لگے:

''اس میں 1980ء کی اہلِ قلم کانفرنس میں میرا کلیدی خطبہ ہے۔
میں جانتا ہوں یہ آپ کو ضرور پسند آئے گا''۔

میں اس کانفرنس میں مدعو نہ تھا۔مگر اس خطبے کا ذکر سن چکا تھا۔ چنانچہ جب میں نے قاسمی صاحب کا یہ فقرہ پڑھا کہ ''ہم ادیبوں کو فخر اور اصرار ہے کہ ہم کسی حکومت کے ترجمان کبھی نہیں رہے۔ہم صرف اپنی مملکت اور اہلِ مملکت کے ترجمان ہیں۔'' تو۔ع۔ میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔اور یوں مجھے لگا کہ قاسمی صاحب کے یہ الفاظ (میں جانتا ہوں آپ کو ضرور پسند آئے گا) میرے لیے کسی بھی سرکاری اعزاز سے بڑا اعزاز تھا۔

یہ تو اس رشتے کی نمو کی داستان تھی مگر اس کی نوعیت کیا تھی۔ یہ سمجھانے کے لیے قاسمی صاحب کی ہی ایک تحریر کا اقتباس پیش کرتا ہوں۔

''اپنے عصر کا صحیح ادراک یہ نہیں ہے کہ ہم عالمگیر بننے کی خاطر دوسروں کی نقالی کریں۔ہم سے روحِ عصر کا مطالبہ تو یہ ہے کہ ان لمحوں کو اپنی گرفت میں لائیں۔جو ہماری سرزمین پر سے گزر رہے ہوں۔ اس ایک لمحے کے ہزار روپ ہیں۔مگر ہم پر اس لمحے کے اس رنگ کا حق فائق ہے جو وہ ہمارے وطن پر سے گزرتے ہوئے اختیار کرتا ہے۔اسی کو روحِ عصر کہتے ہیں۔یہ لمحہ ہماری گرفت میں نہیں ہے۔تو ممکن ہے ہم عالمگیر تو ہو جائیں مگر پاکستانی کیسے کہلائیں گے۔'' (''روحِ عصر کے تقاضے'' تہذیب و فن۔جلد اول)

قاسمی صاحب کے یہی جملے ہمارے باہمی رشتے کی روح تھے۔ نوعیت یہ تھی کہ ہم دونوں اب باقی ماندہ پاکستان کے عصری لمحوں سے پریشان رہتے تھے۔ 1994ء میں ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد میری صحافتی تحریروں کا قاسمی صاحب کو اندازہ تھا۔اس کے علاوہ 1998ء سے پاک جمہور کے نئے تجربے کا لٹریچر بھی میں انہیں باقاعدہ بھیج رہا تھا۔اسی طرح ان کے خیالات کالم کے ذریعے مجھ تک پہنچ جاتے تھے۔اس لئے عصری لمحوں کے تجزیے کے لیے لمبی بحث کی ضرورت نہ تھی۔مختصر گفتگو۔معنی خیز تبصروں یا آہوں کے تبادلے سے ہی ابلاغ ہو جاتا تھا۔اور فکر و نظر کی یہ وحشت عیاں ہوتی رہتی تھی کہ مشرقی پاکستان سے جان چھڑانے کے بعد ہمارا بدعنوان سیاسی اور سماجی نظام اب اتنا منہ زور ہوتا جا رہا ہے کہ یکے بعد دیگرے تمام ادارے توڑ رہا ہے اور فرد کی کردار سازی کی بجائے انسانی فطرت کی ہر بدی کو دانستہ ابھار کر پاکستانی قوم کو مسخ کر رہا ہے۔اس ضمن میں کردار سازی کے متعلق قاسمی صاحب نے ایک ذاتی واقعہ دو تین مختلف مواقع پر سنایا۔

انہوں نے بتایا کہ میری ادبی زندگی اور ملازمت کا آغاز ہی تھا جب ن۔م۔راشد اپنے ایک دوست کے ساتھ میرے گاؤں میں آئے۔ گرمیوں کے دن، سہ پہر کا وقت۔میں نے ان دونوں کے سامنے شربت کے گلاس رکھے۔تو دونوں نے جیب سے ایک ایک چونی نکال کر میز پر رکھ دی۔اور وضاحت کی کہ وہ خاکسار ہیں اور علامہ مشرقی کا حکم ہے کہ مناسب معاوضے کے بغیر کسی قسم کی خاطر تواضع قبول نہ کی جائے۔یہ تاویل میزبان کو قبول نہ تھی۔گھنٹہ بھر کی بحث کے بعد وہ دونوں اپنی اپنی چونی اٹھا کر چل دیئے اور شربت کے گلاس ویسے کے ویسے ہی دھرے رہ گئے۔

سنگاپور سے پشاور تک پھیلی ہوئی خاکسار تحریک کی جولانیاں اور خاکساروں کا مضبوط کردار ہم دونوں کو یاد تھے۔اور ہم دونوں پاکستان کے سیاسی سماجی نظام کے ہاتھوں اس مضبوط کردار والی نسل کے بیٹوں کو ڈھونڈتے رہتے تھے۔میں اکثر سوچتا کہ قاسمی صاحب کے متعلق فتح محمد ملک نے کتنا سچ لکھا ہے کہ ''یوں محسوس ہوتا ہے جیسے پاکستان کی بقا و خوشحالی و آزادی و خودمختاری ندیم کی ذاتی بقا اور اپنے جذباتی استحکام کا ہی دوسرا نام ہو۔جیسے ندیم خود پاکستان ہو اور اس کے اندر اپنی بنیادوں کو پگھلنے سے بچانے کی جنگ برپا ہو۔'' (احمد ندیم قاسمی۔شاعر اور افسانہ نگار۔صفحہ 109)

مکمل دیانتداری اور انکساری کی حدود کے اندر اندر میں نے کوشش تو کی ہے مگر معلوم نہیں۔میں اس دوسرے غیر واضح اور دھندلے رشتے کی وضاحت میں کامیاب ہوا ہوں یا نہیں۔اگر نہیں تو براہ کرم آپ اسے ہماری آخری ملاقات کے پس منظر کے طور پر قبول کر لیں۔

جون 2006ء کا مہینہ۔دوپہر کا وقت۔اپنا نیا افسانوی مجموعہ (''توبہ'') پیش کرنے کے لیے جب میں قاسمی صاحب کے دفتر میں داخل ہوا تو وہ بالکل اکیلے بیٹھے ہوئے تھے۔بہت ہی نحیف و لاغر۔دبی دبی دھیمی آواز۔مگر ذہنی طور پر چاق و چوبند۔فون پر بھی اور میرے ساتھ گفتگو میں بھی۔کتاب کے مندرجات کی فہرست پر نظر دوڑائی تو کہنے لگے ''ان میں سے بیشتر تو فنون میں ہی شائع ہوئے تھے۔''

پھر افسانوں پر بات چلی تو موضوعات اور نفس مضامین کی وجہ سے چلتے چلتے حالات حاضرہ پر جانکلی۔اس گفتگو میں وہ وطن کے حالات پر بہت افسردہ تھے۔اور پاکستانی معاشرے کے سیاسی طرز عمل سے بہت نالاں تھے۔جس میں لالچ تھا۔خودغرضی تھی اور بے ضمیری تھی۔ میں نے انہی کا ایک شعر سنانے کی کوشش کی مگر میرے غیر شاعرانہ حافظے نے ساتھ نہ دیا۔تو انہوں نے خود ہی تصحیح کر دی۔

صبح ہوتے ہی نکل آتے ہیں بازار میں لوگ
گٹھڑیاں سر پہ اٹھائے ہوئے ایمانوں کی!

اور ساتھ ہی چونک کر بولے

''آپ کو میرا خط مل گیا تھا نا؟''

یہ خط ایک افسانے کی رسید تھی جو میں نے چند دن پہلے فنون کے لیے بھیجا تھا۔اس کا مرکزی خیال یہ تھا کہ آج کے پاکستان میں ہر چہار جانب غیر قدرتی اموات کی فراوانی کا حساس شہریوں پر کیا اثر ہے۔افسانے کا عنوان تھا ''آسیب''۔یہ افسانہ پڑھتے ہی انہوں نے خط لکھا جس پر 18 مارچ 2006ء کی تاریخ تھی۔اس کا مختصر سا اقتباس یوں ہے:

''......آپ کے افسانے نے دو پہلوؤں سے اداس کر دیا۔ایک اس لحاظ سے کہ فنون کا نیا شمارہ تو پریس میں ہے۔اور یہ افسانہ آئندہ شمارے میں شامل ہو سکے گا۔دوسرا اس لحاظ سے کہ افسانے کا مرکزی کردار ہر سوجھ بوجھ والے پاکستانی کا کردار ہے۔ میں نے خود اپنے آپ کو اس کردار میں منعکس پایا ہے۔اور سڑکوں پر آوارہ پھرنے لگا ہوں۔آپ کے کمال آگاہی نے افسانے کو ملک کی تواریخ بنا دیا ہے۔اللہ ہم سب پر رحم فرمائے۔''

چونکہ وہ اسی خط کے بارے میں پوچھ رہے تھے اس لئے میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

چند لمحے ٹکٹکی باندھ کر مجھے دیکھتے رہے پھر کہنے لگے ''یہ افسانہ پڑھ کر میرے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے''۔ میں نے کہا ''یہ اس لیے ہوا کہ آپ کے رونگٹے ابھی قائم ہیں۔ورنہ قوم کے رونگٹے تو عرصہ سے غائب ہو چکے ہیں''۔

سر ہلا کے بولے ''واقعی! ہم جیسے لوگ جنھوں نے تحریک پاکستان کا جوش اور ولولہ دیکھا ہے اب حیران ہوتے ہیں کہ یہی قوم پچاس ساٹھ برس میں اتنی بے حس کیسے ہو گئی۔''

انہوں نے جس انداز میں یہ بات کی۔اس کے جذبے کی شدت سے ہم دونوں خاموشی میں ڈوب گئے۔شاید اپنے رشتے کے درد کی وجہ سے۔چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ جیسے سٹپٹا کر بولے۔

''اب تو مر جانے کو جی چاہتا ہے۔ان حالات میں اب مجھ سے نہیں زندہ رہا جاتا''

پچھلے بیالیس برس کے دوران میں نے ان کے لہجے میں درد کی یہ شدت اور شکایت کا یہ انداز کسی بھی بات پر کبھی بھی نہ دیکھا تھا۔ان کے چہرے پر لامحدود بے بسی اور کرب کے تاثرات دیکھ کر مجھے یوں لگا کہ جیسے وہاں بیٹھے بیٹھے وہ اسی دم بالکل حقیقی انداز میں میرے افسانے کا مرکزی کردار بن گئے تھے۔

شاید۔اسی لمحے میں ہمارے دھندلے اور غیر واضح رشتے کی وضاحت بھی ہو گئی۔اور تکمیل بھی ہو گئی۔وہ اس طرح کہ پہلی فوجی حکومت کے دوران 1967ء میں وہ میرے افسانے کے متعلق جتنے محتاط تھے چوتھی فوجی حکومت کے دوران 2006ء میں اسی قسم کے افسانے کے متعلق وہ اتنے ہی بے باک تھے۔

مسعود مفتی کے افسانے، رپورتاژ، ادبی اور سیاسی مضامین اور اخباری کالم اپنی ایک ادبی اور ثقافتی حیثیت کے علاوہ ہمارے عہد کے اجتماعی شعور میں اضافے کا باعث بنے ہیں اور ادب کے تخلیقی سفر میں ایک آئیڈیل کی جستجو اور شناخت کا درجہ بھی رکھتے ہیں۔مسعود مفتی اور ہم نے پاکستان کے مستقبل کا جو خواب دیکھا تھا اسے بعد میں ہم نے اپنی آنکھوں سے غارت ہوتے ہوئے بھی دیکھا۔ہمارے بس میں تو یہی تھا کہ وقت کے دفتر میں اپنی چشم دید گواہی کا اندراج کروادیں۔سو ہم نے یہ کیا۔مسعود مفتی کا رپورتاژ ''چہرے'' ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ پاکستان کے دولخت ہونے کا المیہ ایک نامیاتی وحدت سے انکار کا المیہ تھا، ایک زلزلے سے زمین کے ٹوٹنے کا المیہ تھا جسے مسعود مفتی نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس کی شدت کو اپنے باطن سے گزار کر اس کی جزئیات نگاری کی۔وہ تین سال بھارت میں جنگی قیدی کی عقوبتیں بھی سہتے رہے۔اس دوران بھی انہوں نے اپنے اندر کی عدالت میں معلوم نہیں کتنی سخت پیشیاں بھگتی ہوں گی۔ان کے بیانیہ میں اگر طنز کا عنصر زیادہ نمایاں نظر آتا ہے تو اس کی وجہ ان کی افتاد طبع نہیں بلکہ وہ زمینی حقائق ہیں جو اُن میں تلخی پیدا کرنے کا سبب بنے۔

آفتاب اقبال شمیم (اسلام آباد)

براہِ راست

گلزار جاوید

(راولپنڈی)

سب سے پہلے تو اُس سوال کا جواب دینا چاہتا ہوں۔جوآپ نے پوچھا ہی نہیں۔مگر وہ دیگر چند سوالوں میں جھلک رہا ہے۔کہ میری تحریر یا شخصیت کے متعلق اگر کسی نے کوئی رائے دی ہے تو اس پر میرا ردِعمل کیا ہے؟

بہتر ہے کہ جوابات میں غیر ضروری تکرار سے بچنے کے لیے شروع میں ہی عرض کردوں کہ تخلیق مکمل کرنے کے بعد تخلیق کار از خود معطل اور بے دخل ہو جاتا ہے۔اشاعت کے ساتھ ہی ہر تحریر زبان خلق کے حوالے ہو جاتی ہے۔اور مصنف اپنی رائے یا ردِعمل کا حق کھو دیتا ہے۔لکھتے وقت وہ آزاد تھا۔ پڑھتے وقت دوسرے آزاد ہیں۔اُس نے جو کہنا تھا کہہ دیا۔اب دوسروں کے کہنے کا وقت ہے۔ وہ صرف ساحل پر کھڑے ہو کر وقت کے سمندر میں اپنی تخلیق کو تیرتا، ڈوبتا یا غوطے کھاتا دیکھ سکتا ہے۔بہتر ہے کہ کسی تبصرے کی بجائے یہ منظر خاموشی اور متانت سے دیکھا جائے............مسعود مفتی

☆ 10 جون 1934 کو پاک پتن میں پیدائش کے باوجود آپ کے ذہن میں وہاں کی کوئی یاد محفوظ نہیں۔گفتگو کا سلسلہ وہاں سے شروع کیجیے جہاں سے آپ کا حافظہ ساتھ دیتا ہے!

☆☆ پاک پتن شریف کی کوئی تصویر میرے شعور میں محفوظ نہیں۔ چھ بڑے بہن بھائیوں کی رونق میں یادوں کی کونپلیں گجرات شہر میں پھوٹنے لگیں۔جہاں بجلی نہیں تھی۔اور شام ہوتے ہی سارے شہر اور ہر گھر کا نظام مٹی کے تیل، بتی، ماچس اور ننھے منے شعلوں کے تابع ہو جاتا۔پھر اذان، بھجن، کیرتن اور ٹن ٹن کی میٹھی صداؤں میں صبح ہو جاتی۔ دن بھر مولوی، پادری، جوگی اور شاہدولہ کے مزار کی مخصوص مخلوق گلی کوچوں میں نظر آتی۔ ہر شے اور ہر شخص اصل زندگی سے بہت بڑا لگتا۔سنہری تصویروں والی ایک بڑی سی رجسٹر نما کتاب بھی یاد ہے جو علامہ اقبال کی وفات (1938) کے بعد ان کے متعلق شائع ہوئی تھی۔

1940ء کے آس پاس راولپنڈی منتقل ہوئے تو پہلی مرتبہ بجلی دیکھی۔متمول ہندوؤں اور سکھوں کی شادیوں پر لاؤڈ سپیکر اور روشنیوں کے ہنگامے دیکھے۔اور دوسری جنگ عظیم کے ہیجان میں مری روڈ پر گورے فوجیوں کے مارچ۔آرمڈ کاروں کے جلوسوں، ٹینکروں کی کھڑکھڑاہٹ اور عرش پر رینگنے والے ہوائی جہازوں سے گرتے ہوئے پیراشوٹوں کی مست خرامی دیکھی۔1944 میں ہم لاہور منتقل ہو گئے اور پھر ساری تعلیم مکمل ہونے تک لاہور میں ہی قیام رہا۔

☆ ملک کی دو معروف سیاسی جماعتوں کے کارکنوں کی نسبت یہ تاثر عام ہے کہ یہ لوگ کہیں بھی کسی بھی حال میں رہیں ان کی بنیادی اپروچ تبدیل نہیں ہوتی۔آپ ہمیں ایامِ طفلی میں خاکسار تحریک سے وابستگی اور اپنی شخصیت پر اس کے اثرات سے آگاہ کیجیے؟

☆☆ دو سیاسی جماعتوں کا ذکر چھوڑیں۔یہ ساری ہی امتِ مسلمہ کا خاص وصف ہے کہ ہمارے روّیوں میں لچک نہیں ہے۔قریباً سبھی مسلمان بادشاہوں کی عوام دشمنی اور قوم فروشی، مذہبی رہنماؤں کی خدا فروشی، اور سیاسی اور فوجی آمروں کی شاہانہ مطلق العنانی سے پوری طرح واقف ہونے کے باوجود ہم لوگ انہی کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں۔اور اپنی اپروچ بدلنے کو تیار نہیں۔

آجکل بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ خاکسار تحریک اسی پرانی روش کو بدلنا چاہتی تھی۔سیاست اور اخلاقیات کو یک جا کرنے کی یہ ایک انقلابی کوشش تھی۔سارے دجلہ کی صفائی کے لیے ہر قطرے پر توجہ دینے کی طرح یہ ہر فرد کی کردار سازی کرتی تھی۔خدمتِ خلق اور شدید دیانت داری اس کے دو اہم ستون تھے۔اس تحریک میں چندہ لینا یا دینا منع تھا۔اور ہر شخص اپنی جماعتی سرگرمیوں کے لیے ذاتی جیب سے خرچ کرتا تھا۔ پشاور سے سنگاپور تک پھیلی ہوئی اس تحریک نے برعظیم کے مسلمانوں کو جو سیاسی اور اخلاقی بصیرت دی تھی اس کی وجہ سے وہ قائداعظم کے بے داغ اور دیانتدارانہ کردار کو پہچان سکے۔اور خاکسار تحریک پر انگریز کی آہنی پابندی کے بعد قائداعظم کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے انہوں نے پاکستان حاصل کر لیا۔

قائداعظم کی وفات کے بعد جب فوجی آمروں اور وڈیروں کی سیاسی پارٹیاں اقتدار غصب کرنے کے لیے مسلسل گٹھ جوڑ کرنے لگیں۔تو ان میں سب سے موثر اور مہلک ہتھیار یہی تھا کہ سرکاری سرپرستی میں ضمیر کی تجارت کے ذریعے پاکستانی فرد کا کردار تباہ کیا جائے۔تاکہ وہ کرپشن کی راہ پر چل کر آسانی سے خریدا جاسکے۔اس منفی مہم میں وہ اتنے کامیاب رہے کہ خاکسار تحریک کے انتہائی ایماندار اور دیانت دار کارکنوں کی تیسری نسل تک پہنچتے پہنچتے پاکستان دنیا کے کرپٹ ترین ممالک میں شامل ہو چکا ہے۔آج اگر قائداعظم دوبارہ ہماری قیادت کرنے آ جائیں تو نہ معلوم یہ بکاؤ مال ان کا کیا حشر کرے گا۔

☆ کچھ روشنی اُس تقریر کے موضوع اور خیال پر ڈالئے جو چھٹی

جماعت کے طالبعلم نے ازخود تحریر کرکے زبانی یاد کی اور داد بھی خوب سمیٹی؟

☆☆ رٹی ہوئی اس تقریر کے پیچھے، بہت محنت تھی۔ خیالات والد صاحب نے دیئے تھے۔ پھر بار بار نامنظور کرکے مجھ سے کوئی سات آٹھ بار لکھوائی تھی۔ آخری مرتبہ کچھ تبدیلی انہوں نے کی کچھ میرے استادوں نے۔ موضوع امتِ مسلمہ کا زوال تھا۔ اور تشریح کے لیے علامہ اقبال کے اشعار تھے۔ والد صاحب نے مجھے بیس پچیس اشعار لکھ دیئے تھے اور نفسِ مضمون کے متعلق مجھے کوئی سے چار اشعار چھانٹ کر استعمال کرنے کی اجازت تھی۔ بس اتنا سا مقصد تھا۔

☆ آپ کے اُستاد عبدالرحیم شاہ صاحب کورس مکمل کرانے کی غرض سے اضافی وقت میں تیاری کرانا چاہتے تھے جبکہ آپ کے والد صاحب اس روِش کے خلاف تھے۔ آپ کے خیال میں ایک ذہین اور لائق طالب علم کے لئے کونسا روّیہ درست ہونا چاہیے؟

☆☆ طالبعلم کے لیے تو دونوں طرف سے صرف شرمندگی تھی کیونکہ یہ والد اور استاد کے روّیوں کے ٹکراؤ کی کہانی تھی اور وہ بیچ میں پس رہا تھا مگر اُس وقت کا شرمندہ طالبعلم اب اپنے بڑھاپے میں محسوس کرتا ہے کہ ان دونوں کے روّیے اپنی اپنی جگہ درست تھے۔ بالکل ایسے ہی جیسے دونوں اطراف (SIDES) مل کر ایک کھرا سکہ (COIN) بناتے ہیں مگر چھوڑیئے اس کہانی کو۔ آجکل کا کمرشل تعلیمی ماحول اس کہانی اور ان رویوں کو سمجھ ہی نہیں سکتا۔ انگریز کے زمانے میں ریاست کا ہر پرزہ اپنا کام جانفشانی سے کر کے پوری ریاست کی مشینری کو چلاتا رہتا تھا۔ اور اسی کو GOVERNANCE کہتے ہیں۔ ان دنوں استاد واقعی تعلیم دینے والا استاد ہوتا تھا۔ اور انسپکٹر واقعی نگرانی کرنے والا انسپکٹر ہوتا تھا کیونکہ ان کی تعیناتی، تبادلے اور ترقی قواعد وضوابط سے ہوتے تھے۔ اور کسی سیاستدان یا جرنیل کی مصلحتوں کے تابع نہ تھے۔ اس لیے ان کے رویے درست اور صحت مند تھے۔

☆ پروفیسر حمید اللہ خان کے ٹیوٹوریئل گروپ کے ممبر، کالج میگزین کے اسسٹنٹ ایڈیٹر اور لیکچرر کے تجربات کس نوعیت کے تھے۔ عملی زندگی میں ان تجربات سے کس طرح کے فوائد حاصل ہوئے؟

☆☆ یہ عجیب قسم کا اور اپنی ہی نوعیت کا تجربہ تھا جس نے میری فکر ونظر کو میرے اندر سے بدل ڈالا۔ میں کبھی بھی پروفیسر حمید احمد خان کا کلاس روم والا شاگرد نہ تھا۔ صرف ان کے ہفتہ وار ٹیوٹوریئل گروپ میں شامل تھا۔ پھر بھی کچھ کہے سنے بغیر انہوں نے میری زندگی کا رخ بدل دیا۔ اگر ان سے رابطہ نہ ہوتا تو میں والدین کی شدید خواہش اور اپنی دلی تمنا کے مطابق ڈاکٹر بن گیا ہوتا۔ اور میرا قلم صرف نسخے لکھنے تک محدود رہتا۔ میں نے ٹیوٹوریئل گروپ میں زندگی کی پہلی مزاحیہ تحریر سنائی تو پروفیسر حمید احمد خان نے مجھے کالج میگزین کے انگریزی سیکشن کا اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر کر دیا۔ اگلے برس ایڈیٹر بنا تو دو برس میں میگزین (کریسنٹ) کے چھ شمارے شائع کئے۔ مگر اس دوران میرے اندر کا ڈاکٹر خودکشی کرکے اپنی قلم ادیب کے حوالے کر گیا۔ بی ایس سی میں حاصل کردہ وظیفہ ضائع کرکے میری تعلیم نے پٹڑی بدل لی۔ گہرے وسوسوں میں چند برس انتہائی محنت۔ کشمکش اور ذہنی تناؤ میں گزرے۔ مگر ساتھ ساتھ قلم کا سفر جاری رہا۔ اور آج بھی جاری ہے جس کا نقطہ آغاز تو ٹیوٹوریئل گروپ تھا۔ تکمیلی مراحل نئی تعلیمی پٹڑی پر بکھرے تھے۔ تجربات میری تحریروں میں منتقل ہوتے رہے۔ اور تادم تحریر انجام یہ سوالنامہ ہے۔ اس سفر کے "فوائد" کا کیسے شمار کروں۔ صحرا نورد اگر کسی طور کنوئیں پر پہنچ جائے تو قدم شماری کی ہوش کہاں۔

☆ پری میڈیکل میں داخلے کی خواہش اور ناکامی پر آپ کے احساسات اُس وقت کیا تھے اور آج کیا ہیں؟

☆☆ جی نہیں۔ وہ ناکامی نہ تھی۔ عمر پوری ہوگئی۔ تو میڈیکل کالج میں داخلہ یقینی تھا وہ تو دانستہ بغاوت تھی۔ میری بغاوت میرے ہی خلاف۔ اور میرے احساسات بالکل وہی تھے جو اندھی چھلانگ لگانے سے پہلے ہوتے ہیں۔

☆ بہت سے دیگر احباب کی طرح "سول اینڈ ملٹری گزٹ" سے آپ کی یادیں بھی اس قدر تلخ ہونے کے اسباب کیا ہیں؟

☆☆ اسباب سمجھنے کے لیے اس وقت کی صحافت کا سمجھنا ضروری ہے۔ جو خود اپنی دریافت میں بھٹک رہی تھی نہ یہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اپنی طرف بلاتی تھی اور نہ وہ اسے ایک مناسب کیریئر سمجھتے تھے بلکہ یہ بسا اوقات تعلیم بیزار لوگوں کا وقتی ٹھکانہ بھی۔ تنخواہیں بہت کم تھیں اور وہ بھی زیادہ تر اُدھار۔ سروس رولز قسم کی کوئی شے نہ تھی۔ تربیت کا نظام ابھی وضع نہیں ہوا تھا اور پنجاب یونیورسٹی میں ڈپلوما کورس چند ہی برس پہلے شروع ہوا تھا۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ انگریزوں کی منظم انتظامیہ سے نکل کر پاکستانی صنعت کاروں کے ہاتھ آ گیا تھا۔ اوپر لائق اور تجربہ کار صحافی کام کر رہے تھے مگر نیچے ابھی کھچڑی پک رہی تھی اور محلاتی سازشوں کا سماں تھا۔ جس میں بعض لوگ نہیں چاہتے تھے کہ ان سے بہتر تعلیمی سطح والے لوگ سٹاف میں شامل ہو جائیں۔

☆ ایّامِ شباب میں آپ نے زندگی کی پہلی فلم والد صاحب کے ہمراہ دیکھی تو اُس وقت آپ کے احساسات وجذبات کیا تھے۔ اُس کے بعد کس طرح کی فلمیں آپ کے مشاہدے میں آئیں اور آپ کے دل ودماغ پر اُن کے کیا اثرات مرتب ہوئے نیز آج کل آپ کس طرح کی فلمیں دیکھتے ہیں؟

☆☆ 1945 میں دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی تو میں آٹھویں جماعت پاس کر چکا تھا اور ذہن میں بہت سی تفصیلات اٹک گئی تھیں مثلاً جنگ کے واقعات، اخباروں کی سرخیاں اور ریڈیو کے تبصرے وغیرہ۔ اس لئے چند ہی برس بعد جب زندگی کی پہلی فلم FALL OF BERLIN دیکھی تو حیران کن ٹیکنالوجی اور یادوں کی یلغار نے مسحور سا کر دیا۔ پردے پر زندگی کے اصل حقائق اور کہانی کی تکنیک کے حسین امتزاج نے تو تاریخ کا بالکل نیا رخ دکھایا۔ اور مجھے

عمر بھر تواریخی فلموں سے بالعموم اور جنگ کی فلموں سے بالخصوص دلچسپی رہی۔ پر جیسے جیسے مشاہدہ اور مطالعہ پروان چڑھتے رہے یہ دلچسپی ان فلموں تک پھیل گئی جو انسانی رشتوں اور اقدار کی شکست وریخت اور ان کے نفسیاتی نتائج کو موضوع بناتیں۔ 1960 میں کیمبرج یونیورسٹی میں ژاں پال سارتر کے ڈرامے پر مبنی نئی فلم دیکھی تھی جس کا مرکزی خیال تھا HELL IS OTHER PEOPLE یعنی دوسرے لوگ ہماری زندگی کو جہنم بنا سکتے ہیں مگر آج تک اس کا سرور قائم ہے۔ اچھی فلم چاہے کسی ملک اور زبان کی ہو وہ اپنی دلچسپی خود ہی پیدا کر لیتی ہے۔ پھر بھی آجکل فلمیں کم کم دیکھتا ہوں کہ ان کی طوالت، ماردھاڑ اور شورشرابا گراں گزرتا ہے۔

☆ آپ کی تخلیقات کے مطالعے کے بعد انسانی نفسیات پر آپ کی گرفت کا قائل ہونا قاری کی مجبوری ہے۔ یہ علم آپ کی دسترس میں کب اور کیسے آیا؟

☆☆ جس کسی کی بھی سوچیں عملی زندگی میں پیوست ہوتی ہیں۔ اس پر یہ علم خود بخود نازل ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں ادب کو زندگی کا عکاس ماننے والے کے لئے اظہار بھی آسان ہو جاتا ہے۔

☆ جس مقصد کے حصول کی خاطر آپ زچگی کا درد سہنے پر مجبور ہوئے اُسے حاصل کرنے میں کس حد تک کامیاب رہے نیز وہ مقصد ہے کیا؟

☆☆ آپ نے کبھی پاکستانی فرد کا جائزہ لیا ہے؟ لیا ہوتا تو اس چیونٹی کی پشت پر اُس ہاتھ کو بھی دیکھ لیتے جو اسے صدیوں سے اپنے چاروں پاؤں تلے مسل رہا ہے اور چیونٹی اسے خدا کی رضا سمجھ کر عبادتی انہماک سے قبول کر رہی ہے۔ میرا مقصد صرف یہی رہا ہے کہ چیونٹی کو ہاتھی کی بدنیتی اور دانستہ جبر سے آگاہ کروں اور سمجھاؤں کہ کسی طور اس ہاتھی کی سونڈ میں گھس جائے اور اُسے مار دے۔

اس ہاتھی کے ایک پاؤں نے چھ صدیوں سے اجتہاد کا دروازہ بند کر کے چیونٹی کی سوچ منجمد کر دی ہے تا کہ وہ کوئی سوال نہ پوچھ سکے۔ دوسرا پاؤں ملوکیت اور آمریت کا بھاری ستون ہے۔ تیسرا پاؤں ملا کے غیر اسلامی مذہب کی لاٹھی اور دوزخ کی دھمکیاں ہیں اور چوتھا پاؤں سماجی ناہمواریوں کا قلعہ ہے۔ جس میں سے وڈیرے، شیخ، خان اور پیر استحصال کی توپ چلاتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ باقی جسامت کے تاریک سائے علم کی روشنی اس چیونٹی تک نہیں پہنچنے دیتے۔

اسی مقصد کے لئے افسانے لکھے۔ صحافتی مضامین لکھے اور وطن کی سیاست کی اصلاح کے لیے دیگر تمام پارٹیوں سے مختلف ایک سیاسی پارٹی بنائی۔ میرا کام صرف اتنا تھا کہ قدرت کی ودیعت کردہ صلاحیتوں کو حتی المقدور استعمال میں لاؤں وہ میں نے کر دیا۔ اب نتیجہ خدا کے ہاتھ میں ہے اور اُس کا اعلان صرف وقت ہی کیا کرتا ہے۔

☆ آپ کی تخلیقات پر سنجیدگی کی دبیز تہہ نظر آنے کے اسباب کیا ہیں؟

☆☆ دھول والی زمین پر چلیں تو پاؤں پر خاک کی دبیز تہہ جم ہی جاتی ہے۔ ہوش سنبھالا تو پہلے قیام پاکستان کی نوید ملی پھر پہلے چند سنہری برسوں میں پاکستان کی حیرت انگیز ترقی تابناک مستقبل کی نوید دیتی رہی۔ یوں لگتا تھا مشیت ہماری قوم کی خوشبو کی طرح پذیرائی کر رہی ہے۔ ایسے میں مسکراہٹیں بے ساختہ ابھریں اور میں مزاح نگار بن گیا۔

پھر غاصبوں نے بڑی بدنیتی اور مہارت سے عوام کو امورِ مملکت سے بے دخل کرنا شروع کر دیا۔ قدرت نے یوں سزا دی کہ پہلے تو ملک ٹوٹا پھر ماضی کی خوشبو حال اور مستقبل کی بدبو میں بدلنے لگی۔ ایسے میں مزاح خود بخود غائب ہونے لگا۔ جب مسکراہٹوں پر آنسو غالب آ جائیں تو مشاہدے اور تجربے کو نچوڑنے سے سنجیدگی ہی ٹپکے گی۔ بشرطیکہ ادب زندگی کی مکمل عکاسی کرتا ہو۔

☆ C.S.S. آفیسر کے طور پر آپ نے تمام عمر اعلیٰ عہدوں پر کام کیا ہے جبکہ آپ کی کہانیاں اور اُن کے کردار زیادہ تر نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں؟

☆☆ ہماری نعرہ باز جذباتی قوم بھول جاتی ہے کہ محدود افرادی قوت والی انگریز قوم نے قریباً ایک تہائی دنیا پر صرف مقامی سول سرونٹس کے ذریعے دو تین صدیوں تک حکومت کی ہے۔ جنہیں مسلسل تربیت دی جاتی تھی کہ وہ عوام کے روزمرہ مسائل حل کرتے رہیں تا کہ اس وجہ سے بغاوت کا امکان نہ ہو۔ (یہاں زور صرف ''روزمرہ'' مسائل پر ہے سیاسی یا مذہبی مسائل انگریز حاکم اپنے ہاتھ میں رکھتا تھا) اس مقصد کے لیے سرکاری ملازمین کڑے ڈسپلن میں پوری غیر جانبداری سے قانون کا موثر نفاذ کرتے تھے اور مسائل کا جلد از جلد حل تلاش کرتے تھے۔ اسی لئے انگریز کے زمانے میں ڈپٹی کمشنر کو ''ضلع کا مائی باپ'' کہا جاتا تھا۔ اور یہ اصطلاح انگریز کی وضع کردہ نہ تھی بلکہ ایک عوامی لقب تھا۔ اس کا اہم پہلو یہ ہے کہ انگریز کا فیلڈ آفیسر (FIELD OFFICER) عوام کے مسائل کے قریب ہوتا تھا اور مقامی زندگی کو بہت قریب سے دیکھتا رہتا تھا۔

انگریز چلا گیا مگر اس کی تربیت اُس وقت تک کام آتی رہی جب تک اُسے دانستہ تباہ نہیں کیا گیا۔ CSS میں شمولیت کے بعد مجھے اس وقت فیلڈ (FIELD) میں کام کرنے کا موقع ملا جب ہمارے وڈیروں اور جرنیلوں نے اپنے شاہانہ اطوار کے لئے انگریز کا وضع کردہ سانچہ ابھی توڑا نہیں تھا۔ (سابقہ انگریزی سلطنت اور موجودہ برٹش کامن ویلتھ میں پاکستان واحد ملک ہے جہاں یہ سانچہ محض اس وجہ سے توڑا گیا کہ سول سرونٹس (CIVIL SERVANTS) حاکموں کی بے راہ روی روکنے کے لیے قانون کا حوالہ دیتے تھے) پرانے سانچے کی تربیت اور ڈسپلن کے مطابق زیادہ تر متوسط اور نچلے طبقے کے ہی مسائل سے میرا واسطہ تھا اسی لئے وہ میرا موضوع بنتے رہے اور میری تحریروں سے قاری اکثر اندازہ لگا سکتا ہے کہ کس زمانے میں میری تعیناتی کس علاقے میں رہی۔

☆ آپ افسانے کے ذریعے مکمل ابلاغ کے حامی گردانے جاتے ہیں۔ یہ فرمائیے کہ آپ اپنے افسانوں کا ابلاغ کرنے میں کس حد تک کامیاب رہے اور معاشرے کو اُس سے کیا فوائد حاصل ہوئے؟

☆☆ لکھنے والا تو قاری کے دل و دماغ تک پہنچنے کی کوشش ہی کر سکتا ہے۔ ابلاغ کی کامیابی کا فیصلہ تو قاری نے صادر کرنا ہے اور اگر یہ فیصلہ موافق دیا جاتا ہے تو پھر کسی اور فائدے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ادب کے ابلاغ اور مذہب کی تبلیغ میں بہت فرق ہے۔ ادب صرف رسائی چاہتا ہے جبکہ تبلیغ ایمان کی رسید بھی طلب کرتی ہے اور اعمال کی اطاعت بھی۔

☆ ایک طرف آپ قاری کو بدی کے خلاف صف آراء ہونے کی تلقین فرماتے ہیں دوسری جانب نیکی کو فاتح دکھلانے کے بجائے بدی کو غالب دکھاتے محسوس ہوتے ہیں؟

☆☆ قدرت نے اپنے نظام میں شر کا پلڑا بھاری رکھا ہے۔ (نہ معلوم کیوں؟ یہ ہم نہیں سمجھ سکتے) مگر اس کے باوجود خیر کا جہاد جاری رہتا ہے۔ زندگی میں خیر و شر کا یہی تناسب میری تحریروں میں بھی جھلکتا ہے۔

☆ کسی زمانے میں آپ ادب کو تبدیلی کا بہترین ذریعہ گردانا کرتے تھے۔ آج جبکہ تمام اخلاقی قدریں زوال پذیر بلکہ سرِ عام نیلام ہو رہی ہیں تو آپ کا نقطۂ نظر کیا ہے؟

☆☆ نقطۂ نظر اب بھی وہی ہے لیکن بسا اوقات غلط سمجھا جانے کی وجہ سے یہ وضاحت ضروری ہے کہ ''ادب'' میں صرف ادیب کا قلم ہی نہیں بلکہ ادیب کی عملی جدوجہد بھی شامل ہے۔ فیض احمد فیض نے اپنی کتاب ''دستِ صبا'' کا ابتدائیہ سنٹرل جیل حیدر آباد میں لکھا تھا۔ ان کے یہ فقرے اس وضاحت کے لیے مستعار چاہتا ہوں:

> ''شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے۔ گرد و پیش کے مضطرب قطروں میں زندگی کے دجلا کا مشاہدہ اس کی بینائی پر ہے۔ اسے دوسروں کو دکھانا اس کی فنی دسترس پر اس کے بہاؤ میں دخل انداز ہونا اس کے شوق کی صلابت اور لہو کی حرارت پر۔ اور یہ تینوں کام مسلسل کاوش اور جدوجہد چاہتے ہیں''۔

لہو کی ایسی حرارت قیام پاکستان کے لیے علامہ اقبال کی جدوجہد میں بھی نظر آتی ہے اور مارشل لاء کے خلاف حبیب جالب اور احمد فراز کے احتجاج میں بھی۔ اس کے علاوہ دنیا بھر کے دیگر ادیبوں میں بھی مثالیں مل جاتی ہیں۔ جارج برنارڈ شا (GEORGE BERNARD SHAW) گراہام ویلیس (GRAHAM WALLACE) اور ایچ۔ جی۔ ویلز (H.G.WELLS) کی انگلستان کی FABIAN SOCIETY میں سرگرمی۔ دوسری جنگ عظیم میں ژاں پال سارتر (JEAN PAUL SARTRE) اور البرٹ کامیو (ALBERT CAMUS) کی غازی جرمنی کے خلاف خفیہ سرگرمیاں اور میلان کنڈیرا (MILAN KUNDERA) کا چیکوسلوواکیہ پر روسی قبضے کے خلاف جہاد وغیرہ۔

☆ کہانی کی بیرونی ہیئت اور فنکار کے داخلی تناؤ میں آہنگ پیدا کرنے کے لئے آپ کس قسم کی تکنیک استعمال کرتے ہیں اور اس سے کس طرح کے فوائد حاصل ہوتے ہیں؟

☆☆ بچے کی پیدائش کی طرح تخلیقی عمل بھی خودکار ہے جسے فطرت ازخود چلاتی ہے۔ اور اس میں کسی انسانی تکنیک کی گنجائش نہیں ہوتی۔ میرے خیال میں تخلیقی عمل میں شعوری کاوش کا دخل نہیں ہوتا۔ اگر ہو جائے تو وہ آمد نہیں رہتی۔ بلکہ آورد میں بدل جاتی ہے۔ اس کا آغاز وجدان (INSPRTATION) کے قدرتی چشمے سے ہوتا ہے۔ پھر اس کی تنومند لہر میں فن کار کی پوری شخصیت اس طرح تیرتی جاتی ہے کہ فنکار کا داخلی تناؤ (یعنی زچگی کا درد) کہانی کی بیرونی ہیئت (یعنی بچہ) کو جنم دے دیتا ہے۔ فنکار کے پاس کوئی تکنیک نہیں ہوتی کہ وہ اس عمل پر اثر انداز ہو سکے۔ اس لئے اس عمل کا نہ تو تجزیہ ہو سکتا ہے اور نہ فوائد یا نقصانات گنوائے جا سکتے ہیں۔

☆ آپ کی نسبت کردار نگاری کے وصف کا اعتراف بڑی شدّ و مد سے کیا جاتا ہے۔ یہ عمل دانستہ ہے یا غیر دانستہ نیز اس حوالے سے آپ کب، کہاں، کیسے اور کس سے متاثر ہو کر اس جانب گامزن ہوئے؟

☆☆ ایک کمرے کا خوبصورت مکان ہو، تاج محل ہو، یا دیوارِ چین ہو۔ یہ سب ایک ایک اینٹ یا پتھر اکائی جوڑ کر بنائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی مجموعی خوبصورتی میں ہر اکائی کا حصہ ہے۔ یہی حال زندگی کا ہے جو افراد کے طرزِ عمل کی مجموعی صورت ہوتی ہے۔ چنانچہ زندگی کا طلاطم افراد کی اٹھائی ہوئی لہروں سے بنتا ہے ادب زندگی کی عکاسی کرتا ہے تو ہر اینٹ یعنی فرد کی تراش خراش پر غور کئے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے میں کردار نگاری کو ناول یا افسانے کی روح سمجھتا ہوں۔ جدید افسانہ چونکہ زندگی کو علامتی۔ اساطیری اور تجریدی انداز میں پیش کرتا ہے اور حقیقی عکاسی نہیں کرتا اس لئے اس میں کردار نگاری غیر ضروری اور قریباً قریباً ناپید ہے۔ شاید اسی لئے میں اپنے آپ کو جدیدیت کے کوچے میں جانے پر آمادہ نہیں کر سکا۔ لاشعور اور اجتماعی لاشعور کے خدوخال نہیں ہوتے۔ اور جہاں خدوخال نہ ہوں وہاں مجھے دھواں ہی دھواں نظر آتا ہے۔

میں کردار نگاری کے معاملے میں کسی ایک فرد یا مکتب سے متاثر نہیں ہوا بلکہ میرا جملہ ادبی ذوق ہی اس روایت نے تراشا ہے۔ اردو کے علاوہ انگلش میں فرانسیسی، روسی اور انگریزی ناول یا افسانے یا جو مطالعہ کر سکا ہوں اس کی کلاسیکی عظمت ان کرداروں کی وجہ سے ہی ہے جو قاری کے ذہن میں نہ صرف اٹک جاتے ہیں بلکہ بول چال میں معتبر حوالے بن جاتے ہیں۔

پاکستان میں گذشتہ صدی کی ساٹھ کی دہائی سے مغرب کی تقلید میں جو ادبی تجربات مرحلہ وار ہوتے رہے ہیں ان کے جواز، تاویل اور ضرورت کے

متعلق تحریریں میرے دل کو بھاتی بھی ہیں اور قائل بھی کرتی ہیں۔لیکن ان کی کوکھ سے جوادب پیدا ہوتا رہاہے وہ مجھے اس طرح مسحور نہیں کرتا۔جیسے ماضی کا کلاسیکی ادب کرتا تھا۔چنانچہ میں اپنے ذہن اور ذوق کی ناپختگی کا طعنہ تو قبول کرلیتا ہوں مگر یہ قبول نہیں کرتا کہ وہ پانی پیؤں جس کا ذائقہ مجھے پسند نہیں۔ایک ہی تو مختصر سی زندگی ملی ہے کیا اسے بھی فیشن کے کھوکھلے پن پر قربان کردوں؟

☆ مفتی صاحب! اگر کوئی آپ سے پیشہ ور اور غیر پیشہ ور ادیب کی تخصیص کے حوالے سے دریافت کرے تو آپ کا جواب کیا ہوگا؟

☆☆ خوش قسمت ہیں وہ لکھنے والے جو ہمہ وقت ادیب ہیں اور پیشہ ور کہلاتے ہیں۔چند مستثنیات کے علاوہ اگر پاکستان میں ہر ادیب اپنے قلم سے باعزت روزی کماسکتا تو میں اُس زندگی کو ترجیح دیتا۔اسی خلش کی وجہ سے میں عمر بھر پاکستانی ادبی اداروں (رائٹر گلڈ، اکادمی آف لیٹرز، ارباب ذوق کے مختلف حلقوں) اور دیگر ادبی تنظیموں سے احتجاج کرتا رہا ہوں کہ اگر وہ اپنے آپ کو صرف نظری یا فکری بحثوں اور ادبی کانفرنسوں تک محدود رکھتے ہیں اور ادیب کے حقوق کے لیے کاپی رائٹ قوانین کے صحیح نفاذ کی جدوجہد نہیں کرتے تو ان کی موجودگی کا کوئی جواز نہیں۔طوالت سے گریز کی وجہ سے تفصیلات میں نہیں جاؤں گا۔صرف دو مثالیں دوں گا۔

مغرب میں پبلشر اور ادیب کا رشتہ برابری کے کاروباری انسانوں جیسا ہے۔مروجہ پرکھ کے مطابق ادیب کی تحریر کا معاوضہ رائلٹی کی شکل میں کاپی رائٹ قوانین کے تحت اسے ملتا رہتا ہے۔مگر پاکستان کے جاگیر دارانہ نظام اور ویسی ہی سماجی نفسیات میں یہ رشتہ بھی زمیندار اور مزارع کے طرح ایک استحصالی رشتہ ہے۔ 1970ء کی دہائی کے دوران میں نے اس خیال کا اظہار کیا تو چند ادبی رسالوں اور اخباروں میں نہ صرف بحث چھڑ گئی بلکہ کسی نے خط کے ذریعے دھمکی دی کہ اس خیال کی تشہیر نہ کروں ورنہ مجھے ادبی دنیا میں بہت نقصان ہوگا۔ میں نے انتظار حسین سے ذکر کیا تو انہوں نے 9 ستمبر 1979 کے روزنامہ مشرق میں اس پر کالم لکھ ڈالا۔

دوسری مثال 1994 کے آس پاس اسلام آباد میں ادیبوں کی قومی کانفرنس کی ہے،جس میں ''پاکستانی ادیب کے مسائل'' کے عنوان سے میں نے انہی خیالات پر مشتمل ایک مضمون پڑھا۔جس پر نہ تو کوئی بحث ہوئی اور نہ آخری سفارشات میں کوئی تجویز بنی البتہ کافی عرصہ تک مجھے ادبی کانفرنسوں کے دعوت نامے بند رہے۔(یہ مضمون نومبر 1995 کے رسالے علامت (لاہور) میں شائع ہوا۔)

اس پس منظر میں آپ کے سوال کا کیا جواب دے سکتا ہوں سوائے اس کے کہ غیر پیشہ ور جز وقتی ادیب اگر کل وقتی اور پیشہ ور ادیب بن جائے تو بہتر ادب پیدا ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔

☆ کسی تحریر میں آپ نے مورخین اور ناقدین کے لئے لفظ ''نام نہاد'' استعمال کیا ہے۔اس لفظ کے استعمال سے آپ کا اضطراب عیاں ہے۔ذرا کھل کر اس موضوع پر دل کی بھڑاس نکالئے؟

☆☆ جس تحریر کا آپ نے ذکر کیا ہے اس کی دیگر غلطیوں کے علاوہ ایک غلطی یہ بھی تھی وہاں سے بھی ایک سوالنامہ ملا تھا جس کے تحریری جواب دئے گئے۔میرے ریکارڈ کے مطابق میرا فقرہ یوں تھا ''بہتر ہوگا آپ یہ سوال نقادوں سے پوچھیں''۔مگر آخری شکل دیتے وقت لکھنے والے نے یوں کردیا ''یہ سوال تو آپ کو ناقدین اور نام نہاد ادبی مورخین سے پوچھنا چاہیئے''۔اس میں میرا اضطراب کوئی نہیں البتہ سوالنامے کا غلط استعمال کیا گیا ہے۔

☆ ایک رواج ہمارے ہاں الفاظ و القاب کا بے جا استعمال بھی ہے جسے چاہیں ہم مفکّر' دانشور اور مورخ کا خطاب دے ڈالتے ہیں۔آپ کے بارے میں احباب کی معقول تعداد مفکّر ادیب کا تصور کس بنیاد پر قائم کئے ہوئے ہے؟

☆☆ القاب پرستی زوال پذیر معاشروں کی خود فریبی ہوتی ہے۔ملوکیت کے زمانے میں نااہل بادشاہوں کے لئے بڑے بڑے القاب گھڑ کر ہی ان کا قد بڑھایا جاتا تھا۔اور درباری معاشرے اسی روش پر چل پڑتے تھے۔میں اپنے آپ کو کسی القاب کا حق دار نہیں سمجھتا۔صرف اتنا چاہتا ہوں کہ زندگی نے جو سوچیں مجھے دی ہیں وہ دوسروں تک پہنچاؤں۔اور دوسروں کی سوچوں سے خود بھی مستفید ہوتا رہوں۔یہ دنیا سوچوں کا ذہنی میلا ہے،جس میں ہر سوچ کا رنگ ہر فرد کی مصلحت یا جرأت کے مطابق ہے۔

☆ اوپر کی گفتگو میں آپ نے غیر ملکی اہل قلم کا ذکر کثرت سے کیا ہے۔ اپنے پسندیدہ ادیب اور شخصیت وفن پر اُس کے اثرات کی بابت کچھ بتلائیے؟

☆☆ پسندیدہ ادیب کا دعویٰ تو وہ کرے جو سارے ادیب کو پڑھ کر ایک معروضی رائے قائم کرچکا ہو۔میں تو اپنے محدود مطالعے میں سے کسی بھی ملک کے ادیب کی اچھی تحریر پسند کرتا ہوں۔جو تراجم کی وساطت سے پڑھ سکوں ویسے تو کئی انگریز مصنفین کی عظمت کا قائل ہوں مگر ساتھ ہی جوزف کانریڈ (JOSEPH CONRAD) کی کہانیوں اور ناولوں کو پسند کرتا ہوں۔جو انگریز نہیں تھا بلکہ پولینڈ سے نکل کر زندگی بھر ساری دنیا کے سمندروں پر سفر کرتا رہا اور انگریزی میں لکھتا رہا۔پھر ایک ہی وجہ سے فرانسیسی ادیب موپساں۔اردو ادیب سعادت حسن منٹو اور ادیبہ عصمت چغتائی کا بھی قائل ہوں کہ ان تینوں میں جرأت اظہار رہی نہیں ادبی ہنر مندی بھی تھی اور منافقت کی بجائے زندگی کو دیانتداری سے دیکھنے والی آنکھ بھی تھی۔

اپنے اوپر اثرات کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ میں شعوری طور پر تو کسی کی نقالی یا پیروی نہیں کرتا مگر لاشعور تک کون پہنچ سکتا ہے۔

☆ آپ کے ہاں پلاٹ،کردار اور ماحول کی رنگا رنگی اور وسعت کو ایک حلقہ بین الاقوامی شہرت کی طلب سے منسوب کیوں کرتا ہے؟

☆☆ آپ بڑی دور کی کوڑی لائے ہیں۔ بین الاقوامی شہرت کے طالب تو آجکل مغرب سے مستعار ماڈرن نظریوں اور تجربوں کی سیڑھیاں چڑھتے رہتے ہیں۔ میں تو پرانی کلاسیکل روایات کا پروردہ، پرستار اور قلم کار ہوں۔ نئے نقادخانوں میں تو پرانی طوطی کی آواز نہیں جاتی۔

☆ بحیثیت مجموعی ،ادیب مسعود مفتی ہمیں خوف زدہ کیوں دکھلائی دیتے ہیں۔ ساری دنیا جب آگ اور خون میں نہا رہی ہے تو آپ کے ہاں اس کا ذکر اور خوف اس شدت سے کیوں نظر آتا ہے؟

☆☆ معذرت خواہ ہوں کہ آپ کا سوال پوری طرح سمجھ نہیں سکا۔ اگر ساری دنیا آگ اور خون میں نہا رہی ہے اور میرے ہاں بھی اس کا ذکر شدت سے آیا ہے تو آپ اُسے خوف کہیں گے یا حقیقت نگاری؟

☆ کچھ لوگ سانحہ مشرقی پاکستان کو آپ کے فنی سفر کا اہم سنگِ میل کیوں گردانتے ہیں؟

☆☆ شاید اسی وجہ سے کہ مشرقی پاکستان میں جو کچھ میں نے دیکھا اسے پوری دیانتداری سے ان ہم وطنوں تک پہنچانے کی کوشش کرتا رہا۔ جو سنسر شپ کی وجہ سے اس واردات کی تفصیلات سے بالکل لاعلم تھے۔ اور یہ کوشش اس زمانے میں کرتا رہا جب حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ زیرِ زمین دفن کرنے کے بعد ہماری تمام حکومتیں یہ چاہتی تھیں کہ قوم اس سانحے کو بھول جائے اس معاملے میں ہمارا درباری معاشرہ بھی اس کا ساتھ دے رہا تھا اور اس موضوع پر بات کرنے سے بچتا رہتا تھا۔ اگر اس کے علاوہ کوئی وجہ ہے تو وہ میرے علم میں نہیں ہے۔

☆ سقوطِ مشرقی پاکستان کے وقت آپ کہاں اور کس پوزیشن میں تھے اور اُس وقت آپ کے احساسات کیا تھے؟

☆☆ مئی 1971 سے سقوط ڈھاکہ تک میں مشرقی پاکستان کی صوبائی حکومت میں محکمہ تعلیم کا سیکرٹری تھا۔ اس زمانے کے متعلق اپنے احساسات اپنی ادبی اور صحافتی تحریروں میں درج کرتا رہا ہوں۔ جیسا کے پچھلے سوال کے جواب میں کہہ چکا ہوں ۔ اسی سوالنامے میں ان کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ کتابوں کی فہرست آپ کو بھیج چکا ہوں۔

☆ تیسری دنیا بالخصوص پاکستان کے بیوروکریٹ اہلِ قلم کو سچ بولنے کا عارضہ کب اور کیوں لاحق ہوا اور اس پُل صراط پر چلنے کی اُسے کیا قیمت ادا کرنا پڑی؟

☆☆ اسے طنز یا سوال جو بھی سمجھا جائے۔ اس کا ایک ہی جواب ہے کہ ہر زمانے اور ہر ملک میں ایسے لوگ ہمیشہ موجود ہوتے ہیں۔ قیمت کی ادائیگی کے لئے مناسب ریسرچ اور رپورٹ کی ضرورت ہے۔

☆ ملازمت سے فراغت کے بعد آپ نے ''پاک جمہور'' نامی سیاسی جماعت کی داغ بیل ڈالی تھی۔ سیاست میں آپ کی آمد اور ناکامی کی وجوہات کیا ہیں؟

☆☆ جی ہاں! میں نے بھی سیاست کی اصلاح کے لیے پاک جمہور پارٹی کا تجربہ کیا تھا۔ جو تمام سیاسی پارٹیوں سے مختلف تحریک تھی۔ اوپر سے نیچے آنے کی بجائے اس کی تنظیم نیچے سے اوپر جاتی تھی۔ تاکہ تین منزلہ شفاف الیکشن کے ذریعے لوگ اپنی صفوں میں سے نئی ضلعی۔ صوبائی اور قومی قیادت تلاش کریں اور کرتے رہیں۔ من جملہ دیگر اخلاقی اصولوں کے ہمارے تین اہم ستون یہ تھے (۱) کلاس روم کے انداز میں اپنے ممبروں کو اصلی جمہوریت کی عملی تربیت دینا (۲) خدمتِ خلق اور (۳) دولت کے بغیر سیاست۔ جس میں ہر ممبر اپنی سیاسی سرگرمیوں کا خرچہ اپنی جیب سے برداشت کرے گا۔

اس لحاظ سے آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ سوچ غالباً خاکسار تحریک سے بچپن کی وابستگی (چھٹی جماعت سے پہلے کی عمر) اور اس کے دیرپا اثرات کا نتیجہ تھی۔

اصل میں سرکاری ملازمت کے دوران اپنی بات کہنے کا واحد ذریعہ ادب تھا۔ 1994 میں ریٹائر ہونے کے بعد کھل کر بات کرنے کے لیے صحافتی مضامین لکھے۔ چار برس بعد احساس ہوا کہ یہ وقت کا زیاں ہے کیونکہ موجودہ سیاسی پارٹیاں تو اپنی غیر جمہوری اور موروثی شکل اور عمل بدلنے کے لیے تیار نہیں۔ اس لئے لوگوں کو جمہوریت کی عملی تربیت دینے کے لیے خود ہی مختلف قسم کی پارٹی کا تجربہ کیا جائے۔ تب 1998 میں پاک جمہور پارٹی کے اجراء کے بعد ملک کے طول وعرض میں ہزاروں ممبران بنے۔ مگر وہ تربیتی دور میں سالانہ الیکشن کی طرف راغب نہ ہوتے تھے۔ اول تو الیکشن سے بچنے کی ہر کوشش کرتے رہتے تھے اور جہاں الیکشن ہو جاتے وہاں اگلے الیکشن کا راستہ روک کر تاعمر نامزدگی کا مطالبہ کرتے تھے۔ قصہ مختصر یہ کہ وہ پرانے روایتی سیاسی کلچر کو چھوڑ کر نیا جمہوری طریق اختیار نہیں کرنا چاہتے تھے۔ بلکہ دوسری پارٹیوں کی طرح عہدوں پر نامزدگی کا اصرار کرتے تھے اور ہماری پارٹی میں پیسے اور مراعات کی فراوانی چاہتے تھے۔ الیکشن عملی جمہوریت اور دولت کے بغیر سیاست تو ہماری پارٹی کی بنیاد اور روح تھے۔ جب ممبران کے لیے یہ قابل قبول نہ تھے تو گیارہ برس کی کوشش کے بعد 2009 میں پارٹی بند کر دی۔ دراصل ہماری اصلاحی کوشش وقت سے بہت پہلے شروع کر دی گئی تھی۔ اُس زمانے میں کرپشن کے لئے ہر خزانے کا دروازہ کھول دیا گیا تھا اور اس موقع سے فائدہ اٹھانے والے کسی اصلاحی راستے پر جانا نہیں چاہتے تھے۔

☆ کچھ لوگ اس واقعے کو آپ کے ذاتی معاملات سے بھی منسلک کرتے ہیں؟

☆☆ جس قسم کی سیاست سے ملک دولخت ہوا تمام ادارے غیر موثر ہوئے۔ کرپشن اور بے انصافی سے سب کی زندگی اجیرن ہوئی وہ سیاست ہر شہری کا ذاتی معاملہ ہی بن جاتی ہے۔

☆ آپ کے خیال میں سرکاری ملازم کو لکھنے، پڑھنے اور چھپنے کا کس قدر اختیار ہونا چاہیے یا یوں کہہ لیجیے کہ آپ کو اس حوالے سے کس طرح کی

صورت حال کا سامنا تھا؟

☆☆ لکھنے والا سرکاری ملازم دراصل دو مخالف سمتوں میں چل رہا ہوتا ہے۔اس لئے نہ گھر کا رہتا ہے نہ گھاٹ کا۔افسر اسے ادیب کہتے رہتے ہیں اور ادیب اسے افسری کا طعنہ دیتے رہتے ہیں۔سرکاری دنیا میں وہ سوتیلی اولاد کی طرح ہوتا ہے اور ادب کی دنیا میں ویسے ہی اپنی فطری احتیاط میں گم رہتی ہے کہ سرکاری عتاب سے بچی رہے۔اس بات کی وضاحت میرے ایک مضمون سے ہوسکتی ہے جو میں نے ''آخری ملاقات'' کے عنوان سے احمد ندیم قاسمی کی وفات پر لکھا تھا۔یہ مضمون سہ ماہی ''معاصر''۔لاہور(شمارہ4,3,2۔اپریل2007 تا مارچ2008) میں شائع ہوا تھا۔ویسے تو اکیڈمی آف لیٹرز نے بعد میں یہ مضمون اپنی کتاب میں بھی شامل کر دیا(پاکستانی ادب کے معمار سیریز کی کتاب ''مسعود مفتی۔شخصیت اور فن''۔صفحہ 159) مگر اس کے بھی کچھ حصے حذف کر دیے۔ یہ کتاب آپ کو بھیج چکا ہوں۔اب ''معاصر'' کے مضمون کی نقل بھیج رہا ہوں۔ جس میں سرخ لائن سے ان حصوں کو UNDER LINE کیا گیا ہے جو اکیڈمی کی کتاب میں شامل نہ کئے گئے۔

اس سے آپ کو''ادیب۔سرکار۔ادبی دنیا'' کی تکون کا اندازہ ہو سکے گا۔ جو بے ڈھنگی اور تکلیف دہ ہے۔ان کے علاوہ بھی ہر سرکاری ملازم پر (چاہے وہ ادیب ہے یا نہیں) گورنمنٹ سرونٹس کنڈکٹ رولز کی تلوار لٹکتی رہتی ہے جس کی بنیادی شرط یہ ہے کہ سرکاری ملازم غیر جانبدار رہے گا اور سب کو انصاف فراہم کرے گا۔اس لئے CORRECT OFFICER رہنے کے لیے میں جس ضلع میں بھی تعینات ہوتا تھا وہاں اپنی ادبی سرگرمیاں معطل کر دیتا تھا۔

یہ میرے زمانے کی باتیں ہیں اب حالات کافی مختلف ہیں۔اس لئے بہت ممکن ہے کہ آجکل کئی سرکاری ملازم یا ادیب میری بات سے اتفاق نہ کریں۔

☆ کیا آپ خود کو ایک کامیاب انسان تصور کرتے ہیں جواب اگر اثبات میں ہے تو اس کا کریڈٹ کس کو دینا چاہیں گے؟

☆☆ دونوں اقسام(کامیاب اور ناکام) کا ملا جلا انسان۔

☆ یہ ہی سوال اگر ہم ادیب مسعود مفتی سے دریافت کریں تو جواب کس طرح کا ہوگا یعنی آپ اردو ادب سے اپنی نسبت کس قسم کی توقعات باندھے ہوئے ہیں؟

☆☆ اندر کی تسکین کے لئے لکھنے والا باہر کی ادبی دنیا سے کوئی توقع نہیں باندھ سکتا۔

☆ نصف صدی قبل آپ نے استحصالی قوتوں کی نشان دہی فرمائی تھی۔ازاں بعد آپ نے جرنیلوں اور وڈیروں کو ملک دولخت کرنے کا ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔ وطن عزیز کے ہولناک حالات کا آج کون ذمہ دار ہے اور ان حالات کا انجام کیا دکھلائی دے رہا ہے؟

☆☆ نصف صدی سے تادمِ تحریر وہی کھیل جاری ہے جس میں وڈیرے سیاستدانوں ، فوجی آمروں اور مذہبی پارٹیوں کی ٹیم مسلسل ایک ہی اننگ (INNING) کھیل رہی ہے۔شروع سے اب تک عوام صرف فیلڈنگ (FIELDING) ہی کر رہے ہیں یا تماشا دیکھ رہے ہیں۔یہ کھیل اس وقت تک اِسی انداز میں جاری رہے گا جب تک عوام کھلی الیکشن کے ذریعے اپنی نئی ٹیم (یعنی سیاسی پارٹی جو جمہوری انداز میں چلے) نہیں بناتے اور خود میدان میں نہیں آتے۔

☆

مسعود مفتی کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو ادب کو ذہنوں میں تبدیلی لانے کا سب سے موثر ذریعہ سمجھتے ہیں اور وہ اس پر معذرت خواہانہ لہجہ بھی اختیار نہیں کرتے لیکن وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اگر نظریہ ادب پر حاوی ہو جائے تو وہ ادب پسند پراپیگنڈہ بن جاتا ہے۔ مگر وہ اس نظرِ التفات سے بہر حال محروم ہیں جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے! مسعود مفتی صف اول کے تخلیقی افسانہ نگار ہیں مجھے اُن کے ہاں کوئی لفظ ایسا نظر نہیں آتا ہے جس میں کسی پیغام کی آہٹ سنائی نہ دیتی ہو مگر افسانے کی بُنت پر مضبوط گرفت رکھنے والا یہ فنکار بیشتر صورتوں میں اپنی تحریر کو پراپیگنڈہ نہیں بننے دیتا۔ وہ ''افسانہ'' نہیں لکھتا اپنے قارئین کو کہانی سناتا ہے اور اس کا قاری اس کہانی کے سحر میں گم ہو جاتا ہے مگر جب وہ واپس اپنی دنیا میں لوٹتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ کہانی بیان کرنے والے نے اس کی سوچ کو بھی مہمیز دی ہے اور یوں وہ چاہتا ہے کہ کہانی سننے والا اس کی کہانی سے صرف حظ نہ اُٹھائے بلکہ ان راہوں سے بھی بچ کر نکلے جس پر چلنے والی قومیں ایک دن خود کہانی بن کر رہ جاتی ہیں۔

عطاءالحق قاسمی

(لاہور)

ایک مزاح نگار

ڈاکٹر وزیر آغا

(●)

میں نے ابھی ابھی بحرالکاہل کو چوتھی بار عبور کیا ہے۔لیکن لگتا یوں ہے جیسے آج پہلی بار عبور کیا ہو۔قصہ یہ ہے کہ پہلی دفعہ تو میں نے ایک ہوائی جہاز میں سفر کیا جس کے پائیلٹ شفیق الرحمٰن تھے۔شفیق الرحمٰن بہت تیز اڑتے ہیں اور خاصی بلندی پر اڑاتے ہیں اور سفر کی کوفت کو چٹکلوں اور لطیفوں سے کم کرنے میں انہیں کمال حاصل ہے۔ان کی معیت میں سفر بہت دلچسپ رہا اور جلدی سے کٹ گیا۔لیکن میں بحرالکاہل کو نہ دیکھ سکا۔بس یوں لگا جیسے نیچے بہت نیچے ایک قالین سا بچھا ہے جس پر لاکھوں کروڑوں سلوٹیں پڑی ہوئی ہیں۔ دوسری بار میں نے ایک سمندری جہاز میں بحرالکاہل کو عبور کیا۔اس جہاز کے کپتان رشید احمد صدیقی تھے۔وہ بڑے باغ و بہار آدمی ہیں۔سارا عرصہ بڑی مزے دار باتیں کرتے رہے۔انہوں نے مجھے جہاز کا ایک ایک کونہ دکھایا،خوب خاطر مدارت کی،تختہ جہاز پر پھرتے ہوئے ہر آدمی کو تختۂ مشق بنایا اور ہر نکتے میں سے سو نکتے نکال کر میرے سامنے چنتے چلے گئے۔وہ فطرتاً بڑے مہمان نواز ہیں۔گو جلد ہی بے تکلف بھی ہو جاتے ہیں۔چنانچہ کچھ چٹکیاں مجھے بھی سہنا پڑیں۔سفر محسوس نہ ہوا لیکن بحرالکاہل کو میں پھر بھی نہ دیکھ سکا کیونکہ جہاز کے ریلنگ سے سمندر کی سطح بظاہر نزدیک لیکن دراصل خاصی دُور ہوتی ہے۔تیسری بار پطرسؔ مرحوم کی معیت میں بحرالکاہل کو عبور کرنے کا موقع ملا۔پطرسؔ بھی خوب آدمی تھے۔ان کے ہاں مہم جوئی کا جذبہ بہت شدید تھا۔اور وہ چیزوں کو ذرا قریب سے دیکھنے کے آرزومند بھی تھے۔نیویارک میں ان سے ملاقات ہوئی تو فرمایا:''ایک ٹوٹی پھوٹی کشتی ہاتھ لگ گئی ہے۔بحرالکاہل کو عبور کرنے کا ارادہ ہے۔ساتھ چلو گے؟''میں خوشی سے اُچھل پڑا۔کشتی میں بحرالکاہل کا سفر؟ اور کیا چاہیے۔اس بار سفر کرنے کا لطف ہی جدا تھا اور پھر سمندر بھی تو قریب آ گیا تھا۔ لیکن پطرسؔ مرحوم بڑے زبردست ملاح تھے۔چپوؤں سے ایسے ایسے کرتب دکھاتے کہ میں سمندر کو دیکھنے کے بجائے اکثر ان کی فنی موشگافیوں کا نظارہ کرتا رہ جاتا۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے ساتھ سفر کرتے ہوئے موجوں کے اُتار چڑھاؤ اور ہوا کی برہمی اور سکوت سے پہلی بار تعارف حاصل ہوا اور بڑا لطف آیا اور اب آخری بار میں نے مسعود مفتی کی معیت میں ایک raft پر بیٹھ کر بحرالکاہل کو عبور کیا ہے اور میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اصل بحرالکاہل تو میں نے اب دیکھا ہے۔ہوائی جہاز کی کھڑکی،سمندری جہاز کی ریلنگ اور کشتی کے کنارے پر بیٹھ کر آپ سمندر کے لمس سے کبھی پوری طرح آشنا نہیں ہو سکتے۔ اس کے لیے تو kon tiki مہم کا سا جذبہ درکار ہے جو اُردو کے مزاحیہ ادب کے بحرالکاہل میں مسعود مفتی کے علاوہ مجھے اور کہیں نظر نہیں آیا۔

ریفٹ raft کی خوبی یہ ہے کہ جب اس پر سفر کریں تو سمندر کے بدن کا لمس ہر قدم پر محسوس ہوتا ہے اور مسافر لہروں کے کہرام میں سے گزرنے کے لیے اپنے ہاتھوں،کہنیوں،کھوپڑی بلکہ جسم کے جملہ حصوں کے بے دریغ استعمال پر خود کو مجبور پاتا ہے۔یہی لمس مسعود مفتی کی حسِ مزاح کا محرک بھی ہے کہ وہ فٹ پاتھ پر اتر کر،انبوہ کو چیر کر اور اشیا سے دست و گریباں ہو کر آگے کو بڑھتے ہیں لیکن ایک ایسے شخص کی طرح جس نے ابھی شریف آنکھ بند اور شریر آنکھ مستقلاً کھول رکھی ہو،وہ راستے کی ہر مضحک شے کو چھیڑتے اور اس سے لطف اندوز بھی ہوتے جاتے ہیں۔وہ کسی مصنوعی ذہنی سطح پر سے اشیاء کو نہیں دیکھتے اور اسی لئے ''خیال'' کے مزاح سے محفوظ رہتے ہیں اور نہ وہ تھڑے پر بیٹھ کر گزرتے ہوئے انبوہ پر آواز کستے ہیں اور یوں ''زبان'' کے مزاح سے بھی محفوظ رہتے ہیں۔وہ تو خود زمین پر چلتے ہیں اور قدم قدم پر واقعات کی بوالعجبیوں سے مزاح پیدا کرتے جاتے ہیں۔یہی کون ٹکی مہم کا فلسفہ بھی ہے کہ انسان لامسہ سے لطف اندوز ہو کہ یہی حِس سب سے زیادہ بھرپور اور براہِ راست ہے۔مزاح کی دنیا میں لمس کا عنصر صرف اس وقت جاگتا ہے جب انسان خود انبوہ کے قریب چلا جاتا ہے۔لیکن مصیبت یہ ہے کہ انبوہ کی یہ خاصیت ہے کہ وہ کانِ نمک کی طرح ہر شے کو اپنا جزو بدن بنا لیتا ہے اور فرد وہی کچھ محسوس کرنے لگتا ہے جو انبوہ چاہتا ہے کہ وہ محسوس کرے۔مسعود مفتی انبوہ میں شامل تو ہوتے ہیں لیکن اپنی اس انفرادیت کو ضائع نہیں ہونے دیتے جس نے انہیں انبوہ کی جملہ ناہمواریوں کا نباض بنا دیا ہے۔ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ مسعود مفتی ناہمواریوں کو طنز کا نشانہ اس قدر نہیں بناتے جتنا ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔یہی ایک طنز نگار اور مزاح نگار کا مابہ الامتیاز بھی ہے کہ طنز نگار فراز پر کھڑا ہوتا ہے اور مزاح نگار نشیب میں۔چونکہ مسعود مفتی نے زمین پر اتر کر اور افراد اور اشیاء سے ٹکرا کر اپنے لیے راستہ بنایا ہے اس لیے قدرتی طور پر وہ اس فاصلے کی زد میں نہیں آئے جو معصوم اور بے ساختہ تبسم کے بجائے خندۂ استہزاء کا ہمیشہ سے گرویدہ رہا ہے۔اب تک میری بات شاید واضح ہو گئی ہوگی۔میں عرض صرف یہ کرنا چاہتا ہوں کہ مسعود مفتی نے زندگی کو فاصلے سے نہیں دیکھا کہ فاصلہ اجنبیت پیدا کرتا ہے اور اجنبیت طنز کو جنم دیتی ہے۔انہوں نے ہر شے کو قریب سے دیکھا ہے اور اسی لیے ان کے ہاں اغماض اور درگذر اور ہمدردی کا میلان ابھرا ہے جو مزاح کا سب سے بڑا محرک ہے۔یہ چند مثالیں لیجیے:

اپنے مضمون ''کرکٹ نامہ'' میں کومنٹری کی وبا کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انہیں پان والے کی دکان سے آدھ پاؤ چھالیہ خریدنا تھی لیکن دکان کے سامنے کومنٹری سننے والوں کے ہجوم میں سے گزر کر دکان دار تک پہنچنا کوئی آسان کام نہ تھا۔چنانچہ:

’’ہم نے ہتھیار ڈال دیئے اور (ایک کومنٹری سننے والوں کو) پیسے دیتے ہوئے کہا، آدھ پاؤ چھالیہ دلوا دیں۔‘‘

انہوں نے دَن سے بھیڑ میں ہاتھ گھسیڑ دیا اور معلوم نہیں کس کو پیسے دیتے ہوئے بولے ’’بھائی ذرا آدھ پاؤ چھالیہ تو پکڑنا‘‘۔

ایک دوسری آواز نے اس آرڈر کو دہرایا اور کومنٹری میں ڈوب گئی۔ مگر کافی دیر گزر گئی اور ادھر سے رسید بھی نہ ملی۔ یاددہانی کی کوشش کی لیکن ان صاحب کو کومنٹری کے سحر سے جگانا بہت مشکل تھا۔ چنانچہ صبر کر کے خاموش ہوگئے اور باری باری پاؤں بدلتے کمنٹری سنتے رہے۔ بولنے والا چار پانچ فقروں کا وظیفہ کرتا جاتا تھا۔ پس منظر میں کبھی سیٹیاں بجتیں۔ کبھی بھینسے ڈکارتے۔ کبھی ورکشاپ کی کار کے چلنے کی آواز آتی اور کبھی گدھے ہینگنے لگتے۔ کمنٹری کرنے والا کبھی روانی سے بولتا، کبھی الفاظ ڈھونڈنے لگتا اور کبھی ایسے چلّا اٹھتا جیسے پتلون میں بھڑ گھس گئی ہو۔ سننے والوں کے چہرے بھی اسی تناسب سے چمکتے یا ماند پڑ جاتے۔ کافی دیر بعد ہمارے محسن نے فاتحانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے ہمیں کوئی چیز کاغذ میں لپٹی ہوئی دی۔ کھولا تو اندر سے بگلے کے سگریٹ کی ڈبیا برآمد ہوئی۔ ہم نے حیران ہو کر انہیں دیکھا تو بولے: ’’میں نے تو آپ کے سامنے چھالیہ ہی کہا تھا۔‘‘

ہم نے مصالحتی انداز میں عرض کیا ’’آپ آگے سے پوچھئے تو سہی‘‘

انہوں نے پہلے والے انداز میں پکار کر پوچھا۔ اسے حسب سابق دوسری آواز نے دہرایا اور کومنٹری میں ڈوب گئی۔ معلوم نہیں آگے کس مقام پر کانٹا بدلا۔ بہرحال ہمیں جواب یہ ملا ’’ہاں ہاں سگریٹ ہی تو بھجوائے ہیں۔‘‘

’’بس اور بے بسی‘‘ میں ایک بھری ہوئی بس سے ایک شخص کے اترنے کا منظر دیکھیئے:

’’بس کا دروازہ ’’کھل جا سم سم‘‘ کی تفسیر بنا دھڑاکے سے پھٹ پڑا اور اندر سے جسموں، بازوؤں، ٹانگوں اور سروں کے ایک مرکب کا تھوڑا سا حصہ منگارام کے بسکٹوں کی طرح پیک ہوا نظر آنے لگا۔

سواریوں کو اترنے دیجیے صاحب۔ بس کی انتڑیوں سے ایک آواز آئی اور باہر والے لوگ اسے ایک سہانا معاہدہ سمجھ کر فوراً راضی ہوگئے۔ انسانی مرکب میں ایک دراڑ پڑی اور ایک ہاتھ انگلیاں پھیلاتا ہوا نمودار ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک بازو نکل رہا تھا اور پیشتر اس کے کہ اس بازو کے مالک کا پتہ چل سکے، ایک دھچکے کے ساتھ ایک بوڑھی عورت باہر لوگوں سے آ ٹکرائی۔ یہ عمل دو دفعہ ظہور میں آیا اور دو سواریاں اُتریں۔‘‘

اور اب دیکھئے کہ وہ برج کھیلنے والوں کی ایک پارٹی کا کس قدر قریب سے جائزہ لیتے ہیں۔

’’ہم میز کے قریب پہنچے‘‘

’’السلام علیکم‘‘ بھیا نے آدابِ مجلس کا خیال رکھا۔

’’ڈبل‘‘ حصار میں سے کوئی بولا۔

’’ٹونوٹرمپ‘‘ کسی کے زکام زدہ نتھنے گونجے

’’فورکلب‘‘ مونچھیں غرّائیں

’’فورسپیڈ‘‘

’’فائیوڈائمنڈ‘‘

’’فائیوٹرمپ‘‘

’’دے دو جی‘‘ قریشی صاحب نے پتہ پھینکا۔ اسلم صاحب نے پتے میز پر بکھیر دیئے۔

’’ارررررے مر گئے‘‘

’’ول ڈن پارٹنر‘‘

’’ٹریفک ہینڈ‘‘

’’میرا چال ہے؟ تو یہ لیجئے‘‘

سب نے پتہ پھینکا۔ مرزا جی نے مسکراتے ہوئے سر سمیٹی اور ڈمی سے چال چلے۔ دوسری سَر، انہوں نے لے لی۔ پھر پہلی اور تیسری بھی جیت لی لیکن چھوتھی سر ہار گئے۔‘‘ ذرا بے بسی سے انہوں نے پارٹنر کی طرف دیکھا اور پھر ہماری طرف دیکھ کر بولے۔

’’وعلیکم السلام‘‘

ان چند نمونوں سے صاف ظاہر ہے کہ مسعود مفتی ڈرامائی کیفیات سے مزاح پیدا کرنے میں بڑے مشّاق ہیں۔ ان کے مزاحیہ مضامین کا مطالعہ کرتے ہوئے وِٹ (wit) کا استعمال بھی ملتا ہے۔ لیکن جس طرح آٹے میں نمک۔ لطیفہ گوئی بھی ہے لیکن صرف منہ کا مزہ بدلنے کے لیے۔ مزاحیہ کردار کی پیش کش کا میلان بھی ہے لیکن عرفی بھیا کی حد تک جسے بوقتِ ضرورت ہر طبقے کی نمائندگی پر مامور کیا جاسکتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ مسعود مفتی چھوٹے چھوٹے واقعات سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ یہ نہیں کہ واقعات ان پر یلغار کرتے ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جس راستے سے ان کا گزر ہوتا ہے وہ شاید ان کے ہم زاد کے لیے قطعاً سپاٹ، بے رنگ و بُو اور مضحک واقعات سے یکسر تہی ہو لیکن مسعود مفتی کی آنکھ کا کمال ہے کہ وہ اسے جس طرف گھماتے ہیں، افراد، اشیاء، الفاظ اور جملے اپنی عام ڈگر کو بھول کر فی الفور ایک عجیب سی بے ڈھنگی چال چلنا شروع کر دیتے ہیں۔ اسی بات کو میں ایک اور طرح پیش کرتا ہوں۔ قصہ یہ ہے کہ ہر فرد، شے یا لفظ کے دو رُوپ ہوتے ہیں۔ ایک ظاہری سنجیدہ، رکھ رکھاؤ والا روپ اور دوسرا مخفی غیر سنجیدہ اور لڑکھڑاہٹ والا روپ! اب اس بات کا تمام تر دارومدار دیکھنے والے کی آنکھ پر ہے کہ وہ شے یا فرد کی کھال تک رسائی حاصل کرتی ہے یا اس کے اندر کی ناہمواری کو بھی گرفت میں لے سکتی ہے۔ مسعود مفتی کا کمال یہ ہے کہ انہیں شے کا دوسرا رُخ فی الفور نظر آ جاتا ہے اور شاید شے کو مسعود مفتی فوراً نظر

باقی صفحہ ۲۲ پر ملاحظہ کیجیے

مُحدّب شیشے

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

(کراچی)

مسعود مفتی کے افسانوں کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ ان میں ''مقصدیت'' وہ موڑ لیتی ہوئی اور اس مقام پر پہنچتی ہوئی نظر آتی ہے جو اردو افسانہ نگاری کو اب تک حاصل نہ ہوا۔ مقصدیت کے سب سے زیادہ زور دار علم بردار جیسے کرشن چندر وغیرہ سیاسی معاملات یا دوسرے الفاظ میں اشتراکیت کے پروپاگنڈے سے آگے نہ بڑھ سکے۔ بدلتی ہوئی قدروں میں چکر کھا کھا کر رہ گئے۔ برخلاف ان کے مسعود مفتی کی نظر دائمی قدروں پر ہے اور اس چیز میں انہیں خاصی دلچسپی نظر آتی ہے، جسے ازل سے شر کہا جاتا رہا ہے۔ اس شر کے قاطع رجحان یعنی مذہب اور اس کے عملی زور پر بھی وہ غور کرتے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ یہ کہا جائے کہ ان کے افسانوں میں سب سے زیادہ زور دار افسانے رزم خیر وشر کے نقشے پیش کرتے ہیں تو غلط نہ ہوگا۔ مثال کے طور پر ان کے مجموعے ''محدب شیشے'' کے پندرہ افسانوں میں کم از کم سات کے بابت تو بالکل صحیح ہے۔ باقی آٹھ میں سوسائٹی کی قدریں، اتفاقات وغیرہ زیادہ سامنے ہیں، لیکن ان میں بھی معاشرے کی کوئی نہ کوئی عجیب بات کو بے نقاب کیا گیا ہے اور قاری کو دعوتِ فکر دی گئی ہے۔

جہاں تک ماحول کا تعلق ہے تو مسعود مفتی کے افسانوں میں ماحول مختلف ہیں اور دور دراز ممالک کے بھی واقعات سامنے لائے گئے ہیں۔ ہر ماحول کے الگ کردار اور طرز بھی سامنے آتے ہیں۔ مگر مرکزی مقصد ہر جگہ پیش پیش رہتا ہے اور افسانہ پڑھ چکنے کے بعد ماحول یا کردار اتنے ہی یاد رہ جاتے ہیں جتنا کہ ان کو مقصد سے تعلق ہے۔

افسانوں کے مختلف مقاصد سے وابستہ ہر طبقہ، ہر جنس، ہر صنف اور ہر نقطۂ خیال کے لوگ لائے گئے ہیں مثلاً افسانہ ''مصروفیت'' میں ایک گھریلو ماحول ہے اور اس میں ساس بہو اور لگائی بجھائی کرنے والوں کے نقوش ہیں، جن کے ذریعے یہ دکھایا گیا ہے کہ گھروں کے گھر تباہ کرانے میں کیسی قوتیں کام کرتی ہیں اور کس طرح ان کو آسانی سے ختم کیا جا سکتا ہے۔ یا افسانہ ''بھیڑیئے'' میں مشرقی پاکستان کی فضا ہے اور وہاں کی عورت کا المیہ سامنے لایا گیا ہے اور اس طرح یہ محسوس ہوتا ہے کہ مصنف نے ہر افسانے میں ایک الگ ہی دنیا کا نقشہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر ان کے مطالعہ کا مرکز انسان ہیں اور خاص طور پر انسان کی تلاش ہے۔ مسعود مفتی اپنے مجموعے ''محدب شیشے'' کے پیش لفظ میں خود فرماتے ہیں۔

> ''انسانیت کا زیادہ حصہ وہ لوگ ہیں جو زندگی کے طوفان میں ڈبکیاں کھاتے رہتے ہیں۔ کبھی آرام سے سطح پر تیر لیے، کبھی بھنور میں چکرانے لگے، اور کبھی گہرے طوفانوں میں پھنس گئے۔ نہ زندگی انہیں پیار کرتی ہے اور نہ ان کو زندگی سے پیار ہوتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو برداشت کرتے ہیں۔۔۔۔ یہ لوگ زندگی کا مقابلہ ضرور کرتے ہیں، مگر اُس پر فتح نہیں پا سکتے کیونکہ اپنی بات کو منوانے کی اُن کے بال و پر میں ہمت نہیں ہوتی، ہر زمانے میں دنیا کی ہر سوسائٹی کے ہر طبقے کا زیادہ حصہ انہیں لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے۔''

آگے چل کر وہ یہ بھی کہتے ہیں:

> ''یہ کہانیاں ایسے ہی لوگوں کی ہیں۔''

یہ نظریہ اور یہ قول مسعود مفتی کی ہر کہانی پر صادق آتے ہیں، مگر ان کا مخصوص اور زور دار مطالعہ ہمیں ان کے چھ افسانوں میں نظر آتا ہے۔ ''محدب شیشہ''، ''دعا''، ''یا خدا''، ''لمحہ''، ''مثبت منفی'' اور ''عورت'' ان میں سب سے زیادہ اہم مصنف کے نزدیک ''محدب شیشہ'' ہے جس کو انہوں نے اپنے مجموعے میں سب سے پہلے جگہ دی ہے اور جس کے نام پر ہی کتاب کا نام رکھا ہے۔ اس افسانے کے پہلے جملے سے مذہب ہمارے سامنے آ جاتا ہے، ایک روایتی مولوی صاحب جمعہ کے وعظ میں کہہ رہے ہیں۔

> ''یتیم مسکین اور بیوائیں عرش کا سہارا ہیں، ان کے آنسو پونچھو ان کے سر پر ہاتھ دھرو۔ اپنی کمائی سے ان کو حصہ دو''

اور پھر ماسٹر برکت علی کا کردار سامنے آ جاتا ہے۔ جس کا خاص رُخ یتیموں اور بیواؤں کی پرورش کی طرف ہے، جو ایک بیوہ نوراں نامی کی خاص طور پر نہایت خلوص اور غیر جانب داری سے مدد کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس سلسلے میں گاؤں کے کچھ لوگ جن میں شرفو کا نام خاص ہے۔ اُن پر شبہ کرتے ہیں۔ ماسٹر نیک ہونے کی وجہ سے تُند مزاج بھی ہیں اور ان کا غصہ جو اخلاقی غصہ یا (moral inorgnation) ہے انہیں شرفو، کی مرمت کر دینے پر مجبور کر دیتا ہے اور یہیں سے سارا کھیل بگڑنا شروع ہو جاتا ہے۔ سارے گاؤں میں وہ بدنام کیے جاتے ہیں۔ اور ہر شخص ان کو بے ایمان اور بدکار مان لیتا ہے، یہاں تک کہ وہ ایک صبح چارپائی پر مرے ہوئے ملتے ہیں۔ افسانہ روایتی مولوی کے اسی وعظ پر ختم ہو جاتا ہے جس سے شروع ہوا تھا، ماسٹر برکت علی ہی کے قسم کے انسان کی طرف مصنف کی توجہ ہے۔ اپنے پیش لفظ میں وہ کہتے ہیں:

> ''کہتے ہیں انسان کو خدا نے اپنے عکس میں بنایا ہے، لیکن اگر انسان یہی ہے جسے کچھ صلاحیتیں بخش کر دنیا میں ایک ہی دفعہ بھیجا جاتا ہے اور وہ آزادانہ رہ کر اپنی ہستی کی تکمیل کرنے کی بجائے زندگی کے مضبوط جبڑوں میں تڑپ تڑپ کر دم توڑ دیتا ہے۔ تو یہ خدا کا عکس نہیں، بلکہ المیہ ہے، بقول شاعر:

نہ خود ہیں نئے خدا ہیں نئے جہاں ہیں
یہی شہکار ہے تیرے ہنر کا

غرض بدی کی بے پناہ قوت اور نیکی کی پسپائی ہی وہ منظرنامہ ہے جس پر مصنف کی خاص توجہ ہے۔ ''دعا'' میں تن اسی مقام پر دکھائی دیتی ہے۔ ''مثبت منفی'' میں قریشی صاحب بھی یہیں نظر آتے ہیں۔ میری رائے میں اس فکری پہلو کا سب سے اہم مظاہرہ ''یا خدا'' میں ہوتا ہے، مذاہب نے خدا کے نام پر جس جس طرح خوں ریزیاں کی ہیں، ان کے بڑے ہی ہولناک مناظر سامنے آتے ہیں۔ ایک غار کا وجود ان سب کو فنی اکائی دیتا ہے اور قصہ گو ہیرو کا وجود صدیوں کے قصہ کو ایک جگہ سمیٹ لیتا ہے۔ تمام مناظر کو دیکھنے کے بعد وہ خدا کو پکارتا ہے:

''یا خدا تو کون ہے؟ تو کیا ہے؟ تو کدھر ہے؟ تو کیوں نہیں ایک دفعہ اپنا اصل روپ ظاہر کر دے تا کہ یہ سب جھگڑے رُک جائیں۔ یا خدا۔ یا خدا''

یہاں وہ وہی برکت علی کا سا آدمی نظر آتا ہے، جس کو بدی نے بالکل پسپا کر دیا ہے، مگر وہ مرتا نہیں بلکہ ان سب کتابوں کو فنا کر دینے کی کوشش کرتا ہے جن پر مذاہب کی بنیاد ہے، غار میں انہیں رکھ کر غار کے منہ کو پتھروں سے بند کر دینے کی کوشش کرتا ہے مگر کیا ہوتا ہے:

''آخری پتھر اُٹھائے وہ سنبھل سنبھل کر پتھروں پر پاؤں اٹکاتا اوپر چڑھ رہا تھا کہ نیچے سے پاؤں پھسلا اور ایک پتھر ہل گیا، وہ نیچے آ گرا، اور بنیادی پتھر ہلنے سے ساری دیوار اس پر آ پڑی، اس کے سر سے خون کے فوارے نکلنے لگے اور فوراً مر گیا۔ دیوار کے ایک دم گرنے سے ہوا کا تیز جھونکا غار کے اندر گیا اور مذہبی کتابوں کے اوراق پھڑ پھڑا اٹھے جن کی آواز غار کے اندر ایسے گونجی جیسے کروڑوں لوگ مسرت سے بے خود ہو کر تالیاں پیٹ رہے ہوں۔''

غرض یہ افسانہ بھی قنوطیت پر ختم ہوتا ہے اور ہمیں مذہبی اقدار پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

سارے مجموعے سے یہ امر ہم پر روشن ہو جاتا ہے کہ مسعود مفتی مفکّر پہلے ہیں اور مبصر یا فنکار بعد میں ہیں۔ ہر افسانے میں فکر کو ابھارنے کے لیے واقعیت اور فنی تاثرات دونوں کی طرف ذرا بے اعتنائی برتی گئی ہے۔ ان کے نیک لوگوں کی حماقت اور بدلوگوں کی بے حسی محض سطحی طور پر واقعیاتی کہی جا سکتی ہے۔ نیکی کے ساتھ اس قدر عقل اور ہمت کا فقدان اور بدی کے ساتھ ضمیر کی اس قدر کمی کسی خاص معاشرے میں ممکن ہو اور مصنف کے مشاہدے میں آئی ہو۔ مگر قرین قیاس ہرگز نہیں ہے اور اس کمی ہی کی وجہ سے ان افسانوں کا المیہ اکثر قنوطیت کی طرف لے جاتا ہے۔ جبکہ ٹریجڈی کا مقصد پسپائی کے تاثرات کا تزکیہ کرنا ہے، یہاں بقول شخصے زندگی بے نقاب تو ہو جاتی ہے، مگر اس کی تشکیل نہیں ہوتی۔ مصنف خود اپنے ہیرو کی طرح والضالین یا مغضوب علیہم کے دائرے میں ہے اور صراط المستقیم کا سراغ نہیں پاتا، عام مسلمان کا یہی حال ہے۔ مصنف اس کے آگے لن سفون میں ہے کہ اُسے اس حال کا احساس اور شدید احساس ہے، مگر اس سے آگے بڑھ کر تعمیری فکر تک پہنچنا اس کا مقصد ہی نہیں ہے، جیسا کہ اُس نے اپنے ''پیش لفظ'' میں صاف صاف بتا دیا ہے۔ قرون وسطیٰ کے یورپ میں پسپائیت اور کمال ناکامی کی طرف رجحان کو (accidre) کہا جاتا ہے، اور اس میں محو ہونا گناہ قرار دیا جاتا تھا، مگر انیسویں صدی کے رومانی ادیبوں نے اس ذہنی بیماری کو بہت اہمیت دی اور ان کے اثر سے ہمارے جدید ادیب بھی انتشار اور بے چینی کو جوں کا توں دکھانے پر فخر کرتے ہیں، حالانکہ اقبال کی آواز اپنے پورے زور کے ساتھ کہہ رہی ہے:

نہ ہو نومید نومیدی زوال علم و عرفاں ہے
امید مرد مومن ہے خدا کے راز داروں میں

اصل بات یہ ہے کہ نیکی اور عقل (Virtue & Wisdom) کے تعلق اور ان دونوں کا قوت (Power) پر انحصار سمجھنے سے قاصر ہیں۔ نیکی ایک منفی چیز ہے جس کو بدی کے سامنے جان دینے کے سوا اور کچھ نہیں رہ جاتا کہ ہم اس مثبت نیکی کا تصور ہی نہیں رکھتے جو مثبت چیز ہے اور آفتاب کی طرح تاباں ہے۔

بقیہ: ایک مزاح نگار

آ جاتے ہیں کہ وہ انہیں دیکھتے ہی ذرا سا ٹھٹھک کر تھرکنا اور ہکلانا شروع کر دیتی ہے۔ چنانچہ بظاہر تو مفتی صاحب ایک شریف شہری کی طرح فٹ پاتھ پر مصروفِ خرام ہوتے ہیں لیکن اپنی نظر کے لمس سے اردگرد کی دنیا میں ایک ایسا خوبصورت لیکن مضحکہ خیز کہرام برپا کرتے جاتے ہیں کہ ہر شے اپنے اصل روپ کی پیروڈی نظر آنے لگتی ہے۔ میرے خیال میں ایک اعلیٰ مزاح نگار کی پہچان محض یہ نہیں کہ وہ اشیاء کے مضحک پہلوؤں کو فی الفور دیکھ لیتا ہے بلکہ یہ کہ خود اشیاء مزاح نگار کو دیکھتے ہی پالتو پلّوں کی طرح ناچنا کودنا اور اس کے گرد اچھل اچھل کر چکر لگانا شروع کر دیتی ہیں (چنانچہ دیکھتے دیکھتے مضحک واقعات کے ڈھیر لگ جاتے ہیں)۔

اپنے مزاحیہ مضامین میں مسعود مفتی سرکس کے رِنگ ماسٹر کے روپ میں ابھرتے ہیں اور اشیاء کے علاوہ قارئین بھی ان کے چابک کے پہلے ہی لمس پر اپنی نارمل شریفانہ زندگی کو ترک کر کے سٹولوں اور تپائیوں کی طرف لپکنے لگے ہیں۔ مزاح کی دنیا میں ایسی شعبدہ گری کوئی معمولی بات نہیں۔

مسعود مفتی کے افسانے

ڈاکٹر انور سدید

(لاہور)

اُردو افسانے میں مسعود مفتی کا ظہور نہ حادثہ تھا نہ اتفاق، بلکہ میری نظر میں یہ ایک سماجی ضرورت تھی۔ ہر دور میں جب اخلاق پر زوال آ جاتا ہے، دائم قدریں شکستہ ہو جاتی ہیں۔ انسانیت سر بگریبان نظر آنے لگتی ہے اور شخصیت کے ظاہر اور باطن الگ الگ دنیائیں تعمیر کرنے لگتے ہیں تو ایک سوچنے والے کا ظہور لابدی ہو جاتا ہے۔ یہ سوچنے والا فلسفی بھی ہو سکتا ہے اور نکتہ در بھی۔ شاعر بھی ہو سکتا ہے اور افسانہ نگار بھی اور اس کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے تفکر کے محدب شیشے سے معاشرے کے ان داغوں کو نمایاں کرتا جائے جنہیں ہماری کھلی ہوئی مصلحت کوش آنکھیں دیکھنے سے گریز کرتی ہیں اور اگر دیکھتی ہیں تو اتنی جرات پیدا نہیں ہونے دیتیں کہ ہم ان کی نشان دہی کر سکیں، اس مقصد کے لیے ہمیں ہمیشہ اس مفکر کا انتظار ہوتا ہے جو حقائق کی کڑوی گولی شکر میں لپیٹ کر ہمارے گلے سے اتارے اور ہمیں اطراف و جوانب میں پھیلی ہوئی آلائشوں کا احساس دلائے۔ اس لحاظ سے مسعود مفتی کے لیے افسانہ لکھنا محض ایک شغل نہیں بلکہ ایک مقصد بھی ہے اور اسی مقصد کے حصول کے لیے اس نے ''مرد ہو کر زچگی کا درد سہا ہے۔''

(''میرا مسئلہ'' از مسعود مفتی' ادب لطیف)

یہاں آپ یہ سوال ضرور کر سکتے ہیں کہ جب مسعود مفتی مفکر کا فریضہ ہی سرانجام دینا چاہتا ہے تو وہ اظہار کی سیدھی راہ کیوں اختیار نہیں کرتا۔ معاف کیجیے مسعود مفتی نے ابھی تک اپنی شخصیت کا کوئی پرت بھی خودنوشت سوانح عمری کی صورت میں بے نقاب نہیں کیا۔ اس لیے اس کے قاری کو ابھی یہ سہولت حاصل نہیں ہوئی کہ تخلیقی عمل کے محرکات کی تلاش کے لیے اس کی زندگی کے عناصر سے معاونت حاصل کر سکے۔ اس لیے اس سوال کے جواب کے لیے اس کے افسانوں کی طرف ہی رجوع کرنا پڑتا ہے۔ مسعود مفتی کے افسانوں میں مثبت اور منفی قوتوں کا واضح تصادم قدم قدم پر ملتا ہے۔ انسان کی شخصیت ریزہ ریزہ ہو کر ہزار ٹکڑوں میں بٹ گئی ہے نہیں۔ پھر بدی کی قوتیں اس قدر غالب ہیں کہ وہ نیکی کو سطح پر آنے ہی نہیں دیتیں اور جب بھی خیر کے غالب آنے کا ''خدشہ'' لاحق ہوتا ہے، شر کی جملہ قوتیں مجتمع ہو کر اس کی کامیابی کے تمام راستے مسدود کر دیتی ہے۔ انسان کے اس ''دوغلہ پن'' نے سارے معاشرے کو متاثر کیا ہے۔ چنانچہ ہر وہ چیز جس کا ظاہر نظر سے فریب اور جس کی اصلیت آنکھوں سے اوجھل ہے اور جس پر رائے عامہ کا دبیز غلاف چڑھا ہوا ہے وہ بڑی آسانی سے قبول کر لی جاتی ہے۔ اس قعرِ دریا میں مسعود

تہہ کے نیچے چھپی ہوئی اصلیت کو دیکھنا ممکن

مفتی نے مقاومت کمترین (Least Resistance) کی راہ اختیار کی ہے اور وہ تمام باتیں جو کڑوی کسیلی ہیں ایک ایسے لباس میں پیش کر دی ہیں کہ کوئی بھی محتسب انہیں گردن زدنی قرار دینے کی جرات نہیں کر سکتا۔ مسعود مفتی ہی کا قول ہے ''کہ ہمارے معاشرے میں طوائف کی بستی کو ناجائز اور برقعہ پوش طوائف کے گشت کو جائز سمجھا جاتا ہے''۔ (''میرا مسئلہ'' از مسعود مفتی، ادب لطیف) ظاہر ہے کہ جب تمام منفی قوتیں مثبت ٹھہر جائیں تو تقریر و احتساب کے پیمانے بھی بدل جاتے ہیں اور مفکر بھی کسی ایسے پردے کو تلاش کرتا ہے جس کی اوٹ میں رہ کر وہ ''بے راہروی'' کے الزام سے بچ سکے، بارشِ سنگ سے بھی اور اپنی بات بھی برملا کہہ جائے۔ سالوں پہلے خدائے سخن میر تقی میر نے بھی گھٹن کے ایسے ہی ماحول میں دم کشی کی کیفیت محسوس کی تھی اور ریختہ کو سخن کا پردہ بنایا تھا۔ موجودہ دور میں مسعود مفتی نے کہانی کو اظہار کا ذریعہ بنایا ہے اور سخن کا یہی پردہ اب اس کا فن ٹھہرا ہے۔

مسعود مفتی کے افسانوں میں اس کے رجحانات کے بہت سے گوشے منور ہوتے ہیں لیکن ایک غالب رجحان جو اس کے ہاں قدرِ اوّل کی حیثیت رکھتا ہے کردار نگاری کا ہے۔ اس دور میں جب معاشرہ انتشار سے دوچار ہو، قدروں کی شکست و ریخت ہو رہی ہو اور تاریکی میں روشنی کی ایک کرن بھی دکھائی نہ دیتی ہو تو ایسے کردار جو زمانے کی مروجہ روش سے ذرّہ بھر امتیازی حیثیت رکھتے ہوں فوراً مرکزِ توجہ بن جاتے ہیں۔ تقسیم کے فوراً بعد مادیت کا فروغ، ملازمتوں کا حصول، مال و زر کا استحصال، الاٹمنٹوں کی دوڑ دھوپ، سیاسی لوٹ کھسوٹ، ایک ہی رات میں امیر بن جانے کی خواہش نے ایک ایسے معاشرے کو جنم دیا جس میں فرد کی شخصیت ہر قدم پر مجروح ہوئی۔ اس دور کے بیشتر افسانہ نگاروں کے ہاں غالب رجحان اسی گمشدہ فرد کی دریافت کرنا ہے۔ ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے مسعود مفتی کا ظہور ۱۹۵۸ء میں ہوا اور اس وقت تک سماجی برائیوں نے پھیل کر سارے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ شاید اسی لیے مسعود مفتی فرد کی دریافتِ نو کی بجائے گمشدہ معاشرے کی تلاش میں زیادہ دلچسپی رکھتا ہے اور معاشرہ چونکہ افراد کے ایک وسیع کُل کا عنوان ہے، اس لیے وہ معاشرے کی اس دریافت میں فرد کے مطالعے کو اساسی حیثیت دیتا ہے۔ چنانچہ اس کا ایک کردار فرد اور معاشرہ کے مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے یوں کہتا ہے: ''زندگی سے ٹریجڈی اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتی جب تک سوسائٹی کے تقاضے فرد کی ذات کے تقاضوں پر مقدّم سمجھے جائیں گے''۔ اس زاویے سے دیکھئے تو مسعود مفتی کی کردار نگاری اس غالب رجحان کا حصہ نہیں جو تقسیم کے بعد اردو افسانے میں شروع ہوا بلکہ اجتماعیت کے اس متروک رجحان کا حصہ ہے۔ جس کی صرف چند جھلکیاں تقسیم سے پہلے پریم چند، غلام عباس اور کرشن چندر کے ہاں ملتی ہیں۔

مسعود مفتی کی انفرادیت یہ ہے کہ اس نے معاشرے کے داغ نمایاں کرنے کے لیے محض یک رُخی کرداروں کا انتخاب نہیں کیا بلکہ اپنے نقطۂ نظر

کو واضح کرنے کے لیے ایک ہی افسانے میں متعدد مثبت اور منفی کردار پیش کیے ہیں۔ پھر وہ کہانی کا منطقی نتیجہ قاری پر ٹھونستا نہیں بلکہ اس کے اندر چھپے ہوئے روشن ضمیر انسان کے ذوقِ تجسس کو ابھارتا ہے اور اسے بدی کے خلاف صف آراء ہونے پر مائل کرتا ہے۔ یہ تما کردار ایک خاص اخلاقی تحریک کا اہم ترین حصہ تو ضرور ہیں لیکن فرد کو ایک بدیہی انجام سے آگاہ ہوئے بغیر اس تحریک کا معاون بننے کی جبری تلقین نہیں کرتے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان کرداروں کے ابھار میں مسعود مفتی کے تخلیقی جوہر کی بہ نسبت ان واقعات و حادثات نے زیادہ حصہ لیا جن سے یہ کردار عملی زندگی میں متصادم ہوتے ہیں اور بالآخر ایک مخصوص انجام کو پہنچتے ہیں۔ اردو کے بیشتر افسانہ نگاروں کے کردار تخیلی مرقعے تو بن جاتے ہیں لیکن ان میں حقیقی زندگی کا تحرک نظر نہیں آتا۔ مسعود مفتی کے کردار حقیقی زندگی سے آشنا ہی نہیں بلکہ یہ اس ماحول کے بڑے عمدہ عکاس ہیں جس میں مسعود مفتی اور اس کے زمانے کے دس کروڑوں لوگ سانس لے رہے ہیں۔ ''محدب شیشہ'' کا ماسٹر برکت علی جو اپنی آخرت سنوارنے کے لیے ایک بیوہ کے آنسو پونچھنے لگتا ہے اور خود مجسم آنسو بن جاتا ہے۔ گورکن کا اللہ بخش جس کے لیے ہر میت زندگی کی نوید لے کر آتی ہے لیکن جس کا اپنا لڑکا مر جاتا ہے تو انسانی زندگی کی قدر و قیمت آشکار ہو جاتی ہے اور جو پدری شفقت سے مغلوب ہو کر قبر کھودنے سے ہی انکار کر دیتا ہے۔ ''لمحہ'' کا جانی جس کا بڑھا پا ٹھنڈے ہونٹوں کے صرف ایک گرم پیار کے لیے سسک سسک کر بیت رہا ہے۔ ''لاعلم'' کا وکیل جو اپنی چرب زبانی سے ڈنڈے مار کر مولو حلوائی کو ملاوٹ کے جرم سے بری کرا تا ہے لیکن جس کا اپنا لڑکا اسی حلوائی کی مٹھائی کھا کر ہیضے کا شکار ہو جاتا ہے سب ایسے کردار ہیں جو ہمارے لیے قطعاً اجنبی نہیں۔ یہ ہمارے معاشرے کا اہم ترین حصہ ہیں۔ ہم ان سے روز ملاقات کرتے ہیں اور انہیں زندگی کے المیوں کا شکار ہوتے دیکھتے ہیں۔ مسعود مفتی کی خوبی یہ ہے کہ اس نے اپنے افسانے کے کردار، قاری اور فن کار، تینوں میں اجنبیت کی کوئی خلیج حائل نہیں ہونے دی اور بنیادی طور پر اس سچائی کو ابھارا ہے جو کردار سے الگ نہیں کی جا سکتی اور جو کبھی نہیں ہوتی۔ ایک اور بات یہ ہے کہ مسعود مفتی کے کردار زمین کے واسطے سے جذبے اور جبلت کے تقاضوں سے پوری طرح مغلوب ہیں اور نسل، رسوم اور رواجات سے گہری وابستگی رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ان کے ہاں دائمی اقدار اور بلند اخلاقی معیار کی بھی ایک خاص قدر و قیمت ہے اور اس کے تحفظ کے لیے وہ ہر ممکن قربانی سے گریز نہیں کرتے۔ ''محدب شیشہ'' کا ماسٹر برکت علی جو بیوہ کی مدد کرتے کرتے موت کے گھاٹ اتر جاتا ہے اور ''نام'' کی گمنام لڑکی جو ''اخلاق'' کا تحفظ کرتے کرتے کنواری رہ جاتی ہے اور بالآخر پاگل ہو جاتی ہے۔ اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ آسمانی اور زمینی عناصر کے اس امتزاج نے درحقیقت اُس کردار کے نقوش روشن کیے ہیں جو ہمارے معاشرے کا صحیح نمائندہ ہے۔

افسانے کی تخلیق میں پلاٹ کو بہت نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ پلاٹ وہ خارجی ڈھانچہ ہے جس میں افسانہ نگار اپنے تاثر کو ڈھالنا چاہتا ہے۔ افسانہ نگار کا تاثر حقیقت کا ادراک بھی ہے اور اس کے فکری اور جذباتی رابطوں کا امین بھی۔ جب تک یہ دونوں ایک دوسرے میں پیوست نہ ہوں، اچھا افسانہ معرضِ وجود میں نہیں آ سکتا۔ پھر فن کا تقاضا بھی یہ ہی ہے کہ جس حقیقت کو افسانہ نگار پیش کرنا چاہتا ہے وہ درآمدی نظر نہ آئے بلکہ کرداروں کے عمل اور ردِعمل سے ظہور میں آئے۔ موجودہ دور کے افسانے میں کردار کو نمایاں کرنے اور فضا کو گرفت میں لینے کے ساتھ ساتھ تجریدنگاری کے گونا گوں تجربات بھی کیے جا رہے ہیں اور پلاٹ کی طرف توجہ نسبتاً کم ہوتی جا رہی ہے۔ اب ایسے افسانے بھی لکھے جا رہے ہیں جن میں پلاٹ بالکل نہیں ہوتا۔ وحدتِ زمان و مکاں نہیں ہوتی۔ متوازن طوالت نہیں ہوتی۔ مقام عروج کی طرف تدریجی ارتقا نہیں ہوتا۔ الگ الگ اکائیوں کا مرکزی تاثر سے الحاق بھی ضروری نہیں رہا۔ اس سے اردو افسانے میں وسعت اور تنوع تو ضرور آ گیا ہے۔ لیکن کہانی کہنے کا بنیادی مقصد مجروح ہوا ہے مسعود مفتی کے افسانوں کا ایک امتیازی وصف یہ بھی ہے کہ اس نے اس مقصد کو فوت نہیں ہونے دیا۔ افسانے میں پلاٹ یعنی صورت واقعہ کو پوری اہمیت دی ہے اور اسے پوری طرح ابھارنے کے لیے تجزیہ و تحلیل کا طریق اختیار کیا ہے۔ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ نظر آتا ہے کہ مسعود مفتی اپنے قاری کو جس نقطۂ نظر سے متفق کرنا چاہتا ہے اس کے لیے زینہ بزینہ راہ ہموار ہوتی جاتی ہے اور انجام کار جب قاری کو زندگی کی ایک بیّن حقیقت سے دوچار ہونا پڑتا ہے تو ذہنی طور پر انتشار کا شکار ہوئے بغیر اس پر مثبت زاویے سے سوچنے اور اپنی قوت متخیلہ کو کام میں لانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کہانی کی بیرونی ہیئت اور فن کار کے داخلی تناؤ میں مسعود مفتی نے بڑی شدت سے آہنگ پیدا کیا ہے اور جذباتیت کو نقطۂ نظر کی مقصدیت پر غالب نہیں آنے دیا۔ مسعود مفتی کے افسانے ''دعا''، ''مثبت منفی''، ''نئے پیمانے'' اور ''گناہگار'' اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ ان افسانوں کو پیش نظر رکھیے۔ نقطۂ نظر کی فوقیت تو نظر آتی ہی ہے لیکن اس نقطہ نظر کے اظہار کے لیے جو خارجی پیکر اختیار کیا گیا ہے اس میں افسانے کی صورت واقعہ کو اس کے ارتقا کو اور اس کی داخلی منطق کو بھی پوری اہمیت حاصل ہے۔ افسانہ قاری کو اپنی گرفت میں رکھتا ہے اور اسے زندگی کی تہہ در تہہ پیچیدگیوں اور اس کے نشیب و فراز سے آگاہ بھی کرتا ہے اس طرح کہ افسانہ نگار اس پر براہ راست اثر انداز نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر مسعود مفتی کا مشہور افسانہ ''کردار'' لیجیے۔ اس میں ایک ایسے شخص کی ذہنی تبدیلی کو موضوع خیال بنایا گیا ہے جو فطری طور پر نیک ہے لیکن جو اپنی تمام تر نیکی کے باوجود بدی کی قوتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور بالآخر گناہ کے اس دھارے میں بہہ جاتا ہے جس کی ترغیب اسے ہر قدم پر ملتی ہے۔ اوّل الذکر قدر کا نمائندہ اسلم ہے۔ جس کا تقرر ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر ہوتا ہے۔ یہیں بدی کی قوت کا نمائندہ اللہ دتہ کانٹے والا بھی موجود ہے جو گاڑیاں شنٹ بھی کرواتا ہے اور صاحب لوگوں کی خدمت کے

لیے مال گاڑیوں سے پھل اور دوسری چیزیں چرا کر بھی بیچتا ہے۔اسلم جب اللہ دتہ کی بتائی ہوئی راہ پر چلنے سے انکار کر دیتا ہے تو بدی کی یہ قوت پہلے اس کے خلاف غلط افواہیں پھیلاتی ہے پھر اسے رشوت کے ایک مقدمے میں الجھا دیتی ہے۔شبہات یہاں تک بڑھتے ہیں کہ اسلم کی بیوی ہی اس سے بدظن ہو جاتی ہے اور آخر کار وہ قدم جو کبھی بدراہ نہیں ہوا تھا، صراطِ مستقیم سے ہٹ جاتا ہے اور استقبال کے لیے سب سے پہلے کانٹے والے کی بیوی آتی ہے جو اس سے پہلے اس اسٹیشن پر آنے والے ہر افسر کو دولتِ شب خوابی سے سرفراز کر چکی ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار جن ذہنی الجھنوں میں مبتلا ہے، وہ سب حالات کی پیدا کردہ ہیں۔زندگی کے حادثے اور واقعے، شخصی مفاد اور ذاتی تعصّبات ایک گھمبیر تاثر کو ترتیب دینے میں مدد دیتے ہیں۔اس طرح کے افسانہ نگار سرچ لائٹ کے بٹن اپنے انگوٹھے تلے دبائے دور فاصلے پر کھڑا نظر آتا ہے اور کہانی ذہن پر ایک انمٹ اور دیرپا نقش قائم کرتی جاتی ہے۔

طبقاتی لحاظ سے مسعود مفتی نے ہمارے معاشرے کے نچلے اور متوسط طبقے کی زندگی کے متعلق کہانیاں لکھی ہیں اس سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ وہ ان دونوں طبقوں کی زندگی کے کسی خاص پہلو سے متاثر ہے یا اس نے ان کی زندگی کے بعض چھپے ہوئے گوشوں کی پہلی مرتبہ نقاب کشائی کی ہے۔اس کے افسانے ان طبقوں کی خارجی زندگی یا داخلی احساس کی بھرپور تصویریں بھی نہیں۔مسعود مفتی چونکہ ایک مفکر ہے اور فرد کو ایک بہتر معاشرے کی تعمیر میں حصہ لینے پر آمادہ کرتا ہے اس لیے اس نے اپنے فکری موضوع کے اظہار کے لیے بھی صرف اس طبقے کو چنا ہے جو معاشرے کی تعمیرِ نو میں بھی سب سے بڑا معاون ثابت ہو سکتا ہے۔یہ طبقہ ابدالآباد سے علم کی روشنی سے محروم ہے۔تجزیہ و تحلیل کی اہلیت سے عاری ہے۔رسوم پرستی نے اس کے ذہن کو سنگلاخ جمود سے آشنا کیا ہے۔اس کی نظر مذہب کی کشادگی کو دیکھنے سے عاری ہے لیکن مذہب کے نام پر جو فسادات برپا کیے جاتے ہیں وہ ان کی ماہیت سمجھنے کی قوت بھی نہیں رکھتا۔یہی وجہ ہے کہ خدا کے مقدس نام پر جب بھی قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوتا ہے تو یہی طبقہ سب سے زیادہ کشت و خون کا شکار ہوتا ہے۔مسعود مفتی کا یہ فکری پہلو یوں تو کئی افسانوں پر بڑی عمدگی سے اجاگر ہوتا ہے لیکن اس کی سب سے ہولناک تصویر کشی ''یا خدا'' میں ہوئی ہے۔اس افسانے میں وقت کی اکائی لامحدود ہے۔قصّہ گو غار کے ایک دہانے پر پڑا ہے اور اس کے سامنے تاریخ انسانی کے ہزاروں ورق بکھرے پڑے ہیں۔ہر ورق مسافر کے سامنے ایک نئی خونریزی کی داستان پیش کر رہا ہے۔یہ خوں ریزی مختلف وقتوں میں مختلف ملکوں میں عمل میں آئی ہے لیکن وہ جذبہ جو اس کا باعث بنتا ہے انسان کا اجتماعی عقیدہ ہے جس سے وہ سرِ مو انحراف نہیں کرتا اور جس کے تحفظ کے لیے وہ اپنی جان کی بازی تک لگا دیتا ہے۔آرتھر کوئسلر نے کہا ہے کہ تاریخ میں جتنی لڑائیاں اجتماعی طور پر سیاسی اور مذہبی عقیدے کے تحفظ کے لیے لڑی گئی ہیں ان کی تعداد تحفظِ ذات کی لڑائیوں سے بدرجہا زیادہ ہے۔''یا خدا'' میں یہی مرکزی خیال مسعود مفتی نے تاریخی حوالوں سے پیش کیا ہے۔ہر خوں ریزی کے بعد سوچ کا صرف ایک زاویہ ابھرتا ہے اور وہ اس گمشدہ خدا کی تلاش کرتا ہے جس کی عظمت کو زندہ رکھنے کے لیے دنیا کے تمام مذاہب ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں۔بالآخر افسانے کا راوی جب ماضی کے ورق الٹ چکتا ہے تو وہ بے اختیار چلاتا ہے۔

''یا خدا تو کون ہے۔تو کدھر ہے۔تو کیوں نہیں ایک دفعہ اپنا اصل روپ ظاہر کر دے تا کہ یہ سب جھگڑے رُک جائیں یا خدا۔یا خدا''۔

مسعود مفتی کے تین اہم افسانے ''محدب شیشہ''، ''کردار''، ''عورت'' کو پیشِ نظر رکھیے تو احساس ہوتا ہے کہ اس کا اساسی موضوع شاید صرف منفی قوتوں کے مقابلے میں مثبت قدروں کی پسپائی ہے۔یہ بات کسی حد تک درست ہے کہ بنیادی طور پر اس کا نقطۂ نظر اقدار کا احیا ہی ہے لیکن اس ایک نقطے کا پورا انعکاس کرنے کے لیے اسے اتنے زاویوں کو دائرہ نور میں لانے کی ضرورت پڑتی ہے کہ زندگی کا کوئی پہلو بھی نظروں سے اوجھل نہیں رہتا۔پھر اس کے افسانوں کا تاثر بھی زاویے تک محدود نہیں بلکہ یہ اکثر کثیر الاضلاع ہوتا ہے۔ زندگی کی زہرناکی سامنے آتی ہے تو اس کی لطافت کی لہر نسبتاً مدھم ہے اور بیشتر صورتوں میں عام قاری اسے احساس کی سطح پر بھی قبول کرنے سے تامل کرتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہر بڑے فنکار کی طرح مسعود مفتی کے فن کے بھی کئی پرت ہیں اور اس کی سب سے نچلی پرت کا گیان حاصل کرنے کے لیے بڑے طویل ریاض کی ضرورت ہے۔مثال کے طور پر اس کی کہانی ''لمحہ'' لیجیے۔یہ محبت کی کہانی ہے۔لیکن اس میں انسانی مزاج کی دھوپ چھاؤں، اس کے لطیف اور کثیف جذبات کی بڑی دلدوز عکاسی کی گئی ہے۔افسانے کا چڑچڑا بوڑھا جانؔ جس کی جوانی عیسائیت کے شکنجے میں گزری اور جو اپنی محبوبہ سے اس لیے شادی نہ کر سکا کہ وہ مذہب کی قیود کو قبول نہیں کرتا۔اب عیسائیت سے تائب ہو چکا ہے اور جوانی کی محبت کو سینے سے لگائے محض اس لیے مصوری سیکھ رہا ہے کہ اپنی محبوبہ کی وہ تصویر مکمل کر سکے جو اس نے اپنی آنکھوں میں اس سے جدا ہوتے وقت سمو لی تھی۔جانؔ تصویر بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن ایلنؔ کے ہاں تصویر پیش کرنے کے لیے آتا ہے تو وہ بصارت سے محروم ہو چکی ہوتی ہے۔زندگی کا المیہ ایک موڑ پر آ کر ایک بار پھر اسے محرومی سے ہم کنار کر دیتا ہے اور بوڑھا جانؔ بالکونی سے کود کر جان دے دیتا ہے۔تاثر کی سرمستی دیکھئے کہ مصنف نے اس ایک افسانے میں ہی محبت، عقیدہ اور زندگی تینوں کی ناکامیاں پوری شدت سے نمایاں کر دی ہیں۔''لا علم'' میں خوراک میں ملاوٹ اور ''گورگن'' میں انسانی احتیاج کی نچلی سطح کو افسانے کا موضوع بنایا گیا ہے لیکن یہ دونوں کہانیاں پدری شفقت کا اظہار بھی اسی گہرائی سے کرتی ہیں۔''نام'' کالج کے دل پھینک نوجوانوں کی لا ابالی محبت کی کہانی ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ یہ کہانی اخلاق کو محفوظ رکھنے اور سوسائٹی میں اپنا احترام برقرار رکھنے کے جذبے سے متعلق ہے۔

مسعود مفتی کے افسانوں پر سنجیدگی کی ایک دبیز دتہہ چڑھی ہوتی ہے۔ایک ایسے مصنف کے بارے میں جس کے اظہار کی اوّلیں صنف مزاح ہو یہ بات بڑی انوکھی معلوم ہوتی ہے مجھے بھی اس کے افسانوں کی یہ غالب سنجیدگی پہلی دفعہ بڑی عجیب لگی تھی لیکن جوں جوں اس کے افسانوں کی زیریں سطح پر دوڑنے والی فکری رَو سے واقفیت ہوتی گئی، مجھے احساس ہوتا گیا کہ یہ سنجیدگی اسلوب کی نہیں بلکہ موضوع کی ہے۔میرا ایقان ہے کہ افسانوں میں مسعود مفتی جو نقطہ نظر پیش کرنا چاہتا ہے ثقاہت کا ایک اعلیٰ معیار کو بڑی خوبی سے برقرار رکھا ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ کہانی میں پیش کی جانے والی زندگی کی عمیق گہرائیاں، مشاہدے کا پھیلاؤ، ماحول کا عمدہ شعور، گہرا تفکر، معاشرے کا پختہ مطالعہ، انسان اور کائنات کا ربط باہم اور تنگ نظری کی شکست قاری کی توجہ سب سے پہلے کھینچتے ہیں اور دوسری سب سے چیزیں ثانوی درجہ اختیار کر جاتی ہیں۔اس سب کے باوصف اس سنجیدہ افسانوں میں مزاح نگار مسعود مفتی نے اپنی فطری شگفتگی کے نادر نمونے بھی پیش کیے ہیں اور جہاں بھی تشبیہہ اور استعارے کا سہارا لیا ہے وہاں تخلیقی رعنائی کا بڑا اعلیٰ معیار قائم کیا ہے۔امتثال امر کے لیے چند نمونے ملاحظہ ہوں:

''اس قصبے میں سرکار کی تعلیمی سرگرمیاں چار جماعتوں کے بعد ختم ہو جاتی تھیں اور چیچک زدہ چہرے کی طرح اُپلا تھپا پرائمری سکول اپنی بوسیدہ چھتوں کے نیچے دن بھر پہاڑوں کے الاپ براڈ کاسٹ کیا کرتا''۔

''محدب شیشہ''

''نیچے پہاڑی کی ڈھلان پر رنگ برنگے چوکور ٹکوں نے کھیت کسی فقیر کی رضائی کا نقشہ بنا رہے تھے''۔

''اب بابے گامو کی پگڑی کا شملہ بارش میں بھگتی ہوئی جھنڈی کی مانند ہو جائے گا''

''ہیر کا مقبرہ''

''اری مردار تیری عمر ہے۔اب رسّی کودنے کی۔جا رکھ دے اُدھر لکڑیوں والی کوٹھری میں اور خبردار جواب بھنتے چنے کی طرح اچھلی''۔

''وقار''

اور اب مزاح کے چند شگوفے:

''وکیل صاحب نے اس کی رپورٹ ایسی راز داری سے سنی جیسے ایک ہمسائی دوسری ہمسائی سے تیسری ہمسائی کی بات کرتی ہے۔اور رپورٹ سن کر ایسے مایوس ہوتی ہے جیسے دوسری ہمسائی کو اس بات کا پہلے ہی علم ہو۔ (''لاعلم'')

''سرکاری وکیل نے مسل کے ورق بے دلی سے الٹے سیدھے کیے اور مشین کی طرح ایسی یکساں آواز میں بحث کرنے لگا جیسی یکساں تنخواہ اسے ہر ماہ ملتی تھی''۔(''لاعلم'')

''ریلوے کی ڈائننگ کار بھی تجرباتی دور میں ہے جہاں تحقیق کی جا رہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ دام میں خراب سے خراب کھانا مسافروں کی طبیعت پر کیا اثر ڈالے گا۔اس لیے ایک کوفتے میں سے کالی مرچ کی بجائے ایک مکھی محوِ خواب برآمد ہوئی تو ان صاحب کے چیخنے کے باوجود بیرے اور منیجر نے پراسرار خاموشی سادھے رکھی۔'' (اداکار'')

مسعود مفتی نے اپنے افسانوں میں بیانیہ تکنیک سے سب سے زیادہ کام لیا ہے۔اس تکنیک کی اوّلین صورت وہ ہے جس میں روشنی اور آگہی کا منبع تو افسانہ نگار ہی ہوتا ہے لیکن وہ خود زیادہ تر پس منظر میں رہ کر صرف راوی کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔بظاہر یہ آسان ترین تکنیک ہے لیکن جہاں فن کار کی بصیرت کمزور اور تجزیے کی قوت مدھم ہو یہ تکنیک اس کے لیے بڑی مشکل بھی پیش کر دیتی ہے۔مسعود مفتی چونکہ معاشرے کا ادراک فرد کے واسطے سے کرتا ہے اس لیے اس کے ہاں خود آگہی اور خود شناسی کا جوہر بڑی وافر مقدار میں موجود ہے پھر اس نے ماحول کو فراز سے نہیں بلکہ خود انبوہ میں شامل ہو کر دیکھا ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب وہ کہانی کہنے کا فریضہ اپنے سر لیتا ہے تو بیانیہ کہیں بھی سپاٹ یا منجمد نہیں ہوتا۔ایک اور بات یہ ہے کہ نظریاتی افسانہ نگار جب بھی اپنے نظریئے کو جبری طور پر افسانے میں ٹھونسنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے ہاں ایک مخصوص غیر فطری فضا ضرور پیدا ہو جاتی ہے جس پر قابو پانے کے لیے وہ اکثر نعرہ زنی کا شکار ہو جاتا ہے۔مسعود مفتی کے ہاں زندگی کا بھرپور ادراک اور ماحول کا گہرا مشاہدہ واقعات کے تاروپود میں اس طرح گھلا ملا ہوا ہے کہ افسانے کا بہاؤ ایک متوازن رفتار سے بہتی ہوئی ندی کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے اور نعرہ زنی کی کیفیت پیدا ہی نہیں ہوتی۔ اس کے دل گرفتہ بیانیہ کے ساتھ ساتھ مشاہدے کے عمق کی صرف ایک مثال ملاحظہ ہو۔منظر ایک قصبے کی مسجد کا ہے۔جہاں مولوی صاحب جمعہ کا وعظ فرما رہے ہیں:

''سامنے نمازیوں کی قطاریں خاموشی میں غرق تھیں۔کچھ دیوار یا کھمبے کے سہارے اونگھتے ہوئے کچھ پنکھے کی ڈنڈی یا کھڑے گھٹنے پر نیند بھرا سر ٹکائے ہوئے کچھ آنکھوں سے سوئے ہوئے۔حافظ عمر دراز کی آنکھیں بند تھیں۔دماغ سویا ہوا تھا ہونٹ باہم چپکے ہوئے تھے لیکن ہاتھ جاگ رہے تھے جو بڑی تیزی سے تسبیح کے دانے پھیر رہے تھے۔مکمل جاگنے والوں میں بشیر سبزی فروش کے دماغ میں منڈی کے بھاؤ کھُد بُد مچا رہے تھے۔ڈاک خانے کے بابو کے ذہن میں تنخواہ اور اخراجات باہم کشتی لڑ رہے تھے اور لاریوں کے اڈے والے منشی کے دماغ میں صبح آٹھ بجے کی لاری میں گزرنے والی عورت کا خوبصورت چہرہ گھوم رہا تھا۔''

اس تکنیک میں ''لاعلم'' بھیڑیئے، ''مثبت منفی''، ''راضی نامہ'' اور ''کردار'' بڑی عمدہ کہانیاں ہیں۔

بیانیہ تکنیک کی دوسری صورت واحد متکلم کی ہے جس میں کہانی

صرف اپنی ذات کے حوالے سے بیان ہوتی ہے۔افسانہ نگار پر انکشافِ حقیقت کی دوسری تمام راہیں چونکہ بند ہوتی ہیں،اس لیے یہ تکنیک کسی دوسرے شخص کی کہانی بیان کرنے میں زیادہ معاونت نہیں کرتی اور اکثر افسانہ نگار کو بڑی شدت سے پٹخنیاں کھانی پڑتی ہیں۔’’دعا‘‘میں مسعود مفتی نے یہ تجربہ بڑی کامیابی سے کیا ہے۔افسانے کا مرکزی کردار گرجے کی ایک راہبہ ہے جو داخلی سطح پر ایک بڑے خلفشار سے دوچار ہے۔افسانے کا ’’میں‘‘ شہر کا ایک معمولی جنرل مرچنٹ ہے جس کا اس خلفشار سے دُور کا واسطہ بھی نہیں اور شاید اس کی ماہیت سمجھنے سے بھی قاصر ہے۔اس کے باوجود یہ دونوں کردار افسانے میں اس طرح باہم مربوط ہیں کہ الگ نہیں ہو سکتے۔جنرل مرچنٹ وہ روزن ہے جس سے راہبہ کے کردار کے تمام چھپے ہوئے گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔راہبہ ایک کم گو کردار ہے لیکن اس کی حرکات وسکنات پوری طرح گویا ہیں اور اس کے باطن میں چھڑی ہوئی جنگ کا پورا تاثر قاری کو منتقل کر دیتی ہیں۔

مسعود مفتی کے ہاں وقت کی اکائی کوئی زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے کچھ افسانوں میں آ نندی کی دائرہ نما تکنیک کو پوری فنی رعنائی سے استعمال کیا ہے۔اس تکنیک میں وقت کسی ایک مقام پر نہیں رکتا۔بلکہ دائرے کی طرح گردش کرتا رہتا ہے اور کہانی جس نقطے پر ختم ہوتی ہے اس نقطے سے دوبارہ شروع ہو جاتی ہے۔محدب شیشہ میں کہانی مولوی صاحب کے وعظ سے شروع ہوتی ہے اور اسکول ماسٹر برکت علی گردن اٹھائے وعظ کا ایک ایک حرف غور سے سن رہا ہے۔

’’یتیم مسکین اور بیوائیں،عرش کا سہارا ہیں۔ان کے آنسو پونچھو۔ ان کے سر پر ہاتھ دھرو۔‘‘

افسانے کے اختتام پر ماسٹر برکت علی ایک بیوہ کا سہارا بنتے بنتے قبر کی آغوش میں جا چکا ہے لیکن مولوی صاحب کا وعظ جاری ہے۔

’’دکھیا اور بے سہارا بیوہ کی آہ سات آسمانوں میں سوراخ کر دیتی ہے اگر دین اور دنیا کی عزت چاہتے ہو تو بیواؤں کی مدد کرو!‘‘

’’لاعلم‘‘ میں مولو حلوائی پر ملاوٹ کا مقدمہ چلتا ہے۔وکیل صاحب صفائی کا بڑا عمدہ کیس پیش کرتے ہیں اور اسے بری کرا دیتے ہیں لیکن جب ان کا اپنا لڑکا مولو حلوائی کی مٹھائی کھا کر ہیضے کا شکار ہو جاتا ہے تو حلوائی کے خلاف سب سے زیادہ احتجاج وہی کرتے ہیں۔

’’ارے لوگو!مولو حلوائی کی مٹھائی کھا کر میرے بچے کو ہیضہ ہو گیا ہے۔نہ معلوم حکومت ایسے بے ایمانوں کو سزا کیوں نہیں دیتی۔‘‘

وقت کی پرکار پھر اسی مرکز کے گرد اسی نصف قُطر پر گردش کر رہی ہے۔اب پھر کوئی اور وکیل مولو حلوائی کی صفائی دینے کے لیے عدالت میں آ جائے گا اور قانون اسی طرح شکست کھاتا رہے گا۔

’’ہیر کا مقبرہ‘‘ بھی وقت کی اسی لامحدود وسعت کی کہانی ہے۔اس افسانے میں ہیر جو رانجھے کی محبوبہ تھی،مر جاتی ہے لیکن اس کا سماج نہیں مرتا۔اسی لیے ہیر کی محبت جس دور میں بھی جنم لیتی ہے سماج اس کے خلاف اسی ردِعمل کا اظہار کرتا ہے۔

افسانہ لکھنے کی رفتار مسعود مفتی کے ہاں کچھ زیادہ تیز نہیں۔اس کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ صرف اس وقت لکھتا ہے جب اسے واقعی کچھ کہنا ہوتا ہے۔مسعود مفتی کا افسانہ معاشرے کے خلاف اس کی اپنی ذات کا ردِعمل ہے اور یہ ضروری نہیں کہ یہ ردِعمل ایک متعین عرصے میں ہی تکمیل پا جائے۔ردِعمل جب تک شخصیت کے پیکر میں گھل مل کر ابال پیدا نہیں کرتا،اس وقت تک کامیابی سے افسانے کا موضوع نہیں بنتا۔خوشی کی بات یہ ہے کہ مسعود مفتی نے فن کے اس اوّلین تقاضے کو پوری اہمیت دی ہے اور افسانہ لکھنے سے پہلے ابال کے اس لمحے کا شدت سے انتظار کیا ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ اس کے ہاں قدرِ اوّل کی تخلیقات کی تعداد زیادہ ہے۔اس نے نقاد اور قاری دونوں کو مایوس نہیں کیا۔

☆

مسعود مفتی کا شمار ہمارے ان ادیبوں میں ہوتا ہے جن کو وہ پذیرائی نہیں ملی جس کے وہ مستحق تھے اور ہیں۔آغاز میں انہوں نے طنز ومزاح بھی لکھا لیکن وہ بنیادی طور پر ایک بہت باکمال افسانہ نگار ہیں اور میں یہ بات بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ موجودہ عہد کے پانچ بہترین افسانہ نگاروں میں مسعود مفتی کو بلا جھجک شامل کیا جا سکتا ہے۔

سانحہ مشرقی پاکستان،ہماری قومی تاریخ کا بہت بڑا المیہ ہے۔مسعود مفتی اس کے چشم دید گواہ رہے ہیں۔انہوں نے جس طرح اس سارے المیے کے اندر رہتے ہوئے اس کا بیک وقت موضوعی اور معروضی مشاہدہ کیا اور اس کی تفصیلات کو تحریر میں لائے وہ ان کا بہت بڑا کمال ہے۔مسعود مفتی نے ان تمام الجھے ہوئے معاملات کو جو اس سانحہ کا باعث بنے،بڑی گہری نظر سے دیکھا اور سمجھا ہے۔انہوں نے نہ صرف ان حالات وواقعات کا مشاہدہ کیا بلکہ وہ اس آشوب سے گزرے بھی ہیں۔سقوطِ ڈھاکہ ہماری تاریخ کا وہ الم ناک باب ہے جو نہ صرف ہماری نسل بلکہ آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے بھی ایک مبہم تصویر کی طرح ہے جسے لوگ مزید الجھاتے چلے جا رہے ہیں۔مسعود مفتی ان منتخب اہلِ نظر اور صاحبانِ قلم میں سے ہیں جنہوں نے ان دھندلے شیشوں کو اجالنے کی بھرپور اور کامیاب کوشش کی ہے۔

امجد اسلام امجد (لاہور)

مسعود مفتی کا شہرِ افسوس

پروفیسر فتح محمد ملک

(اسلام آباد)

انتظار حسین نے سقوطِ ڈھاکہ کے موضوع پر جو چند ایک کہانیاں لکھی ہیں۔ ''شہرِ افسوس'' ان میں سے ایک ہے۔ انتہائی فنکارانہ حسن اور بے پناہ شدتِ تاثر کی حامل اس کہانی کے تینوں کردار اس بستی میں اپنوں کے ظلم میں صبح کرتے ہیں جسے انہوں نے ایک مدّت پہلے دارالامان جانا تھا۔ یہ دارالامان جب ''شہرِ افسوس'' کے پہلے، دوسرے اور تیسرے آدمی کو شہرِ خرابی کا رُوپ دھارتا نظر آتا ہے تو ان میں سے ایک خود سے یوں مخاطب ہوتا ہے:

''۔۔۔تو ان لوگوں کو ان کے حال پہ چھوڑ اور یہاں سے نکل چل کہ تجھے زندہ رہنا ہے۔ سو میں نے اس قبیلہ کی طرف سے منہ پھیرا اور اپنی جان بچا کر بھاگا مگر میں ایک عجیب میدان میں جا نکلا جہاں خلقت امڈی پڑی تھی اور فتح کا نقارہ بجتا تھا۔ میں نے پوچھا کہ لوگو یہ کونسی گھڑی ہے اور یہ کیا مقام ہے۔ ایک شخص نے قریب آ کر کان میں کہا کہ زوال کی گھڑی ہے اور یہ مقامِ عبرت ہے۔''

اور اس شخص نے زہر بھری نگاہوں سے دیکھا اور کہا۔۔۔ تُو اسے نہیں پہچانتا؟

نہیں!

اے بدشکل آدمی یہ تُو ہے!

مَیں؟۔۔۔ میں سنّاٹے میں آ گیا۔

میں نے اسے غور سے دیکھا اور میری پُتلیاں پھیلتی چلی گئیں۔۔۔ یہ تو سچ مچ میں تھا۔۔۔

میں نے اپنے آپ کو پہچانا اور مرگیا۔۔۔''

چونکہ مسعود مفتی کا مسلک فنی حقیقت نگاری ہے۔ اس لئے سقوطِ ڈھاکہ کے موضوع پر ان کے افسانوں کے تازہ مجموعہ ''ریزے'' میں زوال کی لپیٹ میں آئی ہوئی اس بستی کا نام ڈھاکہ ہے۔ اس میدان کا نام پلٹن میدان ہے اور یہ منظر ہتھیار پھینکنے کا منظر ہے اور جس پہلے، دوسرے اور تیسرے آدمی کے منہ پر تھوکا گیا ہے وہ میں، آپ اور ہم سب ہیں۔ مسعود مفتی ہم سب کو یہ گھڑی یاد دلانے پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں اور گذشتہ پندرہ برس سے ہمیں اس مقامِ عبرت کی سیر کرانے میں مصروف ہیں۔ پہلے انہوں نے ہمیں اپنے رپورتاژ ''چہرے'' میں مشرقی پاکستان کی جانکنی کی داستان سنائی، سبز ہلالی پرچم کے چاند تاروں کے غروب ہونے اور اس کے بعد کی اتھاہ تاریکی کے منظر دکھاتے ہوئے اپنے دل کی بے چینی اور ذہن کے کرب کو اس نکتہ بصیرت میں سمیٹا کہ:

''برعظیم کی تاریخ میں یہ منظر بار بار دیکھنے میں آیا ہے جب بھی مرکز میں نااہل اور بددیانت لوگ آئے تو دُور کے علاقوں میں غداروں نے کمریں کس لیں۔ کسی بیرونی طاقت سے سازش کی اور سلطنت کی کمر میں چھرا گھونپا۔''

پھر انہوں نے قیامِ مشرقی پاکستان اور بعد ازاں بنگلہ دیش اور بھارت میں ایامِ اسیری کے واقعات، مشاہدات اور تاثرات پر مشتمل کتاب ''لمحے'' میں بتایا کہ:

''۱۹۷۱ء میں بھی میرِ کارواں نے وطن کو بچانے کی کوئی تدبیر نہ کی بہت کیا تو تساہل کو تدبیر کہہ ڈالا اور حماقتوں کو نوشتۂ تقدیر سمجھ لیا۔ رہبروں کی مسلسل خودستائی، رہروؤں کی مسلسل خودکشی سے قوم اور وطن ایسے مقام پر پہنچ گئے تھے جہاں تاریکی کے سوا کچھ نہ تھا۔''

یہ مسعود مفتی ہی کی نہیں اردو افسانے کی خوش بختی ہے کہ تہ در تہ تاریکی کی اس فضا میں انہوں نے قرآن حکیم سے روشنی لینے کے عمل کا آغاز کیا۔ سات مہینے دم توڑتے ہوئے مشرقی پاکستان میں ایک مہینہ امریکی، روسی اور بھارتی دائیوں کی گود میں کھیلتے ہوئے نوزائیدہ بنگلہ دیش میں اور دو سال جنگی قیدیوں کے بھارتی کیمپ بریلی میں ظلمت ونور کی اس مسلسل کشمکش نے مسعود مفتی کے فکر ونظر کی دنیا ہی بدل ڈالی۔ قومیت اور تہذیب کے وہ اُلجھے ہوئے مسائل جنہیں پاکستانی دانشوروں کے مقالات ومباحث مزید الجھاتے چلے آ رہے تھے آن کی آن میں یوں سلجھ گئے جیسے تاریک رات میں بجلی کوند جانے سے یک بہ یک فضا روشن ہوتی جاتی ہے:

''ہمارے دانشور اور ادیب کتابیں لکھ رہے ہیں اور آپس میں بحث کر رہے ہیں کہ پاکستانی کلچر کیا ہے اور پاکستانی قومیت کی تعریف کیا ہے؟ لیکن ہمارا ہر جنگی قیدی جو نہ دانشور ہے نہ عالم، پاکستانی قومیت اور کلچر کی تعریف خوب سمجھ چکا ہے۔ وہ جانتا ہے کیمپ کے گرد خاردار تاروں کے حصار نہیں تھے بلکہ پاکستانی قومیت کی حد بندی تھی۔ ان تاروں کے اندر اسیرانِ وفا پاکستانی کلچر کا سمبل تھے۔ وہاں کوئی فرق نہ تھا کہ کون پنجابی ہے، کون سندھی ہے، کون پٹھان اور کون بلوچ ہے۔ وہ سب اس وجہ سے وہاں تھے کہ وہ پاکستانی تھے۔ ہمارا جنگی قیدی مثبت انداز میں نہیں تو منفی انداز میں سمجھ چکا ہے کہ وہ ہر چیز جسے ہندو اس برعظیم سے مٹانا چاہتا ہے پاکستانی قومیت اور پاکستانی کلچر میں آتی ہے کیونکہ ہندو اس برعظیم کو کنشک اور ہرش کے زمانے کا اکھنڈ بھارت بنانا چاہتا ہے۔[۱] ''

یہاں یہ بات یاد دلانے کی ضرورت ہے کہ سقوطِ ڈھاکہ کے المیہ سے دوچار ہو کر بھارت کا جنگی قیدی بننے سے پہلے، مسعود مفتی بھی ہمارے اُن ادیبوں میں سے ایک تھے، جن پر پاکستانی قومیت اور پاکستان کی جداگانہ تہذیب

۱؎ ''ہمہ یاراں دوزخ'' کا دیباچہ

کا مفہوم واضح نہ تھا۔ مسعود مفتی نے اب سے بیس بائیس برس پیشتر مزاح نگار اور افسانہ نویس کی حیثیت سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ ''مسرِ راہے'' اور ''محدب شیشہ'' کا مزاح نگار اور کہانی کار ترقی پسند تحریک کے ادبی ثمرات سے شاد کام ہونے میں کوشاں نظر آتا ہے۔ مقصدیت اور حقیقت نگاری کا وہ چلن جو ترقی پسندوں اور جدیدیت پسندوں کا طرۂ امتیاز تھا۔ مسعود مفتی کے ہاں بھی عام تھا۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے موضوع پر لکھے گئے افسانوں کے مجموعہ ''رگِ سنگ'' میں مسعود مفتی مقصدیت اور حقیقت نگاری کے نئے معنی دریافت کرنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ مگر اس کتاب میں بھی یہاں وہاں انسان دوستی کے مغربی تصور کا غلبہ نظر آتا ہے جس کے زیر اثر مسلمان دوستی اور انسان دوستی میں تصادم کی کیفیت نمایاں ہے۔ انسان دوستی کے سیکولر تصوّر اور قوم پرستی کے آدرش کے درمیان یہ کش مکش قیامِ مشرقی پاکستان کے دوران نکتۂ عروج کو پہنچتی ہے اور بالآخر بریلی کے ایامِ اسیری میں ختم ہو جاتی ہے۔ اب مسعود مفتی بھارت کے جنگی قیدی مسعود الرحمٰن مفتی کی واردات سے اکتسابِ نور کرتا ہے۔ تو ''صدیوں پار'' کا سا افسانہ جنم لیتا ہے۔ یہ افسانہ مسعود مفتی کے فنی سفر کو ایک نئے موڑ سے آشنا کرتا ہے۔ یہ نئی سمت تاریکی کے دنوں میں قرآن سے روشنی لینے سے نمودار ہوئی ہے۔ ''لمحے'' کے آخری مضمون ''لمحوں کی سوچ'' میں مسعود مفتی ہمیں بتاتے ہیں کہ ان کے ہاں تاریکی کی تین سطحیں ہیں۔ پہلی سطح ملّتِ اسلامیہ کے اس تاریک ترین دور سے عبارت ہے جب آٹھ سو سال تک حکومت کرنے کے بعد مسلمان ہسپانیہ سے نابود ہو گئے۔ تاریکی کی دوسری سطح برِعظیم کے مسلمانوں کے اس تاریخی المیے سے عبارت ہے جسے سقوطِ ڈھاکہ کہتے ہیں اور جو سقوطِ غرناطہ سے عبرت نہ پکڑنے سے وقوع پذیر ہوا ہے۔ تاریکی کی تیسری سطح پاکستانی قوم کے ماضی و حال کے مصائب کی سطح ہے۔ ''صدیوں پار'' میں مسعود مفتی نے فن کارانہ چابکدستی اور پاکستانی طرزِ احساس کی بدولت تاریکی کی ان تینوں سطحوں کو یکجا کر دیا ہے۔

''صدیوں پار'' میں بیت المکرّم اور مسجد قرطبہ۔۔۔ ڈھاکہ اور غرناطہ۔۔۔ ایک ہی تصویر کے دو رُخ نظر آتے ہیں اور ملّتِ اسلامیہ کی تاریخ کی تہ در تہ تاریکی میں یادوں کی بجلی یوں رہ رہ کر لہراتی ہے کہ زمان و مکان کی حدود مٹ کر رہ جاتی ہیں اور غرناطہ کے مسلمانوں اور ڈھاکہ کے مسلمانوں کی واردات ایک بن کر رہ جاتی ہے۔ یادوں کا ایک ورق الٹتا ہے تو ''صدیوں پار'' کا وہ ۱۹۷۱ء کے المیے میں ۱۹۴۷ء کے فسادات کا عکس دیکھتا ہے:

> ''اُسے یوں لگتا جیسے قرطبہ کی مسجد کا صحن اس پرانے گھر کا صحن ہے جہاں ادھ موئی آگ اور پھیکی چاندنی میں وہ اپنے گھر والوں کی لاشیں دیکھ رہا ہے۔'' اور ''معاً اُسے یوں لگا کہ یہ بیت المکرّم کے مؤذن کی آواز نہیں بلکہ قرطبہ کے مؤذن کی آواز ہے۔۔۔ اور یہ آج نہیں بلکہ صدیوں بعد کا کل ہے۔۔۔''

یوں تو ''ریزے'' میں مشرقی پاکستان کی وہ تصویر اپنے بیشتر رنگوں کے ساتھ موجود ہے جس میں مشرقی پاکستان زوال اور فنا کے راستے پر تیزی سے گامزن ہے۔ ایک ایسا معاشرہ اپنے آخری سانوں میں تڑپ رہا ہے جہاں زندگی گراں اور موت ارزاں ہے۔ جہاں کی فضا میں وہم پلتا ہے اور سیدھی سادی زندگی نفسیاتی اور جنسی امراض میں مبتلا ہو کر حیوانیت اور بربریت کی طرف لوٹ رہی ہیں۔ اس مریض اور شدید تشنج میں مبتلا معاشرے کی عکاسی فنی حسن اور گہری دردمندی کے ساتھ کی گئی ہے۔ فنی پختگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ''نیند'' میں اگر ''سیاہ حاشیے'' کا منٹو یاد آتا ہے تو ''تشنگی''، ''ٹھنڈا گوشت'' کی یاد دلاتا ہے اور ''جال'' میں ہیروشیما سے پہلے اور ہیروشیما کے بعد کا احمد ندیم قاسمی موجود ہے۔ سعادت حسن منٹو اور احمد ندیم قاسمی کا ذکر مسعود مفتی کے فنی اعجاز کے ثبوت کے طور پر آیا ہے نہ کہ فنی عجز کے باعث۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مسعود مفتی نے اپنے فوری پیشروؤں سے اردو افسانے کی روایت سے وہ سب کچھ سیکھا ہے جو کسی بھی ایسے فن کار کے لیے سیکھنا ضروری ہے۔ جس نے فن کی شاہراہ پر دُور تک جانا ہو مگر فنی چابکدستی کے اس سارے قابلِ رشک ساز و سامان کے بعد مجھے ''ریزے'' کا وہ طرزِ احساس دلفریب معلوم ہوا ہے جو ''صدیوں پار'' میں اپنی رعنائیوں سمیت جلوہ گر ہے اور جو مسعود مفتی کو آہستہ آہستہ اس طرزِ احساس سے قریب تر لا رہا ہے جو انتظار حسین کی خاص عطا ہے اور جس کی بدولت ''صدیوں پار'' کے مطالعے کے دوران انتظار کا افسانہ ''وہ جو کھوئے گئے'' بار بار یاد آتا ہے:

> ''تب زخمی سر والا تلخ اور افسردہ ہنسی ہنسی میں اکھڑ چکا ہوں۔ اب میرے لئے یہ یاد رکھنے سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میں غرناطہ سے نکلا ہوں یا جہان آباد سے نکلا ہوں یا بیت المقدس سے اور یا کشمیر سے ۔۔۔ کہتے کہتے وہ رکا۔
>
> زخمی سر والے کی اس بات سے سب عجیب طرح متاثر ہوئے کہ چپ سے ہو گئے بار لیش آدمی آبدیدہ ہوا اور یہ کلام زبان پر لایا کہ ہم اپنا سب کچھ تو چھوڑ آئے ہیں کیا ہم اپنی یادیں بھی چھوڑ آئے ہیں؟''
>
> (وہ جو کھوئے گئے)

مسعود مفتی بھی ان یادوں کی بازیافت کے سفر پر نکل پڑے ہیں جو ہمیں ڈھاکہ اور کشمیر کے مظالم کو دِلّی اور فلسطین اور غرناطہ کے مظالم سے ملا کر سمجھنے کا طرزِ احساس بخشتی ہیں، جن یادوں کو اپنے خواب و خیال میں بسا کر اسلامیانِ ہند نے تحریکِ پاکستان کا آغاز کیا تھا اور جن یادوں کو گواہ بنا کر بسترِ مرگ پر بے چین اقبالؔ نے قائد اعظم کو لکھا تھا کہ اگر پاکستان نہ بنا تو برصغیر میں غرناطہ اور فلسطین کی داستان دُہرانے جانے کا امکان ہے۔ مسعود مفتی صدیوں پار جھانکتے ہوئے ہم سے پوچھتے ہیں کہ پاکستان بن جانے کے باوجود ۱۹۷۱ء میں ہمارے ہاں غرناطہ کی داستان کیوں دہرائی گئی۔۔۔؟ شاید اس لئے کہ پاکستان آتے ہوئے ہم اپنی یادیں برٹش انڈیا ہی میں چھوڑ آئے تھے!

فکروخیال

تاج سعید

(●)

ادبی رسائل کی ادارت کے دوران میرا رابطہ بہت سارے افسانہ نگاروں کے ساتھ رہا ہے۔لیکن یہ اتفاق ہے کہ کچھ افسانہ نگار پھر بھی میری دسترس سے دور ہی رہے ہیں اور انہی میں ایک نام مسعود مفتی کا بھی ہے۔اس کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ مفتی صاحب ہمیشہ سرکار کے بڑے عہدوں پر متمکن رہے ہیں اور میں ان کے عہدوں کے رعب ہی کی وجہ سے ان سے دور رہا لیکن جن دنوں میں''جریدہ'' کا احمد فراز نمبر مرتب کر رہا تھا تو مجھے فراز کی شاعری اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں ایسی شخصیات کی تلاش تھی جو فراز سے قریب بھی ہوں اور بے تکلف بھی۔چنانچہ جب میں نے ایک دن فراز سے دریافت کیا کہ مسعود مفتی صاحب سے اگر کہا جائے تو وہ آپ کے بارے میں ایک آدھ مضمون لکھ دیں گے تو اس نے مجھے کہا چلو ابھی چل کر دریافت کئے لیتے ہیں۔چنانچہ میں فراز کے ساتھ جب ان کے دفتر گیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جس شخص کے افسرانہ ٹھاٹ باٹ کا رعب ایک عرصہ سے میرے اوپر طاری تھا وہ یہ شخص تو نہیں ہے۔مسعود مفتی صاحب بالکل سادہ اور نرم خو قسم کے بندے نظر آئے۔فراز نے ان سے میرا تعارف کرایا اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ یہ جریدہ کا ایک نمبر میرے بارے میں شائع کر رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آپ بھی میرے بارے میں ان کو ایک مضمون لکھ کر دیں۔فراز صاحب کی اس بات کو سن کو مفتی صاحب مسکرائے اس انداز سے کہ نہ اس میں اقرار تھا اور نہ ہی انکار۔چنانچہ ان دونوں کی بے تکلف گفتگو سے مجھے قدرے حوصلہ ہوا اور میں نمبر کی تیاری کے دوران جب بھی اسلام آباد گیا فراز کو ساتھ لے کر ان کے دفتر بھی جاتا رہا۔اس کا نتیجہ اچھا نکلا اور مجھے فراز نمبر کے لیے ایک نہایت ہی عمدہ خاکہ مل گیا۔یہ خاکہ اس لحاظ سے خاصا اہم اور دلچسپ ہے کہ اس میں بنیادان دونوں دوستوں کی ملاقاتوں اور فراز کی چند عمدہ نظموں کے اقتباسات سے استوار کی گئی ہے اور اختتام لکھتے وقت مسعود مفتی صاحب نے ایک بات ایسی بھی لکھی ہے جو فراز کے ساتھ ساتھ ان کی حق گوئی کی بھی گواہ بن گئی ہے لکھتے ہیں:

''میں فراز کی اس لئے قدر کرتا ہوں کہ انہوں نے سرسید، حبیب جالب، اقبال اور فیض کی اس روایت کو جاری رکھا کہ ماحول کے خلاف فرد کو احتجاج کا پیدائشی حق ہے۔ماحول کا یہ جبر کبھی تو جہالت کی فرسودہ روایات میں گڑا ہوتا ہے، کبھی معاشرے کی غلط اور ناہموار ساخت سے جنم لیتا ہے۔کبھی مذہب کے غلط تصورات سے دوزخ کی آگ کی طرح ابلتا ہے اور کبھی اقتدار کے ایوانوں سے زہریلی بارش بن کر برستا ہے۔بدقسمتی سے پاکستان میں یہ ساری صورتیں بیک وقت کارفرما ہیں اور ہمارا فرد مایوسی کی اسی انتہا تک پہنچ گیا ہے کہ بیدل کے الفاظ میں

شب رفت سحر نہ شد شب آمد

میرا ایمان ہے کہ جب تک ہمارا فرد احتجاج کرنا نہیں سیکھتا اس وقت تک قوم کو اپنی گردن پر سوار متعدد قسم کے تسمہ پاپیروں سے نجات نہیں مل سکتی۔احتجاج کی کوئی بھی آواز ہو اور چاہے کسی انداز میں ہو۔ہماری قوم کے لئے فال ہے۔''

اور اب جو میں نے مسعود مفتی کے افسانوں کو نکال کر ان کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ وہ بھی احمد فراز کے قبیلے کے فرد ہیں۔ان کے افسانوں کی تعمیر میں بھی وہی مٹی اور گارا استعمال کیا گیا ہے جس کا اظہار انہوں نے احمد فراز کے خاکے میں کیا ہے، انسان کی مظلومی اور اس پر ہونے والے جبر کے خلاف انہوں نے اپنے افسانوں میں آواز بلند کی ہے اور اس سلسلے میں اپنے سرکاری منصب کی بھی پروا نہیں کی اور نہ ہی وہ کسی کی دھونس دھمکی سے مرعوب ہوئے ہیں۔ان کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید کا یہ ارشاد بھی درست ہے کہ''سچا ادب ہمیشہ آزاد اور غیر مقلد ہوتا ہے۔وہ ہر دور میں ظلم کے خلاف آواز اٹھاتا ہے اور جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہتا ہے۔مسعود مفتی چونکہ ادیب ہے اس لئے اس نے بھی یہ آواز بڑے موثر انداز میں بلند کی ہے۔''لیکن ان سے ملاقات ہو تو وہ کسی صورت میں بھی اس طرح کی دبنگ اور سراپا احتجاج شخصیت قطعاً نظر نہیں آتے۔ویسے اردو افسانے کی دنیا میں ان کا نام خاصا جانا پہچانا ہے، وہ حقیقت پسند کے طور پر مشہور ہیں اور ان کی حقیقت نگاری اتنی واضح اور خوبصورت ہے کہ ان کا ہر افسانہ ہماری جیتی جاگتی زندگی کی عکس نمائی کرتا نظر آتا ہے۔وہ جہاں جہاں بھی رہے انہوں نے اپنے آس پاس سے ایسے کرداروں کا انتخاب کیا ہے جو زندہ اور متحرک ہیں اور جن کے بارے میں قاری جب کچھ جان لیتا ہے تو اس کو ان سے محبت ہو جاتی ہے وہ جان لیتا ہے کہ زندہ اور سانس لیتا ہوا شخص کتنا خوبصورت ہے، کس قدر توانا ہے اور کس قدر اس سے قریب ہے۔بقول جسٹس ایس اے رحمان ''مسعود مفتی ہمیں کسی رومانی جنت کی سیر نہیں کراتے وہ بھی تو معاشرے کے رستے ہوئے ناسوروں کو چھیڑتے ہیں اور کبھی خالصتاً زندگی کے المیہ پہلوؤں کی جھلکیاں دکھاتے ہیں۔''چنانچہ انہوں نے اپنے اظہار کے لئے افسانوں کے ساتھ ساتھ ڈرامے، رپورتاژ اور انشائیے بھی لکھے ہیں۔مشرقی پاکستان کے قیام کے دوران انہوں نے بنگال کے سرسبز شاداب علاقے کا احوال بھی دردمندی کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ان کا رپورتاژ''چہرے'' مشرقی پاکستان کے آخری لمحوں کی داستان ہے اور اس کتاب پر انہیں آدم جی ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔اسی طرح ان کا دوسرا رپورتاژ''ہم نفس'' مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی داستان سناتا ہے۔

باقی صفحہ ۳۵ پر ملاحظہ کیجیے

وہ محض ایک شہری تھا۔

آپ جانتے ہیں نا۔ پاکستانی شہری کیا ہوتا ہے؟۔۔۔وہی!۔۔۔ بہت شریف اور سیدھا سادا۔ جس سے کسی کو بھی کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ بالکل بے ضرر۔۔۔جھینگر جیسی لگاتار آواز بھی نہیں لگا سکتا کہ رات کا سناٹا ہی توڑ سکے۔ اسی لیے ہر طبقہ اس کی خاموشی سے ڈھیروں فائدے اٹھاتا رہتا ہے۔ یعنی لیڈر، وڈیرے، پیر، مولوی، تاجر، وکیل، ڈاکٹر، دکاندار، مزدور، اساتذہ، سرکاری ملازم، بلکہ خود سرکار بھی اس کا ایسے استحصالی استعمال کرتی رہتی ہے۔

اتنے برس گزرنے کے بعد بھی اسے باپ کی موت ایسے ہی یاد تھی جیسے کل کا واقعہ ہو۔

۱۹۵۷ء میں وہ پورے دس برس کا تھا اور بیمار باپ کی لاغر ٹانگیں دبا رہا تھا۔ جو آنکھیں بند کیے سیدھا لیٹا ہوا تھا۔ وہ کبھی کبھی بے چینی اور بے قراری سے اپنا سر تکیے پر دائیں بائیں موڑتا تھا۔ تو یہ زیادہ تن دہی سے دبانے لگتا۔۔۔ دھیرے دھیرے اس کو قرار آنے لگا۔ بچہ خوش ہوا کہ اس کے پاؤں دبانے سے فائدہ ہو رہا ہے۔ پھر جیسے غنودگی کے سے عالم میں مریض ساکت ہوگیا۔ گلے سے ہلکی سی خرخراہٹ ابھری۔ تو اس نے سمجھا کہ یہ نیم پختہ خراٹے کی آواز ہے۔ اور وہ ہولے ہولے اپنے ہاتھوں کا دباؤ کم کرنے لگا۔ تاکہ نیند نہ ٹوٹے۔ لیکن پھر اسے محسوس ہوا کہ اس کے ہاتھوں میں تھامی ہوئی ٹانگوں کے پٹھے ایکا ایکی اکڑنے لگ گئے ہیں اور ان میں جیسے بجلی کی لہر سی دوڑ رہی ہے۔

ڈر کر اس نے فوراً ہاتھ اٹھا لیے اور گھبرا کر باپ کے چہرے کی طرف دیکھا۔

وہ چہرہ اب ایک عجیب چہرہ تھا۔ ناقابلِ بیان سے کرب میں ڈوبا ہوا۔ موہوم سے رنگ بدلتا ہوا۔ زور زور سے آنکھیں میچتا، ناک سکوڑتا اور ہونٹ بھینچتا ہوا۔۔۔ ساتھ ہی بجلی زدہ ٹانگیں اور پاؤں مزید اکڑنے کے انداز میں کھنچنے لگے۔

خوفزدہ سا ہو کر اس نے ہاتھ کھینچے۔ چارپائی سے چھلانگ لگائی اور بھاگ کر فق چہرہ ماں کے کندھے میں چھپا لیا۔

وہ امن واماں، سکون اور بھائی چارے کا زمانہ تھا۔ تھوڑی سی دیر میں رشتے دار، ہمسائے اور واقف کار آنے لگے۔ جنازہ اٹھنے تک تو گھر میں آہ وبکا کا شور تھا مگر جب وہ تھم گیا اور مہمان چلے گئے تو بھی اسے اپنے کانوں میں عجیب سی گونج محسوس ہوتی رہی۔ نہ معلوم کیسی۔ وہ کسی کو بتا نہ سکتا تھا۔ سمجھا نہ سکتا تھا، صرف محسوس کر سکتا تھا۔۔۔ چند دنوں میں دھیرے دھیرے وہ خود ہی تحلیل بھی ہوگئی۔ مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ یہ سب کیا تھا۔۔۔ شاید اس خرخراہٹ کی کوئی شکل تھی جو اس نے آخری وقت مرنے والے باپ کے گلے سے سنی تھی۔

ان دنوں بڑی شدت سے اسے باپ کی کمی محسوس ہوئی۔ باپ ہوتا تو وہ پوچھ سکتا تھا کہ یہ گونج کیا ہے اور کیوں ہے؟

وہ باپ اپنے بچوں سے بہت باتیں کیا کرتا تھا۔ گرمیوں کی رات چھت پر کھلے آسمان کے نیچے وہ سب چارپائیوں پر بیٹھے یا لیٹے ہوتے تو وہ بچوں کو پچھلی باتیں سنانے لگتا۔ کہ دس برس پہلے پاکستان کیسے بنا تھا۔ مشرقی پنجاب میں ان کے علاقے میں کیسا قتل وغارت ہوا تھا۔ اس کا باپ کیسے لاپتہ ہوا تھا اور ابھی تک تھا۔ ماں اور بہن سے کیا ہوا تھا۔ ان کے جدّی گھر ان کی آنکھوں کے سامنے پہلے لُوٹے گئے۔ پھر جلائے گئے۔ وہ بڑی مشکل سے بچتے بچاتے سکول میں جا چھپے تھے۔ جو بعد میں پناہ گزینوں کا کیمپ بنا دیا گیا تھا۔ وہ قافلوں کی شکل میں کتنے دن کے جان لیوا سفر کے بعد بڑی مشکل سے پاکستان پہنچے تھے۔ کیونکہ راستے میں قافلے پر بھی حملہ ہوگیا۔ ادھر سے ریل گاڑیاں مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی چلتی تھیں۔ مگر بعض راستے میں حملے ہوتے اور جب لاہور پہنچتیں تو ان میں صرف کٹی پھٹی لاشیں ہوتیں۔

''ہم وہ مہاجر نہیں بچو جو پاکستان بننے کے بعد ٹہلتے ہوئے اِکا دُکا ادھر پہنچے۔ یہاں آ کر اطمینان سے روزی ڈھونڈی پھر چند لوگوں کو ادھر بلا لیا اور باقی کو ادھر چھوڑ دیا۔ انہیں بغیر تکلیف، خوف اور تباہی کے پاکستان بھی مل گیا اور ہندوستان میں بھی جمے رہے۔ مگر ہم تو وہ ہیں جن سے سب کچھ چشم زدن میں چھوٹ گیا۔ مکمل تباہی دیکھی، مہینوں خوف وہراس۔ آگ، خون اور غارت گری میں قتل ہونے سے بچتے رہے۔ آدھے آدھے خاندانوں کی خون آلود لاشوں کو بغیر دفنائے بمشکل اپنی جانیں بچا کر ادھر پہنچے۔ بچو اس ملک کی جو قدر ہمیں ہے وہ کسی اور کو نہیں۔۔۔ یہاں والوں کو بھی نہیں۔۔۔۔''

وہ اپنی انگلی اٹھا کر کہتا ''اس مبارک آسمان کے نیچے ہمیں دوسری زندگی ملی، نئی دنیا ملی، نئی روزی ملی، عزت ملی، امن وچین، سکون ملا، سب کچھ ملا۔۔۔ شکر ہے خدا کا''

پھر بچے کئی قسم کے سوالات پوچھتے رہتے۔

''کیا بتاؤں بچو۔ میری امی اور بہن نے اغوا سے بچنے کے لیے گاؤں کے کنوئیں میں چھلانگ لگا دی تھی۔ جہاں ان جیسی اور بھی بہت سی کود چکی تھیں۔ مرد حملہ آوروں سے لڑتے رہے۔ گھروں کے شعلوں سے بچتے رہے۔

اور بالآخر شکست کھا کر پہلے کسی ہندو دوست کے ہاں چھپے پھر وہاں سے بھاگ کر سکول کے کیمپ میں پہنچ گئے۔''

بچے پوچھتے رہتے اور وہ رات گئے تک انہیں تفصیلات بتاتے نہ تھکتے۔ بچے بھی یہ باتیں بار بار سنتے تھے۔ مگر سننے میں تھکتے نہ تھے۔

''یہ پاکستان تو جنت ہے۔۔۔ آج ہمارے لیے۔۔۔ کل تمہارے لیے۔۔۔ ہم سب خدا کے فضل سے خوش ہیں۔ آگے بڑھ رہے ہیں۔ اپنا دین ہے۔ اپنا ایمان ہے۔ اور کیا چاہیے ہم کو؟۔۔۔ چلو تمہاری آنکھیں بند ہو رہی ہیں۔ اب سو جاؤ''

یہ کہہ کر باپ تو سو جاتا مگر ان تفصیلات سے اس کی نیند اڑ جاتی۔ وہ اپنی چار پائی پر سیدھا لیٹا لیٹا آسمان کو تکتا رہتا۔ چاند کو دیکھتا رہتا۔ تاروں کو گنتا رہتا۔ بعد ازاں رات کے سناٹے میں جب پاکستان کے متعلق باپ کی باتیں کانوں میں گونجتیں تو اسے تاروں بھرے آسمان پر پیار آنے لگتا۔

مگر اب وہ باپ نہ تھا۔ ماں البتہ ضرور تھی مگر وہ تو کچھ اور ہی دنیا تھی۔ اس کے پیار میں زندگی تھی۔ آواز میں شرینی تھی۔ کھلانے میں مزہ تھا۔ آغوش میں خدائی تھی۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ اور بے شمار تھا۔ مگر وہ باپ والی بات کہاں تھی۔ بات سمجھانے کا مزہ تو بس باپ ہی سے تھا۔ اس لیے وہ خاموش رہنے لگا۔ اور خاموشی میں ہی بڑا ہوتا گیا۔

اچانک ملک میں پہلا مارشل لاء لگ گیا۔ اسے کوئی سمجھ نہ تھی کہ مارشل لاء کیا ہوتا ہے۔ مگر زندگی کی چال میں اچانک تبدیلی کا ہر طرف شور وغوغا تھا۔ اخباروں میں بڑی بڑی سرخیاں ہوتیں۔ بڑے بڑے لوگوں کی گرفتاری کی خبریں ہوتیں۔ باوردی فوجی بازاروں، گلیوں میں گھوم کر قصائیوں اور نان بائیوں وغیرہ کو مکھی سے بچنے کے لیے جالیاں لگانے پر مجبور کرتے۔ فوجی افسر چھڑی لہرا لہرا کر ہر طرف صفائی کی تلقین کرتے اور میونسپل کمیٹی والے بڑی تندہی سے نالیاں صاف کر کے ان میں چُونا ڈالتے رہتے۔ گلی محلوں میں لوگوں کی ٹولیاں حیرت سے چہ میگوئیاں کرتیں کہ اب کوئی بے ایمانی نہیں ہوگی۔ بے انصافی نہیں ہوگی۔ جیسے کوئی معجزہ ہو رہا ہو۔

وہ بھی بہت عرصہ تک یہی سمجھتا رہا۔

برس گزرتے گئے۔

گلیوں کی نالیاں پھر گندی ہو رہی تھیں۔ دکانوں کی جالیاں غائب ہو چکی تھیں۔ صفائی پر سابقہ گندگی غالب آ چکی تھی۔ بے ایمانی۔ بے انصافی اور بدامنی بھی خاموشی سے پاؤں پھیلا رہی تھی۔ معجزے کا پرچار تو اب بھی جاری تھا مگر عینی شہادت غائب ہو چکی تھی۔

اس کی عمر بڑھتی رہی۔ قد بڑھتا رہا۔ تعلیم آگے چلتی رہی۔ شعور پکتا رہا۔ تو ایک دن صدر ایوب کے خلاف تحریک کے دوران اس کے کالج کے طلباء کا ایک جلوس لاہور کی مال روڈ پر پولیس سے ٹکرا گیا۔ آنسو گیس، لاٹھی چارج، ہائے وائے، خاک و خون، اسے خود بھی چوٹیں آئیں۔ مگر ایک ہم جماعت تو شدید زخمی ہوا۔ ان دنوں ایدھی فاؤنڈیشن کی ایمبولینس تو ہوتی نہیں تھی۔ اور پولیس ہجوم سے مصروف تھی۔ اس لئے لڑکے خود ہی گاڑی والوں کی منت سماجت کر کے زخمی دوست کو ہسپتال لے گئے۔

اپنی چوٹ پر پٹی باندھے ہوئے وہ دوست کو دیکھنے روزانہ ہسپتال جاتا رہا۔ کوئی دس دن بعد جب وہ اس کے جنازے کو کندھا دے رہا تھا تو اس کے کان پھر سے بجنے لگے۔ ایک مدھم سی آواز ابھر رہی تھی۔ جیسے کوئی گونج زیرِ زمین ہو یا تیز ہوا کی سرسراہٹ ہو یا گلے کی خرخراہٹ ہو۔

وہ کئی دن تک کانوں کو بار بار انگلی سے کھجاتا رہا۔ سر کو بار بار جھٹکتا رہا۔ کبھی کبھی وہ آواز غائب بھی ہو جاتی مگر صرف تھوڑی دیر کے لیے۔ پھر واپس آ جاتی۔ لمبے وقفے بھی پڑتے لیکن اسے مکمل چھٹکارا نہ ملتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ تھک ہار کر اس کے اندر ہی کہیں کنڈلی مار کر چپ چاپ سی بیٹھ جاتی ہے۔ کبھی ذرا سی ہل گئی یا سر اٹھایا اور پھر سو گئی۔

زمانے کی زقند کے دوران ۱۹۷۱ء میں پاکستان کے دو ٹکڑے ہو چکے تھے۔ وہ برسوں خون کے آنسو روتا رہا مگر جو کچھ اس نے جنرل ضیاءالحق کے زمانے میں راولپنڈی کے جلسہ عام میں دیکھا وہ اس کی یادداشت سے کبھی محو نہ ہو سکا۔ اس وقت وہ خود بھی تیس بتیس برس کا عیال دار نوجوان تھا۔

بہت بڑے میدان میں شامیانے کے نیچے فوجی اور سرکاری افسران اور اہل کار کرسیوں پر جمے بیٹھے تھے۔ سامنے کھلی جگہ پر جلاد قسم کے لوگ پھر رہے تھے۔ اور کھلی جگہ کے اردگرد ہزاروں تماشائیوں کا مجمع تھا۔ ان تک آواز پہنچانے کے لیے جا بجا لاؤڈ اسپیکر تھے، جن پر کبھی قومی ترانے بجائے جاتے اور کبھی اعلان کے بعد ایک شہری کو درمیان والی کھلی جگہ لا کر لکڑی سے نصب شدہ سہارے سے باندھا جاتا۔ پھر جلاد اپنی پوری قوت سے اسے کوڑے لگاتے۔ لوگ خوشی سے تالیاں پیٹتے، نعرے لگاتے، ڈاکٹر بار بار جھک کر معتوب کی نبض ٹٹولتا۔ یکے بعد دیگرے اعلان، کوڑے، تالیاں، نبض اور بار بار سپاہی ادھ موئے شکار کو اٹھا کر لوگوں کی نظروں سے دُور لے جاتے۔ ان باریوں کے درمیان قومی ترانے بجتے رہے۔ آخری سین یہ تھا کہ ایک سینئر ریٹائرڈ سرکاری افسر کو چبوترے پر کھڑا کر کے اس کے منہ پر کالک ملی گئی۔

اس نے یہ سب کچھ دیکھا ضرور۔ مگر وہ کسی واضح ردِعمل سے قاصر تھا۔ کیونکہ اس کی جملہ حسیات جیسے اس منظر کے بعد شل سی ہو گئی تھیں۔ بظاہر تو یوں لگتا تھا کہ وہ اک بے حس ڈھیر ہے مگر اس بے جان ڈھیر کے اندر بھی اس کا دل اس شدید خواہش سے مغلوب تھا کہ ان لوگوں میں سے کسی سے مل سکے، جسے کوڑے لگے تھے۔۔۔ نہ معلوم کیوں؟ نہ ہی اس کے ذہن میں کوئی سوال تھا، نہ سوچ تھی کہ کیا بات کرے۔ بس ایک موہوم سا دھواں اس کے اندر گردش کر رہا تھا کہ وہ کسی طرح ان تک پہنچ جائے تا کہ ان کی دکھتی ہوئی پیٹھ کو سہلا سکے۔ اس

سے آگے کچھ بھی واضح نہ تھا اور سب کچھ گڈ مڈ تھا۔

کافی دنوں تک اس کی یہ خواہش تو پوری نہ سکی۔ مگر ایک دن اسے پتہ چلا کہ ایک معتوب کے کوڑوں والے زخم تو ٹھیک ہو گئے تھے مگر بعد ازاں وہ بے عزتی اور شرمندگی کی یلغار میں دل کا دورہ پڑنے سے مر گیا۔ کوڑے لگنے کی تصویریں تو تمام اخبارات میں چھپی تھیں مگر شرمسار کی موت کا ذکر کسی اخبار میں نہیں ہوا۔ یہ بات سن کر وہ بے نام سی چیز جو کئی برس پہلے اس کے کہیں اندر کنڈلی مار کر چھپ گئی تھی ایک دم پھن اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔ اور اس کے کانوں کے پردے پھر اسی سرسراہٹ سے ایسے بےکل ہونے لگے جیسے بے وقت موت پر سوگوران کے بین دُور سے سنائی دیتے ہیں۔

جیسے جیسے اس کی کنپٹیوں کے بال سفید ہوتے گئے، سر کی چوٹی کے بال کم ہوتے گئے، ویسے ویسے اردگرد بھی ماحول بدلتا گیا۔ نالیاں پھر سے بھرتی بھرتی کناروں سے باہر ابلنے لگیں، دکانیں پہلے سے بھی گندی ہونے لگیں۔ بے انصافی ہر طرف زہریلی گیس کی طرح پھیلنے لگی۔ بے ایمانی قانون سے زیادہ طاقتور ہونے لگی اور بدامنی رواج بننے لگی۔ ان سب سے کئی اور ایسے شاخسانے پھوٹنے لگے جو پہلے کبھی تھے ہی نہیں۔ یا اگر تھے تو شاذ و نادر تھے۔ مثلاً ایک دن اس کا دو سالہ بیٹا زیر زمین نالے کے کھلے مین ہول (MANHOLE) میں گر کر مر گیا۔ اور کچھ عرصہ بعد اس کے چچا نے بے روزگاری سے تنگ آ کر خودکشی کر لی۔

ان دونوں واقعات کے بعد اس کے کانوں میں سرسراہٹ نے یوں بسیرا کر لیا جیسے کان کے پردوں پر مسلسل کچھ رینگ رہا ہو۔

یہ کیا؟ وہ اردگرد ہر طرف دیکھ کر دل ہی دل میں جھنجھلاتا۔

یہ کیوں ہے؟ وہ کانوں کو ہتھیلیوں سے دباتا اور رگڑتا ہوا اپنے آپ سے پوچھتا۔

یہ کس چیز کی آہٹ ہے؟ وہ آسمان پر نظریں دوڑاتے ہوئے زیرِ لب بڑبڑاتا۔

وہ کئی ڈاکٹروں، حکیموں اور نفسیاتی معالجوں کے پاس گیا مگر کوئی خاص افاقہ نہ ہوتا۔ کوئی معدے میں گرانی کی دوا اسے دیتا، کوئی اعصابی تقویت کی دوائیوں کی بھرمار کر دیتا، کوئی کانوں کی دوائیاں آزمانے لگتا۔

کسی نے کہا یہ بچپن میں باپ کی موت دیکھنے کا نفسیاتی خوف ہے۔ کسی نے وہم کہا۔ کسی اور نے اعصاب پر تشویش کی گرفت بتائی۔ کسی نے یہ کہہ کر معاملہ ختم کر دیا کہ تم ضرورت سے زیادہ حساس ہو، پتھر دل بن جاؤ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ سب کچھ کرنے والوں کو دیکھو، کیسے مزے میں ہیں۔ دیکھنا چھوڑ دو۔ کرنا سیکھو۔

پھر ایک دن ایک دم بجلی کے شرارے کی طرح اسے ایک خیال سوجھا اور کئی دن تک من ہی من میں وہ اس خیال سے کشتی لڑتا رہا۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، مصروفیت یا فراغت میں۔ بے خوف راتوں کی بے چین کروٹوں میں، اسی خیال کی الجھنوں نے ایک عجیب سے خیال کو جنم دیا۔ اور وہی سوال لے کر وہ مسجد کے مولوی صاحب کے پاس گیا اور پوچھنے لگا۔

''یہ بتایئے جی کہ مرنے والے کی روح کو آسمان تک پہنچنے میں کتنا وقت لگتا ہے؟''

مولوی صاحب نے اسے غور سے دیکھا۔ ''خدا کی باتیں تو خدا ہی جانے۔۔۔ مگر تم کیوں ان فاسد سوچوں میں گھس رہے ہو؟''

''میں تو نہیں گھستا جی۔۔۔ مگر جب وہ سنتا ہوں تو سوچنے لگتا ہوں۔

''وہ کیا؟''

''وہ آواز جی۔۔۔ جیسے کسی پرواز کی سرسراہٹ ہو''

''کسی کی پرواز؟''

''یہی تو سمجھ میں نہیں آتا جی۔ اوپر دیکھیں تو نہ کوئی پرندہ نہ پتنگ، نہ ہوائی جہاز نہ ہوا کا جھونکا یا کوئی مرغولہ۔ اسی لیے تو آپ سے پوچھنے آیا ہوں کہ کہیں یہ آواز کسی روح کی پرواز تو نہیں ہوتی؟''

''کب سے سن رہے ہو؟''

''پہلے بچپن میں سنی تھی جب میرا باپ فوت ہوا تھا۔۔۔ وہ بوڑھا تھا، بیمار تھا، لمبی بیماری کاٹ کر مر گیا۔۔۔ مجھے ایک ہموار سی سرسراہٹ چند دن سنائی دیتی رہی۔۔۔ سیدھی لکیر جیسی۔۔۔ میدانی پانی کے نرم بہاؤ جیسی۔ پھر وہ دُور جانے والے ہوائی جہاز کی طرح دھیرے دھیرے مدھم ہوتی گئی اور بالآخر ختم ہو گئی۔''

''تو پھر اب کیوں پریشان ہو؟'' مولوی صاحب نے پوچھا۔

اس لئے کہ وقتاً فوقتاً بعد میں آتی رہی ہے اور آج کل تو بہت زیادہ آ رہی ہے۔۔۔ پچھلے دنوں میرے چچا نے بے روزگاری سے تنگ آ کر خودکشی کر لی تو وہی سرسراہٹ پھر ابھری۔ مگر اب یہ بے چین تھی، ناہموار تھی، گھٹتی، بڑھتی، چنگھاڑتی، گھسٹتی، رگیدتی، ٹوٹتی اور ابھرتی۔۔۔ نہ معلوم کیوں؟۔۔۔ اور اب وہ ختم ہی نہیں ہوتی۔۔۔ مجھے بتایئے کیا یہ اسی کی روح بھٹکتی پھر رہی ہے؟''

مولوی صاحب سر جھکا کر سوچتے رہے۔ ''بھائی جی۔۔۔ میرا ذہن تو صرف یہاں تک جا سکتا ہے کہ تمہارا باپ خدائی قانون کے مطابق حلال موت مرا۔ مگر چچا خدائی قانون کے خلاف حرام موت مرا۔۔۔ شاید اس کا کوئی تعلق اسی بات سے ہو۔''

''تو پھر قیاس درست ہے کہ واقعی اس کی روح بھٹک رہی ہے''

مولوی صاحب پھر سوچ کر بولے۔ روحوں کا معاملہ تو مجھے پتہ نہیں مگر مجھے یوں لگتا ہے کہ تم پر کسی آسیب کا سایہ ہے۔۔۔ کل صبح کی نماز کے بعد مجھ سے تعویذ لے جانا۔ اللہ فضل کرے گا۔۔۔ اس کے کلام میں بڑی طاقت

ہے"

تعویذ ملا تو اس نے چوما، ماتھے سے لگایا، بڑی عقیدت سے چاندی کے خول میں منڈھایا اور اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کی دعائیں کرتے ہوئے گلے میں لٹکا لیا۔

یہ تعویذ اب صرف گلے میں ہی نہ تھا بلکہ اس کی مکمل ذات پر ایمان کی طرح چھایا ہوا تھا۔ اس پر رات کے وقت دونوں ہاتھ رکھ کر لیٹ جاتا۔ اور دعائیں کرتے ہوئے سو جاتا۔ دن میں زیادہ تنگ ہوتا تو گلے سے کھینچ کر ہونٹوں سے چومنے لگتا۔ نماز کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا تو بعض دفعہ تعویذ گلے سے اتار کر پھیلے ہوئے ہاتھوں میں رکھ لیتا۔

اس تعویذ کی بھر پور سنگت میں دن، ماہ اور سال گزرتے رہے۔ اس کی پریشانی میں افاقہ بھی ہوتا رہا۔ مگر کبھی طویل اور کبھی مختصر وقفوں کے بعد وہ آواز واپس آ جاتی۔ دریں اثنا اسے اب تک یقین ہو چکا تھا کہ اس سرسراہٹ کا تعلق کسی موت سے ہوتا تھا۔ اور مولوی صاحب سے گفتگو کے بعد اس کا رخ یوں بدلا کہ فطری موت کے بعد روح ہموار پرواز سے سیدھی آسمان پر پہنچ جاتی ہے۔ مگر فطرت کی بجائے انسانی تقصیر سے مرنے والوں کی روحیں اوپر نہیں پہنچ سکتیں بلکہ نیچے ہی بھٹکتی رہتی ہیں۔

اسی ادھیڑ بُن میں وہ خود بھی ادھیڑ عمر کا ہو گیا۔ چوٹی پر چمکتی چندیا کے گرد کھچڑی بالوں کی جھالر سی لٹکنے لگی۔ چہرے کے خطوط ڈھیلے پڑ گئے۔ کچھ ایسی ہی تبدیلیاں ملکی ماحول میں بھی ہو رہی تھیں۔ استحصالی نظام میں عوامی مفادات پر شخصی لالچ غائب ہو رہی تھی اور خواص پروری کی وجہ سے نظم و ضبط گھٹتا جا رہا تھا۔ جس کی وجہ سے دن بدن مزید سے مزید تر شہری عدم تحفظ کی تشویش میں لتھڑے جا رہے تھے۔

اسی عالم میں جب اکیسویں صدی طلوع ہوئی تو مسلسل نیچے گرنے والی ہر چیز کی طرح ہمہ جہت زوال بھی تیز تر ہوتا گیا۔ وہ اب خود بھی ترپن برس کا ہو گیا تھا۔ اسی لیے ماضی اور حال کا موازنہ نہ کر سکتا تھا۔

پہلے نالیوں سے صرف گندگی ابلتی تھی، اب ان میں جا بجا خون کے چھینٹے بھی نظر آتے ہیں۔ دائیں بائیں ایسی اموات بڑھنے لگیں جو فطرت کی بجائے انسانی تقصیر سے ہو رہی تھیں۔ حاکموں کی خود غرضانہ پالیسوں سے غربت اور بے روزگاری عام ہونے لگی۔ تو بھلے چنگے صحت مند لوگ اپنے اوپر تیل چھڑک کر اور ماچس جلا کر خود سوزیوں سے بھسم ہونے لگے۔ بھلی چنگی سوچ والے صحت مند دماغ اپنے معاشی مسائل کا حل خود کشی میں ڈھونڈنے لگے۔ ڈاکو اور لٹیرے سرکار میں شرکت کرنے لگے اور سرکاری سرپرستی یا چشم پوشی کی وجہ سے مال کے ساتھ جان بھی لوٹنے لگے۔ غیر ذمہ داری یا نااہلی کی وجہ سے ریلوے ٹرینوں کے حادثوں میں بیسیوں لوگ کیڑے مکوڑوں کی طرح مرنے لگے۔ فرقہ واریت مسجدوں کے اندر باہر خون کی ہولی کھیلنے لگی۔ دھات اور مانجھے کی ڈور سے پتنگوں کی بجائے بچوں کی گردنیں کٹنے لگیں اور سر لڑھکنے لگے۔ اور ملک کے کونے کونے سے ہر روز وہ لوگ مرنے لگے جنہیں ابھی مرنا نہ تھا۔

وہ اپنے گرد و پیش اور شب و روز کا جائزہ لیتا رہا۔۔۔ ہر روز موت کی خبریں، ہر شہر موت کے سائے۔۔۔ ہر سانس ناگہانی موت کا سہم۔۔۔ زندگی دن بدن گراں۔۔۔ موت لحہ بہ لحہ ارزاں۔۔۔ ہر آج گذشتہ کل سے بدتر۔۔۔ عوام خوفزدہ۔۔۔ حاکم بے پرواہ۔۔۔ ہواؤں میں بے یقینی اور بے اعتمادی کی باس۔۔۔ افراد میں اسی باس کا خوف و ہراس۔۔۔ لوگوں میں تشویش کی سرایت۔۔۔ خون میں خلش کی ملاوٹ۔

ایسے ماحول میں کبھی مسجد میں یا سرِ راہ اس کی ملاقات مولوی صاحب سے ہوتی تو وہ ضرور حال چال پوچھتے۔ وہ کبھی چپ رہتا، کبھی مسکرا کر ٹال دیتا۔ کبھی کہتا۔

"تعویذ تو پہنا ہوا ہے جی"

مولوی صاحب سمجھ جاتے۔ "فکر نہ کرو، اللہ فضل کرے گا، بعض آسیب سخت ہوتے ہیں مگر اللہ کے کلام کے آگے کوئی نہیں ٹھہر سکتا۔ بس وقت کی بات ہے۔"

ایک دو دفعہ تو انہوں نے مزید تعویذ بھی دیئے مگر کانوں میں دھیمی اور مدھم سرسراہٹ بدستور تھی۔ اب وہ ذہنی طور پر اس سے سمجھوتہ کر چکا تھا۔ جیسے شہر کی بڑی سڑکوں پر رہائشی لوگ ٹریفک کے شور کے عادی ہو جاتے ہیں۔ لیکن اخبار، ٹی وی، ریڈیو یا لوگ جب کسی اچانک حادثے، جرم یا موت کی خبر سناتے تو جیسے کاہی جے تالاب میں اینٹ پھینکی جاتی۔۔۔ ایک دھماکا۔۔۔ دائروں کی دوڑ۔۔۔ لہروں کی دھینگا مشتی۔۔۔ پھٹی ہوئی کائی کی افراتفری۔۔۔ اس کے بے ترتیب ٹکڑوں کی بھاگ دوڑ اور بدلتے نقشے۔۔۔ کیڑوں اور مینڈکوں کی جست اور ڈبکیاں۔۔۔ ایک ہوک کی طرح پرندوں کی فوری اڑان۔۔۔ گویا سارا منظر درہم برہم ہو جاتا اور پھر ہوتا رہتا۔ بلکہ دیر تک لرزتا رہتا۔

مگر یہ سب کچھ اس کے کانوں کے اندر ہوتا۔ دیکھنے والوں کو کچھ محسوس نہ ہوتا تھا۔ کہ اس بظاہر پرسکون چہرے کے پیچھے دل و دماغ میں کیا ہو رہا ہے۔ وہ تو صرف یہی دیکھتے کہ تنکوں یا دیا سلائی میں روئی لگا کر وہ کانوں میں گھماتا رہتا ہے۔ انگلیوں سے کانوں کو کھجاتا رہتا ہے، ہتھیلیوں سے سہلاتا رہتا ہے اور ان میں تیل گھی یا بادام روغن ڈالتا رہتا ہے۔

ایک رات یہ سرسراہٹ بڑھتے بڑھتے تیز ہوا کی سائیں سائیں بننے لگی۔ وہ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ دونوں ہاتھ سے سر سہلانے لگا۔ کبھی اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگتا، کبھی گردن ہلا کر سر کو اِدھر اُدھر جھٹکے دیتا، کبھی لیٹ کر پہلو بدلتا رہتا۔۔۔ ساری رات اسی طرح گزر گئی۔

اس کے بعد جب بھی وہ کبھی نہ مرنے والے کی موت کی خبر سنتا تو وہ ایسی ہی راتیں کاٹنے لگتا۔ خبر زیادہ بری ہوتی تو سرسراہٹ بڑھتے بڑھتے تیز

ہوااور پھر آندھی کا شور بن جاتی۔ جس میں ان چیخوں کی دبی گھٹی بازگشت ہوتی جو غیر فطری موت میں بلند ہوتی ہیں۔ کئی دفعہ رات کے اندھیرے میں یوں لگتا کہ کمرے کی دیوار یا کونہ پھٹ گیا ہے۔ اور اس میں سے آندھی کا مرغولہ کمرے کے درمیان آ گیا ہے۔ جس میں کٹے ہوئے سر، بازو، ٹانگیں اڑ رہی ہیں اور اس کی گردش میں آہیں اور سسکیاں ہیں اور وہ دیوانہ وار گھوم رہا ہے۔ وہ سہم کر دیکھتا رہتا، سکڑ سکڑ بیٹھ جاتا۔ سمٹ کر منہ اور آنکھیں چھپا لیتا۔ اور جب وہ مرغولہ چلا جاتا تو حیرت سے دیکھتا کہ کمرے میں کوئی تنکا یا کاغذ تک نہیں ہلا۔ بلکہ ہر چیز حسبِ سابق ساکت و جامد ہے۔

ایک دن وہ صبح اٹھا تو بہت پریشان تھا۔ بار بار گھر والوں سے پوچھتا۔

''آسمان پر بادل تو نہیں ہیں؟''

وہ اسے چمکدار سورج اور دھوپ کی تفصیلات بتاتے تو وہ اپنی آنکھوں کو ہاتھوں سے رگڑ رگڑ کر بار بار آسمان کی طرف دیکھتا۔

دو چار دن اسی کیفیت میں گزرے تو وہ مسجد میں چلا گیا۔ مولوی جی! کوئی دم درود اوپر کی طرف پھونکیں۔۔۔ ان کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔۔۔ انہیں اپنی منزل پر بھیجیں''

''کیوں؟ کیا ہوا'' مولوی صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

''پہلے میں صرف سنتا تھا جی، مگر اب میں انہیں دیکھ سکتا ہوں۔۔۔ ان گنت۔۔۔ اوپر تلے۔۔۔ سایوں کے ڈھیر۔۔۔ بالکل گھنے بادلوں کی طرح۔۔۔ ان کی وجہ سے اب مجھے آسمان نظر نہیں آتا۔''

مولوی صاحب بڑے پیار سے اسے اپنے حجرے میں لے گئے۔ کچھ پڑھنے کے بعد پانی پر دم کیا اور اسے پلا دیا۔۔۔ ساتھ ہی ایک تعویذ اور بھی دے دیا۔ ''تم ہر جمعرات کو صبح کی نماز کے بعد مجھ سے دم کرا لیا کرو۔ یہ آسیب بہت ڈھیٹ لگتا ہے۔۔۔ اللہ فضل کرے گا۔''

بڑے احترام اور عقیدت سے اس نے وہ تعویذ گلے میں لٹکا لیا۔

دن گزرتے گئے۔۔۔ اور بہت سے لوگوں کی نااہلی تساہل یا بددیانتی سے بہت سے ایسے لوگ مرتے بھی گئے جنہیں ابھی مرنا نہیں تھا۔ اور خدائی قانون کی خلاف ورزی ہوتی رہی۔

خلوص بھرے تین چار تعویذ اللہ سے فریاد کرتے رہے۔

اب وہ اپنے گنجے سر اور ننگے پاؤں سے شہر کی سڑکوں اور گلیوں میں آوارہ پھرتا رہتا ہے۔ وہ مختلف مقامات اور زاویوں سے اوپر دیکھتا ہے کہ شاید کسی شگاف میں سے آسمان نظر آ جائے یا کسی سوراخ میں سے روشنی کی کرن ٹپک پڑے۔

گھر والے بھی کیا کریں۔۔۔ کھچا کھچ بھرے پاگل خانے میں کوئی جگہ ہی نہیں۔

☆

بقیہ

فکر و خیال

''لمحے'' ان کی ڈائری کا نام ہے اور اس میں 1971 میں ہونے والے مشرقی پاکستان کے شب و روز کے لمحات کی روداد قلم بند کی ہے۔ ستمبر 1965ء کی پاک بھارت جنگ کے پس منظر میں لکھے گئے افسانوں کے مجموعے ''رگ سنگ'' کو چھ ستمبر کا ادبی انعام مل چکا ہے۔ ''ریزے'' میں 1971 کی پاک بھارت جنگ کے پس منظر میں لکھے گئے افسانے شائع کئے گئے ہیں۔ ''محدب شیشہ'' ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے جس میں جابر معاشرے اور جابر اقدار میں فرد کے المیے بیان کئے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ کھلونے (ناولٹ)، تکون (ڈرامے) سرراہے (انشائیے افسانے) اور ان کے تازہ افسانوی مجموعے کا نام ''سالگرہ'' ہے۔ جس میں روایت سے الجھنے والی سوچ کی گونج سنائی دیتی ہے۔

مسعود مفتی نے زندگی سرکاری ملازمت میں بسر کی ہے اور کئی اہم عہدوں پر متمکن رہے لیکن ان کے اندر جو فنکار چھپا ہوا تھا اس نے انہیں چین لینے نہیں دیا اور انہوں نے اپنی سرکاری مصروفیات کو نبھانے کے ساتھ ساتھ اپنے قلم کے ساتھ کئے ہوئے عہد کو بھی نبھایا اور ان کا تازہ افسانوی مجموعہ دیکھ کر نظر آتا ہے کہ ابھی وہ تازہ دم ہیں اور ان کے بارے میں ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کی رائے بڑی وزن دار لگتی ہے وہ لکھتے ہیں کہ ''مسعود مفتی کی منفرد نظر اور فکر کے مخصوص پہلو کا تعین ان کے پہلے افسانوی مجموعے ''محدب شیشہ'' سے ہو چکا ہے۔ وہ زندگی کی اہم قدروں کو ایک مفکر کی نظر سے دیکھنے والے اور ان کو افسانہ کی تنگنائے میں نہایت خوبی سے رکھ دینے والے مانے جا چکے ہیں اور اس سلسلے میں وہ آپ اپنی مثال بھی ہیں۔ مسعود مفتی کو اگر فرد کا مفکر اور اسی کی حالت کا عکاس کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اور اس معنی میں وہ تمام اردو افسانہ نگاروں سے الگ نظر آتے ہیں۔ اور یہ بات بڑی حد تک درست بھی ہے۔ مسعود مفتی نے جس خاموشی اور ثابت قدمی سے اپنا ادبی سفر جاری رکھا ہے وہ ان کی مستقل مزاجی کا ثبوت ہے اور ہمیں امید ہے کہ آنے والے دور میں وہ ہمیں اپنی مزید انمول تخلیقات سے بھی نوازیں گے۔

گنجلک

ڈ
ر
ا
م
ہ

مسعود مفتی

افضل: ملزم
امینہ: ملزم کی بیوی
سیمیں: ملزم کی کالج کی دوست
غلام رسول: ملزم کا چچا اور سُسر
غلام محمد: ملزم کا باپ
ملزم کی والدہ
وکیل استغاثہ
وکیلِ صفائی
سب انسپکٹر
جج

پہلا سین

(کمرۂ عدالت، ذرا اُونچے پلیٹ فارم پر جج بیٹھا ہے۔ عمر پچاس برس کے لگ بھگ۔ چہرے پر سنجیدگی، سامنے لکڑی کا کٹہرہ ہے، جس میں بائیں طرف ملزم افضل کھڑا ہے۔ پچیس برس کا نوجوان چہرے پر پریشانی اور مُرجھاہٹ۔ دائیں طرف دوسرے کٹہرے میں پولیس کا سب انسپکٹر بطور گواہ کھڑا ہے۔ اس کے پاس وکیل استغاثہ ہے اور ملزم کے پاس وکیل صفائی کھڑا ہے۔ عدالت میں آٹھ دس لوگ اور وکیل بیٹھے ہیں۔ گواہوں میں سے کوئی بھی اندر موجود نہیں۔ پردہ اُٹھنے پر گواہ عدالت سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے۔)

سب انسپکٹر: جی ہاں، میں اُس وقت تھانیدار تھا اور اس کیس کی تفتیش میں نے ہی کی تھی۔

وکیلِ استغاثہ: یہ کتنے عرصہ کا واقعہ ہے۔

سب انسپکٹر: کوئی چھ ماہ کا۔

وکیل استغاثہ: ساری تفصیلات بتائیے۔

سب انسپکٹر: میں صبح تھانے میں بیٹھا ڈاک دیکھ رہا تھا کہ مجھے ایک چٹھی ملی، لکھنے والی ایک خاتون تھی۔ مسماۃ امینہ، چٹھی راولپنڈی سے آئی تھی۔ مسماۃ امینہ نے لکھا تھا کہ میرے خاوند نے چار تاریخ کو موضع ستروال میں بس اسٹاپ کے قریب ایک سالہ بچے کو قتل کر کے اس کی لاش مسجد کے ساتھ والے کماد کے کھیت میں پھینک دی تھی۔ خط ملنے پر میں نے وہاں کے تھانیدار سے رابطہ قائم کیا تو معلوم ہوا کہ پانچ تاریخ کو اسی مقام سے ایک سالہ بچے کی لاش ملی تھی جسے مقامی لوگوں میں سے کوئی شناخت نہ کر سکا تھا اور پوسٹ مارٹم کے بعد اسے دفن کیا گیا۔ متوفی کے کپڑے، جوتا اور گلے کا تعویذ محفوظ ہیں۔ میں نے یہ چیزیں منگوائیں، خط میں دیے ہوئے پتے کے مطابق مسماۃ امینہ سے جا کر ملا اور بعد از تفتیش ملزم کو گرفتار کر لیا اور چالان عدالت میں پیش کیا۔ (گواہ خاموش ہو جاتا ہے، جج کچھ لکھتا ہے)۔

وکیل صفائی: مائی لارڈ جرح کی اجازت چاہتا ہوں۔

(جج سر ہلاتا ہے۔ وکیل صفائی گواہ کی طرف آتا ہے، وکیل ادھیڑ عمر کا آدمی ہے سر کے بال کھچڑی، سنہری فریم والا چشمہ لگاتا ہے۔ بات کے انداز میں طنز کا رنگ غالب ہے اور سمجھا سمجھا کر سوال کرتا ہے)

وکیل صفائی: تھانیدار صاحب۔ یہ بتایئے آپ نے ملزم کو گرفتار کہاں کیا تھا؟

سب انسپکٹر: مسماۃ امینہ نے ملزم کے گھر کا پتہ دیا تھا جو میرے تھانے کے علاقے میں تھا۔ میں وہاں گیا دروازہ کھٹکھٹانے پر ملزم باہر آیا اور میں نے اس کو گرفتار کر لیا۔

وکیل صفائی: کیا اس نے کوئی مزاحمت کی؟

سب انسپکٹر: بالکل نہیں۔

وکیل صفائی: جب آپ نے تھانے میں پوچھ گچھ کی تو اس کا ردِ عمل کیا تھا؟

سب انسپکٹر: اس نے فوراً اقبالِ جرم کر لیا تھا۔

وکیل صفائی: کیا اُس نے کچھ اور کہا تھا؟

سب انسپکٹر: (سوچ کر) اُس نے بتایا تھا کہ یہ ایم اے پاس ہے اور اچھی ملازمت پر ہے۔ (وکیل صفائی عدالت کی طرف منہ کر کے ذرا جھکتا ہے)

وکیل صفائی: بس می لارڈ!

(سب انسپکٹر سلیوٹ کرتا ہے اور کٹہرے سے باہر نکل کر لوگوں میں بیٹھ جاتا ہے)۔

جج: دوسرا گواہ پیش کیا جائے۔

(باہر اُردلی کی آواز سنائی دیتی ہے "غلام رسول گواہ"۔۔۔۔ غلام رسول گواہ اندر آتا ہے۔ چھوٹے قد کا بوڑھا سا مرد ہے۔ سفید نوکدار داڑھی، اچکن اور ٹوپی پہنے ہوئے چہرے سے دنیادار اور سمجھدار آدمی نظر آتا ہے۔ تیز تیز بولتا ہے۔ کٹہرے میں کھڑا ہوتا ہے تو وکیل استغاثہ قریب جا کر کچھ کہتا ہے اور گواہ عدالت کی طرف منہ کر کے کہتا ہے)

غلام رسول: جو کہوں گا ایمان سے سچ کہوں گا۔

وکیل استغاثہ: آپ کا نام؟

غلام رسول: غلام رسول

وکیل استغاثہ: ملزم سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟

غلام رسول: یہ میرا بھتیجا ہے اور داماد بھی۔ اس کی شادی دو سال پہلے میری لڑکی امینہ سے ہوئی تھی۔

وکیل استغاثہ: پھر۔۔۔؟

چچا: کوئی چھ ماہ پہلے میں نے ملزم کو اپنی لڑکی کے ساتھ راولپنڈی سے روانہ کیا تھا۔انہیں لاہور جانا تھا اور میں دو چار رشتے داروں کے ساتھ انہیں بس سٹاپ پر چھوڑنے آیا تھا۔بس روانہ ہونے کے بعد میں دفتر چلا گیا۔شام کو مجھے کہیں جانا تھا۔دفتر سے وہاں گیا کافی رات گئے واپس آیا تو امینہ گھر میں تھی۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ افضل نے اس کے بچے کو قتل کر دیا تھا اور وہ بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگ آئی تھی۔ملزم کا والد غلام محمد میرا چھوٹا بھائی ہے۔ میں نے اسے آنے کے لیے لکھ دیا۔مگر اس کے آنے سے پہلے امینہ پولیس کو خط لکھ چکی تھی اور جب پولیس والے آئے تو میں نے سارا ماجرا ان کو بتا دیا۔

(وکیل استغاثہ عدالت کی طرف جھک کر بیان کے خاتمہ کا اظہار کرتا ہے اور دو قدم پیچھے ہٹ جاتا ہے۔وکیل صفائی گواہ کے پاس آتا ہے)

وکیل صفائی: غلام رسول صاحب کیا آپ ہمیں بتا سکیں گے کہ آپ کی لڑکی امینہ کے اپنے خاوند یعنی ملزم کے ساتھ کیسے تعلقات تھے؟

چچا: ان کی آپس میں ناچاقی تھی۔

وکیل صفائی: (ذرا قریب ہو کر) شادی کے کتنے عرصہ بعد شروع ہوئی؟

چچا: تین چار دن بعد۔

وکیل صفائی: کتنا عرصہ رہی؟

چچا: اس کے بعد یہ علیحدہ ہی رہے۔شادی کے چند روز بعد لڑکی لاہور سے میرے پاس راولپنڈی آ گئی اور پھر ڈیڑھ سال وہیں رہی۔

وکیل صفائی: تو پھر یہ چار چھ رشتہ داروں کے ساتھ لڑکی اور داماد کو بس پر چھوڑنے کی نوبت کیسے آئی؟

چچا: دراصل ان کا راضی نامہ ہو گیا تھا جس کے لیے ملزم کراچی سے ہمارے ہاں راولپنڈی آیا ہوا تھا۔راضی نامہ کے بعد میں لڑکی کو اس کے ساتھ لاہور بھیج رہا تھا۔اسی سلسلہ میں رشتہ دار بھی موجود تھے۔

وکیل صفائی: اب آپ تکلیف کر کے ہمیں یہ بتا دیں کہ ان کی ناچاقی کیوں ہوئی تھی۔

چچا: (بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہے پھر ذرا توقف کے بعد) گھروں میں ناچاقیاں ہو ہی جاتی ہیں۔

وکیل صفائی: جی ضرور ہوتی ہیں۔خود میرے اپنے گھر میں ہوتی ہیں۔آپ کے یہاں بھی ہوتی ہوں گی۔لیکن کوئی وجہ تو ہمیشہ ہوتی ہے نا چھوٹی یا بڑی!

چچا: (خاموش رہتا ہے)

وکیل صفائی: بھائی یہ باتیں تو آپ ہی بتائیں گے نا۔آپ کی لڑکی کا معاملہ ہے۔آپ کے داماد کا قصہ ہے۔جھگڑے کی وجہ سے آپ کی لڑکی ڈیڑھ برس آپ کے یہاں رہی ہے۔آپ نے عزیزوں کی موجودگی میں راضی نامہ کرایا ہے۔آپ سے بہتر آدمی کون مل سکے گا ہمیں یہ سب کچھ بتانے کے لیے۔

چچا: دراصل ملزم شادی سے پہلے کسی اور لڑکی سے پیار کرتا تھا جو اس کے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی۔

وکیل صفائی: جی نہیں یہ وجہ تو نہیں۔

چچا: یہی ہے۔

وکیل صفائی: چلیے ممکن ہے ایسا ہو لیکن پھر بھی آپ اصل بات نہیں بتا رہے۔

چچا: میں جھوٹ تو نہیں کہہ رہا، یہ بھی حقیقت ہے۔

وکیل صفائی: یہ حقیقت ہو گی مگر میں دوسری بات پوچھتا ہوں۔

(جج کھنکارتا ہے، وکیل اس کی طرف دیکھتا ہے)

جج: وکیل صاحب، آپ ملزم پر جرح کر سکتے ہیں مگر اس سے بحث نہیں کر سکتے اور نہ ہی بزور کوئی بیان اُگلوا سکتے ہیں۔

وکیل صفائی: بہتر جناب والا۔میں یہ بات یہیں چھوڑتا ہوں۔(گواہ سے) آپ کی لڑکی کی تعلیم کیا ہے؟

چچا: وہ بی۔اے میں پڑھتی تھی۔جب اسے فورتھ ایئر میں کالج چھوڑنا پڑا۔

وکیل صفائی: کیوں چھوڑنا پڑا؟

چچا: میری بیوی کے فوت ہو جانے پر گھر کو دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔اس لیے میں نے اسے کالج سے اُٹھا لیا۔

وکیل صفائی: وہ کب فوت ہوئیں؟

چچا: کوئی چھ سال پہلے۔

وکیل صفائی: اور امینہ کی شادی آپ نے کب کی؟

چچا: (سوچ کر اس کے فوت ہونے کے کوئی چار سال بعد۔

وکیل صفائی: تو ان چار سالوں میں یہ لڑکی گھر میں ہی رہتی ہو گی؟

چچا: جی ہاں، سارا گھر چلاتی تھی۔

وکیل: جی! بالکل ٹھیک ہے۔ماشاء اللہ ذمہ دار بچی تھی! تو گھر میں تو اور لوگ بھی ہوتے ہوں گے۔

چچا: میری چھوٹی لڑکی تھی۔

وکیل: خُوب! تو وہ بھی سارا دن گھر میں ہوتی تھی یا پڑھتی تھی؟

چچا: جی نہیں وہ دن کو کالج جاتی تھی اور باقی وقت گھر میں ہوتی تھی۔

وکیل: جی جی۔بالکل ٹھیک ہے۔خیر چھوڑیئے اس بات کو۔اچھا یہ بتایئے آپ کب سے راولپنڈی رہتے ہیں؟

چچا: کوئی پچیس برس سے۔

وکیل: رہائش ایک ہی جگہ رہی ہے یا بدلتے رہے ہیں؟

چچا: ایک ہی جگہ، یہ ہمارا جدی مکان ہے۔

وکیل: ماشاء اللہ تو پھر آپ قاضی صاحب کو بھی جانتے ہوں گے۔وہ قریباً اتنا ہی عرصہ آپ کے ہمسائے تھے۔

چچا: جی۔

وکیل: ان کا ایک لڑکا نثار بھی تھا جو غالباً ملزم کا ہم عمر تھا۔

چچا: (ذرا بے چینی سے) جی۔

وکیل: ملزم آپ کا بھتیجا ہے۔ اکثر یہ آپ کے یہاں آتا ہوگا۔ کبھی دن بھر کے لیے۔ کبھی ہفتہ کے لیے۔ اور کبھی زیادہ بھی۔

چچا: جی ہاں، یہ بچے لمبی چھٹیاں میرے ہاں ہی گزارتے تھے۔

وکیل: ملزم ان دنوں نثار سے بھی ملتا ہوگا؟

چچا: سب ہی ہمسایوں کے بچے اکٹھا کھیلتے تھے۔

وکیل: اور آپ کی بچی امینہ بھی بچپن میں ان کے ساتھ کھیلتی ہوگی۔

چچا: کھیلتی ہوگی، بچے جو ہوئے۔

وکیل: (قدرے خاموش رہ کر) قبلہ بُرا نہ مانیے گا۔ لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ امینہ کی وجہ سے نثار اور ملزم میں رقابت تھی؟

چچا: (درشتی سے) مجھے کیا معلوم؟

وکیل: تو کیا یہ بھی نہیں معلوم کہ امینہ نے ملزم سے کئی دفعہ صاف صاف کہا تھا کہ وہ اس سے نفرت اور نثار سے محبت کرتی ہے؟

چچا: دیکھئے صاحب میں عدالت میں گواہی دینے آیا ہوں، کسی فلم کی شوٹنگ پر نہیں آیا۔

وکیل: اوہو! آپ تو ناراض ہو گئے۔ چلئے چھوڑیئے اس قصّے کو۔ ویسے نثار آج کل کہاں ہے؟

چچا: (غصّے میں) کہاں ہے کیا مطلب؟ وہ تو فوت ہو چکا ہے۔ اسکوٹر کے حادثے میں۔

وکیل: (قریب آ کر معنی خیز انداز میں) امینہ کی شادی سے کتنا عرصہ پہلے۔

چچا: (سیخ پا ہو کر) کچھ روز پہلے۔ اب یہ بھی کوئی سوال ہے پوچھنے والا۔

وکیل: چلیئے صاحب نہیں پوچھتے۔ (عدالت کی طرف منہ کر کے جھکتا ہے) بس می لارڈ۔

(گواہ کٹہرے میں سے باہر آتا ہے تو کمرے کے باہر سے اردلی کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ''مسماۃ امینہ بی بی گواہ''۔ گواہ غلام رسول آگے بڑھ کر وکیل استغاثہ کے کان میں کچھ کہتا ہے۔ دونوں کچھ مشورہ کرنے کے بعد وکیل آگے آ کر عدالت سے مخاطب ہوتا ہے)

وکیل: جناب والا! میں لڑکی کے والد کی طرف سے درخواست کرتا ہوں کہ عدالت اس گواہ کا بیان نہ لے، ملزم چونکہ تفتیش کے دوران اقبال جرم کر چکا ہے۔ اس لیے زیادہ گواہوں کی ضرورت نہیں، جو سوالات اس لڑکی سے پوچھنے ہیں، وہ دوسرے گواہوں سے پوچھے جا سکتے ہیں۔

(وکیل صفائی اپنی عینک ہاتھ میں پکڑے خاموش رہتا ہے۔ جج اس کی طرف دیکھتا ہے تو عینک لگا کر پہلے غلام رسول اور پھر وکیل استغاثہ کی طرف طنز سے دیکھتا ہے پھر عدالت سے مخاطب ہوتا ہے۔)

وکیل صفائی: جناب والا مقدمہ کی مسل یہ بتاتی ہے کہ مسماۃ امینہ ملزم کی بیوی ہے اور واحد عینی گواہ ہے اگر وکیل استغاثہ کوئی اور گواہ ایسا پیدا کر سکتے ہیں جو قتل کے واقعات بتا سکے یا ملزم کی بیوی تصور ہو سکے میں تو محترمہ سے کوئی سوال نہ کروں گا۔

(جج، وکیل استغاثہ کی طرف مسکرا کر دیکھتا ہے وہ ڈھیلا سا ہو کر غلام رسول سے کانا پھوسی کرتا ہے۔ باہر سے اردلی کی دوبارہ آواز آتی ہے۔ ''مسماۃ امینہ گواہ'' وکیل استغاثہ پھر عدالت کی طرف متوجہ ہوتا ہے)

وکیل استغاثہ: تو اس حالت میں جناب والا۔ لڑکی کا بیان آخر میں لیا جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ تفصیلات دوسرے گواہوں سے مل جائیں اور لڑکی کو کم از کم پریشانی ہو۔

جج: درخواست منظور ہے۔

وکیل استغاثہ: (جھک کر آداب بجا لاتا ہے) تو اب جناب والا ملزم کی والدہ کی شہادت پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

(جج سر ہلا کر اجازت دیتا ہے۔ ایک معمر عورت دروازے میں سے نمودار ہوتی ہے۔ اسے ایک مرد اور ایک عورت سہارا دیے ہوئے ہیں اور وہ بہ مشکل آگے بڑھ رہی ہے۔ چہرے پر گہرے کرب کے آثار ہیں اور وہ بہت ضبط کر کے چل رہی ہے۔ کٹہرے میں داخل ہوتے ہی لڑکھڑاتی ہے، پھر گھبرا کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ آنکھیں فرش پر ہیں اور وہ پریشانی سے بار بار سر پر دوپٹہ درست کرتی ہے)

وکیل: بی بی کیا ملزم آپ کا لڑکا ہے؟

والدہ: (سر اٹھائے بغیر، ہونٹ بھینچ کر اثبات میں سر ہلاتی ہے)

وکیل: آپ اس کے جرم کے بارے میں جو کچھ جانتی ہیں، عدالت کو بتائیں۔

(عورت دونوں ہاتھوں سے کٹہرے کو زور سے پکڑ لیتی ہے۔ اس کے بازو کانپ رہے ہیں۔ تھوڑی دیر زمین کو دیکھتی ہے پھر آہستہ آہستہ نظر اُٹھا کر ملزم کو دیکھتی ہے اور ایک ٹک دیکھتی رہتی ہے۔ وکیل استغاثہ ذرا قریب ہو جاتا ہے۔ عورت کی آنکھوں میں آنسو پھوٹ پڑتے ہیں۔ اس کا سارا جسم سسکیاں دبانے کی کوشش میں ہلتا ہے اور پھر وہ بلک بلک کر روتی ہوئی کٹہرے پر سر ٹیک دیتی ہے۔ جج گھنٹی بجاتا ہے اور اردلی کو پانی لانے کا اشارہ کرتا ہے۔ وہ بھاگ کر پانی لاتا ہے مگر عورت ہاتھ سے گلاس پرے ہٹا دیتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے آپ پر قابو پا کر سیدھی کھڑی ہو جاتی ہے۔ وکیل استغاثہ نرمی سے اپنا سوال دہراتا ہے)

والدہ: (لمبی سسکی لے کر دونوں ہاتھ جوڑ دیتی ہے) مجھ پر رحم کرو۔ تم سب

کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔خدارا مجھ پر رحم کرو۔میں کس طرح اپنے بیٹے کے خلاف شہادت دے کر اسے خود ہی پھانسی پر چڑھاؤں۔(روتی ہوئی کٹہرے پر جھک جاتی ہے)

(عورت کی چیخیں اور سسکیاں عدالت میں گونج رہی ہیں۔جج اور وکیل پریشان نظر آتے ہیں۔دونوں وکیل آپس میں مشورہ کرتے ہیں۔پھر وکیل استغاثہ گواہ غلام رسول سے مشورہ کرتا ہے چند لمحے سوچ کر عدالت سے مخاطب ہوتا ہے)

وکیل استغاثہ: جناب والا،میرے خیال میں گواہ اس قابل نہیں کہ شہادت دے سکے۔میں اجازت چاہتا ہوں کہ اسے ترک کر دیا جائے۔

(جج سر ہلا کر اجازت دیتا ہے اور قلم اٹھا کر کچھ لکھتا ہے۔وکیل صفائی آگے آتا ہے،بڑے ترس سے ماں کی طرف دیکھتا ہے۔آہستہ سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر کہتا ہے''بی بی،آپ آرام کریں ہم لوگ آپ کے بیٹے کو بچانے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔آپ گھر جا کر دعا کریں''۔عورت فرط جذبات سے اس کا ہاتھ تھام لیتی ہے۔کچھ کہنا چاہتی ہے مگر فرط گریہ سے بول نہیں سکتی۔پھر انتہائی تشکّر بھرے انداز میں وکیل کی طرف دیکھتی ہے اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی آنسو بھری آنکھوں سے لگا لیتی ہے۔سہارا دے کر اندر لانے والے لوگ اسے تھام کر ہولے ہولے باہر لے جاتے ہیں اگلا گواہ آتا ہے اور کٹہرے میں کھڑا ہو جاتا ہے)

وکیل استغاثہ: ملزم سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟

گواہ: میں اس کا باپ ہوں۔(وہ ملزم سے آنکھیں چراتا ہے)

وکیل استغاثہ: ملزم نے آپ سے کیا کہا تھا؟

باپ: (خالی الذہن سا ہو کر) کب؟

وکیل: (بے صبری سے) میرا مطلب ہے اپنے جرم کے بارے میں؟

باپ: (سر نیچا کر کے اپنے پاؤں کو دیکھتا ہے) اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے بچے کو مار ڈالا ہے اور اب پولیس کا انتظار کر رہا ہے۔یہ چاہتا تھا کہ میں پولیس کو اطلاع دوں لیکن۔۔۔م۔۔۔میں۔۔۔اپنے آپ کو اس بات پر آمادہ نہ کر سکا۔پھر مجھے بھائی جان کی طرف سے تار ملا۔میں راولپنڈی جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ پولیس نے اسے گرفتار کر لیا۔

وکیل استغاثہ: (جھک کر) بس جناب والا۔

(وکیل صفائی آگے آتا ہے اور جرح شروع کرتا ہے)

وکیل صفائی: دیکھئے قبلہ،ملزم نے آپ کو یہ نہیں بتایا تھا کہ اس نے قتل کیوں کیا تھا؟

باپ: (نفی میں سر ہلاتا ہے)

وکیل صفائی: آپ نے پوچھا نہیں؟

باپ: پوچھتا کیا؟ مجھے سب معلوم تھا۔

وکیل: ذرا عدالت کو بتا دیجیے۔

باپ: ملزم بچے سے سخت نفرت کرتا تھا،کیونکہ اس کی شادی ہوئی تو بچہ اس سے پہلے کا تھا۔

وکیل صفائی: یعنی جب اس کی شادی ہوئی تھی تو بچہ لڑکی کی گود میں تھا؟

باپ: (وقفے کے بعد) جی نہیں۔

وکیل: تو؟

باپ: بچہ شادی کے پانچ ماہ بعد پیدا ہوا تھا۔

وکیل صفائی: (الفاظ چبا کر) پانچ ماہ بعد۔۔۔تو ملزم کا ردِّعمل کیا تھا؟

باپ: وہ اس وقت تک بیوی کو چھوڑ کر کراچی چلا گیا تھا۔

وکیل صفائی: بیوی کو کیوں چھوڑا۔

باپ: شادی کے تیسرے دن اُسے پتہ چل گیا تھا کہ بیوی اُمید سے ہے تو وہ طلاق دینا چاہتا تھا لیکن ہم لوگوں نے منع کیا تو وہ اسے چھوڑ کر کراچی چلا گیا، جہاں وہ ملازم تھا۔

وکیل: کیا آپ گھر والوں کو پہلے سے پتہ تھا کہ لڑکی اُمید سے ہے؟

باپ: جی ہاں۔

وکیل: کیا آپ بتا سکیں گے کہ شادی کن حالات میں ہوئی؟

باپ: بھائی جان کی بیوی کی وفات کو چار سال گزر گئے تھے جب ایک دن بھائی جان نے بتایا کہ گھر میں نگرانی نہ ہونے کی وجہ سے امینہ کے تعلقات ہمسایوں کے لڑکے نثار سے ہو گئے تھے۔انھیں تب پتہ چلا جب پانی سر سے گزر چکا تھا۔انھوں نے نثار کے والد کو راضی کر لیا کہ نثار اور امینہ کی شادی کر دی جائے۔مگر جب یہ فیصلہ ہوا تو چند دن بعد نثار سکوٹر کے حادثے میں ہلاک ہو گیا۔تب بھائی جان میرے پاس آئے اور ہمیں اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ امینہ کی شادی افضل سے کر دی جائے۔

وکیل صفائی: کیا آپ نے شادی سے پہلے ملزم کو ان حالات سے آگاہ کیا تھا۔

باپ: جی نہیں۔اس حالت میں وہ شادی سے انکار کر دیتا جو ہم اس وقت کے حالات میں برداشت نہ کر سکتے تھے۔

وکیل: لیکن کیا اس کی والدہ کو علم تھا؟

باپ: جی ہاں میری بیوی امینہ کی سگی خالہ تھی اور بہن کی وفات کے بعد وہ بھی چاہتی تھی کہ امینہ کا مستقبل تباہ نہ ہو۔

وکیل صفائی: شادی کے بعد حالات کیسے رہے؟

باپ: افضل نے بیوی سے قطع تعلق کر لیا اور کراچی چلا گیا۔بچے کی پیدائش پر بھی نہیں آیا۔ہم سب اس پر زور ڈالتے رہے لیکن یہ نہ مانا۔بالآخر ڈیڑھ سال بعد مان گیا۔ہمارے کہنے پر گھر آیا،سسرال جا کر لڑکی کو لایا مگر راستے میں بچے کو قتل کر دیا۔

وکیل: جس دن ملزم کو پہلی بار پتہ چلا تھا تو اس کا ردِعمل کیا تھا؟

باپ: شادی کے تیسرے دن یہ صبح ہی صبح ہمارے کمرے میں آیا۔ اس کا چہرہ بالکل سفید تھا اور یہ کانپ رہا تھا۔ غالباً یہ اس کشمکش میں تھا کہ بات ہمیں کیسے بتائے۔ اس کا خیال تھا کہ ہمیں اس بات کا پتہ نہیں اور یہ غلطی نادانستہ ہوئی ہے مگر جب ماں نے بٹھا کر کہا کہ اسے علم ہے کہ وہ کیا کہنے آیا ہے تو افضل بالکل حیران ہو گیا۔ پھر میں نے اسے ساری بات بتائی۔

وکیل صفائی: پھر؟

باپ: پھر یہ بالکل ساکت ہو گیا، جیسے پتھر کا بُت ہو۔

وکیل صفائی: کیا آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اُسے شدید صدمہ ہوا تھا؟

باپ: یقیناً۔ اسے اتنا صدمہ ہوا تھا کہ اس کا رنگ بالکل نیلا پڑ گیا تھا۔ میں نے چپکے سے جا کر دلہن کو چھت پر بھیج دیا تا کہ اسے شدتِ جذبات میں کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔

وکیل صفائی: آپ نے اسے نثار کا نام بھی بتا دیا تھا؟

باپ: جی ہاں۔

وکیل صفائی: پھر؟

باپ: پھر یہ کمرے میں جا کر لیٹ گیا اور کئی گھنٹے گُم سُم پڑا رہا۔ دوپہر کو اس نے کہا میں بیوی کو طلاق دے دوں گا۔ تب اس کی والدہ نے کہا کہ وہ اپنی مری ہوئی بہن کو کیا منہ دکھائے گی۔ اور ہم دونوں نے مل کر اسے بہت سمجھایا اور بہت زور ڈالتے رہے۔

وکیل صفائی: آپ نے کس طرح زور ڈالا؟

باپ: میری بیوی نے کہا تھا کہ اگر تم طلاق دو گے تو میں زہر کھا لوں گی۔

وکیل صفائی: پھر؟

باپ: پھر یہ خاموش ہو گیا۔ لیکن اگلی صبح جب ہم اٹھے تو یہ گھر سے غائب تھا۔ تیسرے دن پتہ چلا کہ یہ واپس کراچی چلا گیا ہے۔ جہاں اس کی ملازمت تھی چند دن بعد ہم نے دلہن کو میکے بھیج دیا۔

وکیل صفائی: کیا آپ نے بعد میں بھی صلح کی کوشش کی؟

باپ: مسلسل کوشش کرتے رہے اسے کئی خط لکھے۔ دو ایک دفعہ میں گیا بھی، لیکن یہ نہ مانتا تھا اور کہتا تھا کہ دفتر والے مجھے بے غیرت کہتے ہیں۔

وکیل: آپ کا کیا خیال ہے لوگوں کا یہ طعنہ قتل کا باعث بن سکتا ہے؟

باپ: جی ہاں۔ بلکہ اس طعنے کی وجہ سے وہ راضی نامہ نہ کرتا تھا اور پھر اسی طعنے کو دھونے کے لیے اُس نے قتل کیا۔

وکیل صفائی: بہت بہت شکریہ۔

(وکیل صفائی جج کو جھک کر آداب کرتا ہے اور دوسری طرف نکل جاتا ہے۔ گواہ باہر نکلنے لگتا ہے۔ تو جج کہتا ہے کورٹ کویسچن (COURT QUESTION) وکیل استغاثہ گواہ کو کٹہرے میں روک دیتا ہے)

جج: جب آپ کو لڑکی کی حالت کا علم تھا تو آپ اپنے لڑکے سے شادی پر کیوں رضامند ہوئے۔

گواہ: (خاموشی سے فرش کو دیکھتا رہتا ہے۔ آنکھیں جھپکتا ہے۔ اور ٹھنڈی سانس لے کر بولتا ہے) جناب والا یہ ایک دن کا فیصلہ نہ تھا۔ یہ تو میرے سارے ماضی نے کیا تھا۔ میرے والدین کوئٹہ کے زلزلے میں مر گئے تھے صرف میں اور میرا بھائی بچے تھے۔ میری عمر پانچ سال کی تھی اور میرا بھائی غلام رسول سولہ برس کا تھا۔ اس نے بہت محنت مشقت کر کے پہلے اپنے آپ پڑھا۔ پھر مجھے پڑھایا اپنی شادی کی، پھر اپنی بیوی کی چھوٹی بہن سے میری شادی کی۔ یہ بالکل میرے باپ کی طرح ہے۔ اس کی مرحومہ بیوی میری ماں کی طرح تھی، جب میں نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے اور اس کی ٹوپی اپنے قدموں میں دیکھی تو۔۔۔تو۔۔۔ آپ ہی بتایئے میں کیا کرتا؟ میرے بھائی، میرے محسن، میرے باپ کی لڑکی مصیبت میں تھی۔۔۔ اسے اس وقت سہارا نہ دیا جاتا تو اس کی واحد منزل رنڈی کا کوٹھا تھی اور وہاں وہ اکیلی نہ جاتی۔ ہمارے سارے خاندان کی عزت ساتھ جاتی۔ مجھے اس کو بچانا تھا۔۔۔ اپنے بھائی کو بچانا تھا۔۔۔ اپنے خاندان کی عزت کو بچانا تھا اور ایک عظیم سانحے پر پردہ ڈالنا تھا۔ ایک زلزلے میں میں نے ماں باپ کھوئے تھے۔ دوسرے زلزلے میں ہمارا سارا خاندان تہس نہس ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا شاید اپنے بیٹے کی قربانی دے کر اس قہر کو روک سکوں۔ مگر۔۔۔ (وہ آنکھیں میچ کر نفی میں سر ہلاتا ہے) بیٹا بھی گیا۔۔۔ خاندان بھی گیا۔۔۔ عزت بھی گئی۔۔۔ (زور سے کٹہرے پر دوہتڑ مار کر) سب کچھ گیا۔

(گواہ تیزی سے مڑ کر باہر چلا جاتا ہے۔ عدالت میں سناٹا ہے۔ چند لمحوں بعد وکیل صفائی آگے بڑھ کر جج سے مخاطب ہوتا ہے)

وکیل: جناب والا۔ ابھی گواہ کافی باقی ہیں اور عدالت کا وقت ختم ہونے کو ہے میری درخواست ہے کہ ملزم کی بیوی کا بیان بھی آج ہی لے لیا جائے تا کہ جرح کا مقصد پورا ہو سکے۔

جج: اجازت ہے۔

(وکیل استغاثہ باہر اشارہ کرتا ہے۔ اردلی کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ''امینہ بی بی گواہ''۔ بائیس برس کی لڑکی دھیرے دھیرے اندر آتی ہے۔ اور کٹہرے میں رُک جاتی ہے۔ ملزم بے چینی سے پہلو بدلتا ہے۔)

وکیل استغاثہ: آپ ملزم کو پہچانتی ہیں؟

امینہ: (ملزم کی طرف دیکھے بغیر) جی ہاں۔

وکیل: یہ آپ کا شوہر ہے؟

لڑکی: (خاموش رہتی ہے)

وکیل: بتایئے؟

لڑکی: صرف قانون کی نظر میں (بڑی رکھائی سے بولتی ہے)

وکیل: آپ اس کے متعلق عدالت کو کچھ بتائیں گی؟

لڑکی: (خشمگیں انداز میں) کچھ؟؟۔۔۔کچھ بتاؤں گی؟؟ میں تو چیخ چیخ کر ساری دنیا کو بتانا چاہتی ہوں کہ اس ظالم سنگدل نے میرا پھول سا بچہ میری آنکھوں کے سامنے اینٹ سے کوٹ کوٹ کر چپٹا کر دیا۔ یہ تو اتنا مردود ہے کہ اس نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ وہ کلکاریاں مار کر ہنس رہا تھا جب اس نے ضربیں لگانا شروع کیں (دونوں ہاتھ پھیلا کر) جس طرح پیاز کو سل پر رکھ کر کوٹتے ہیں۔اس طرح اس نے میری بچے کو کھیت میں بتے پر ڈال کر اینٹ سے پیس ڈالا۔اس کی نازک پسلیاں کانچ کی چوڑی کی طرح کرچی کرچی ہو گئیں۔(چہرہ ڈھانپ کر رونے لگتی ہے)

وکیل استغاثہ: (قریب آتا ہے) بہن حوصلہ کیجیے۔۔۔ یہ عدالت ہے، ذرا اپنے پر قابو رکھیے۔بس صرف یہ بتادیں کہ قتل کہاں ہوا؟

لڑکی: (سسکیاں آہستہ آہستہ کم ہوتی ہیں اور وہ بولنے کی کوشش کرتی ہے) جب ابا جان نے راولپنڈی سے ہمیں روانہ کیا۔تو اس نے مجھے راستے میں ایک جگہ بس سے اتار لیا کہ کچھ رشتہ داروں سے ملنا ہے۔۔۔۔اور۔۔۔۔جب ہم کھیتوں میں سے گزر رہے تھے۔تو کہنے لگا۔۔۔راضی نامہ کی باقی شرطیں تو سب کو پتہ ہیں لیکن ایک شرط صرف مجھے معلوم ہے جواب تمہیں بتاؤں گا۔۔۔ اس کے بعد تمہاری میری زندگی خوشگوار ہو جائے گی۔۔۔کمینہ۔۔۔ذلیل۔۔۔ جیسے میں اس کے ساتھ رہنے میں بڑی خوش تھی۔۔۔میری تو جُوتی بھی اس کے ساتھ خوش نہ رہ سکتی تھی۔اور یہ بچپن سے جانتا تھا کہ میں اس سے کتنی نفرت کرتی تھی۔

وکیل استغاثہ: بہن یہ باتیں چھوڑیئے، صرف اتنا بتا دیجیے کہ پھر کیا ہوا؟

لڑکی: ہونا کیا تھا؟ اُس نے اینٹ اٹھا کر اس معصوم کا خاتمہ کر دیا، میں شور کرنے لگی تو یہ مجھے چاقو دکھانے لگا مگر میں کماد کے کھیت میں چھپ گئی اور پھر موقع پا کر سڑک سے راولپنڈی جانے والی بس پر بیٹھ کر گھر پہنچ گئی۔

وکیل استغاثہ: آپ نے پولیس کو اطلاع دی تھی؟

لڑکی: گھر پہنچنے سے پہلے ڈاک خانہ گئی تھی۔وہاں سے لفافہ خریدا اور وہیں لکھ کر تھانے دار کو پوسٹ کر دیا تھا۔تب گھر گئی تھی۔

وکیل استغاثہ: بس جناب والا۔

وکیل صفائی: (آگے آتا ہے، چند ثانیے لڑکی کے پاس کھڑا ہو کر اسے دیکھتا ہے پھر جیسے الفاظ ڈھونڈ ڈھونڈ کر بول رہا ہو۔) بیٹی تم کہہ رہی تھیں کہ تمہیں اس سے نفرت ہے مگر تم نے کبھی یہ بھی سوچا کہ اسی نے تم سے شادی کر کے تمہیں ایک عظیم تباہی سے بچالیا ہے اور یہ تم پر احسان تھا۔

لڑکی: تباہی، کون سی تباہی؟؟ (درشتی سے پوچھتی ہے)

وکیل: یہی کہ بن بیاہی ماں بننے کے بعد تو تمہیں کسی کوٹھے پر ہی پناہ مل سکتی تھی نا؟

لڑکی: وہ کیوں؟

وکیل: اور کون سا راستہ باقی تھا؟

لڑکی: وکیل صاحب!! آپ لوگوں کے محدود ذہن یہ سوچ ہی نہیں سکتے کہ بیوی اور طوائف کے درمیان میں کوئی سٹیج ہے۔جس کی شادی نہ ہوئی آپ کو اس کے ذہن میں طوائف کلبلاتی ہوئی نظر آتی ہے۔یہ دراصل اس عورت کا نہیں بلکہ آپ بزرگوں کے ذہن کا فتور ہے۔مجھے کیا ضرورت تھی شادی کرنے کی؟ میں اپنی غلطی پر خود ہی سزا بھگتنے کو بالکل تیار تھی مگر، اپنے انداز میں، عورت تو یادوں کے سہارے کانٹوں پر بھی میٹھی نیند سو سکتی ہے اور میرے پاس نثار کی یادیں ہی نہیں ایک گوشت پوست کی نشانی بھی تھی، میں اسے سینے سے لگا کر تو دوزخ کو بھی گلزار سمجھتی۔مجھے نثار مل گیا تھا۔اس کے بعد زندگی میں کسی اور چیز کی تمنا نہ تھی۔آپ لوگوں کے لیے وہ مر گیا ہے، مگر لیے وہ اب بھی زندہ ہے۔جب تک میری سانس چلتی ہے اس میں نثار کی دھڑکن شامل رہے گی۔میرے بزرگ میرے دل میں جھانک کر تو دیکھتے، کوئی گنجائش ہوتی تو وہاں خاوند گھسیٹتے، مگر انھوں نے تو ڈھلے ڈھلائے فارمولوں سے فرض کر لیا کہ میں اب طوائف ہی بنوں گی

(بیان جاری ہے مگر سین آہستہ آہستہ فیڈ آوٹ ہو جاتا ہے)

دوسرا سین

(پردہ اُٹھتے ہی عدالت کا اجلاس نظر آتا ہے، وکیل صفائی اپنے دلائل پیش کر رہا ہے۔حسب سابق کمرے میں کچھ لوگ بیٹھے ہیں)

وکیل صفائی: جناب والا۔اپنی پچیس سالہ عدالتی زندگی میں، میں نے پہلا کیس دیکھا ہے جس میں سارے مجرمان باہر گھوم رہے ہیں اور ایک بے گناہ پر الزام ہے۔میں جناب والا بے گناہ ہی کہوں گا، باوجود ملزم کے اقبال جرم کے، اس لیے کہ جو کچھ اس نے کیا وہ وہی کرنے پر مجبور تھا اور اگر نہ کرتا تو اس کی زندگی جہنم ہو جاتی اور وہ ایسا فرد بن جاتا جس سے کسی بھی بھیانک عمل کی توقع ہر وقت ہو سکتی۔جناب والا۔چونکہ ملزم اقبال جرم کر چکا ہے اس لیے میں تمام گواہوں پر جرح ایک خاص زاویے سے کرتا رہا ہوں تا کہ عدالت کے سامنے ایک طرف ملزم کی ذہنی کیفیت آجائے، اور دوسری طرف ان طاقت ور محرکات کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس مقدمے میں ایک مجرم نہیں بلکہ کئی مجرم ہیں، سب سے پہلی مجرم اس کی بیوی امینہ ہے جو اپنی غلطی کو اپنا تمغہ بنا کر عمر بھر کے لیے ملزم کے سینے پر لگانا چاہتی تھی۔دوسرا مجرم لڑکی کا باپ ہے جس نے اپنے احسانات اور بھائی کی فرمانبرداری کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی داغدار لڑکی ملزم پر مسلط کر دی۔تیسرا مجرم اس لڑکے کا باپ ہے جو اپنی احسانمندی میں بھول گیا کہ اس کا لڑکا ایک علیحدہ اِکائی ہے۔سوچنے سمجھنے والی اکائی۔محبت اور نفرت کرنے والی اکائی، طعنوں پر شرم کھانے والی اکائی۔باپ نے اپنی زندگی گزار لی تھی، بیٹے کو اپنی زندگی گزارنی تھی۔کار کے فالتو پانچویں پہیے کی طرح اسے ایک پرانی کار سے نہیں جوڑا جا سکتا تھا بلکہ اسے خود زندگی کی حرکت میں رہنا تھا۔اگر آپ کو سزا دینا ہے تو ان مجرمان کو سزا دیں جو یکے بعد دیگرے ایسے حالات پیدا کرتے گئے

جن کا حاصل صرف ایک تھا کہ ملزم اس بچے کو ختم کرے، جو اس کے رقیب کی نشانی بن کر اسے ہر وقت سانپ کی طرح ڈس رہا تھا۔ بے غیرتی کا طعنہ بن کر اس کے رگ و پے میں احساسِ کمتری رچا رہا تھا۔ لوگوں کی ہنسی مذاق کا مستقل نشانہ تھا۔ اس ملزم کو سزا کیوں دیتے ہیں جبکہ اس کو بھی صاف ستھری زندگی بسر کرنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا مرنے والے بچے کو تھا یا اس کی ماں کو ہے یا دیگر گواہوں کو ہے۔ یہ ملزم اعتراف جرم کے باوجود بے گناہ ہے، معصوم ہے، کیونکہ اسے قسمت نے متعدد گناہوں کے سنگم میں ڈبکی دی۔ اسے پکڑنے سے پہلے ان دھاروں کو پکڑیں جو ملزم کی بیوی، ملزم کے باپ اور ملزم کے چچا نے جنم دیے۔ جناب والا۔ یہ زندگی ایک پیچیدہ گنجلک ہے۔ اس میں کوئی پتہ نہیں چلتا کہ کس کے عمل کا تار کس کی قسمت میں اٹکا ہے۔ ہمیں کوئی اندازہ نہیں کہ کہاں سے کھینچ پڑے گی تو کون سی گرہ پکی ہو جائے گی یا کھل جائے گی۔ بعض اوقات ایک جھٹکے سے سارے تار سیدھے ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات صدیوں کی محنت یہ گنجھل نہیں کھول سکتی۔ اور ملزم اس گنجھل کی مرکزی گرہ ہے۔ یہ بے چارہ تین ضابطوں میں بٹا ہوا ہے۔ اوّل خاندانی نظام کا ضابطہ ہے جو گھر اور خاندان کی عزّت کے نام پر قربانی چاہتا ہے۔ دوسرا سوسائٹی کی اقدار کا ضابطہ ہے جو غیرت کے نام پر قتل کرنے والے کی عزت کرتا ہے۔ اور تیسرا آپ کا قانون ہے جو قاتل کو پھانسی پر لٹکا دیتا ہے۔ جناب والا! اکثر اوقات یہ تینوں ضابطے آپس میں منطبق نہیں ہوتے اور ایک دوسرے کی ضد بن جاتے ہیں، ایسی صورت میں بے چارہ فرد ان کے تقاضے پورے کرنے میں اس طرح تباہ ہوتا ہے جس طرح کسی جسم کو مختلف اطراف سے کھینچ کر اُس کے چیتھڑے اُڑا دیے جائیں۔ سَر۔ یہ ملزم ایسا ہی فرد ہے۔ اپنے ضابطے پر پرکھنے سے پہلے خدارا سوچیے کہ غیرت کے ضابطے پر اس کا عمل درست ہے یا نہیں۔ اگر یہ آپ کو ناخوش کرتا تو وہ ضابطہ اس سے ناراض رہ کر اُٹھتے بیٹھتے سزا دیتا رہتا ہے۔ اور اگر اسے خوش کرتا ہے تو آپ اسے پھانسی کا پھندا دکھاتے ہیں۔ فرد کی ازلی اور ابدی مجبوری کو دیکھیے جناب والا اور سوچیے کہ ملزم گناہگار ہے یا بے گناہ۔

(وکیل صفائی بات ختم کر کے جھکتا ہے اور پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ جج کچھ لکھتا ہے۔ پھر وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتا ہے۔ وہ اُٹھ کر اپنے دلائل شروع کرتا ہے)

وکیل استغاثہ: میں وکیل صفائی کی طرح آپ کو حسین الفاظ کی قوس قزح نہیں دکھاؤں گا بلکہ صرف یہ عرض کروں گا کہ ایک قتل ہوا ہے، قاتل اقبال جرم کرتا ہے۔ گواہان تائید کرتے ہیں ایسی حالت میں قانون کا فیصلہ کیا ہے؟ قانون کسی شخص کو ایسی کوئی زندگی ختم کرنے کی اجازت نہیں دیتا جو ایک دفعہ وجود میں آ گئی ہو۔ قانون کا منشا صرف انصاف ہے۔ قانون کا کام یہ نہیں کہ دلوں کی دھڑکنیں گنتا پھرے یا پیمانے لے کر احساس کمتری کو ماپتا رہے۔ قانون عمل کی سزا دیتا ہے۔ عمل کا جواز نہیں ڈھونتا۔ قانون خون کے گرم قطرے کو دیکھتا ہے مقتول کی ٹھنڈی لاش کو دیکھتا ہے۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑتا ہے جس نے خون گرایا اور اس قاتل کو سزا دیتا ہے جس نے قتل کیا۔ ہمیں نہ قاتل کی حسرتوں سے واسطہ ہے نہ مقتول کی پلکوں پر آنسو دیکھنے ہیں، بلکہ قانون کے محدود دائرے میں رہ کر اور جذبات سے بالاتر ہو کر جرم کا جائزہ لینا ہے۔ ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ معاشرے میں کوئی شخص اپنی قانونی حدود سے تجاوز کر کے دوسرے کی قانونی حدود میں دخل اندازی نہ کر سکے۔ ملزم اپنے لیے تو صاف ستھری زندگی کا خواب دیکھتا ہے مگر اسے اس معصوم کھلکھلاتے بچے کو قتل کرنے کا کوئی حق نہیں جو دنیا میں زندگی گزارنے کا ویسا ہی پختہ حق لے کر آیا ہے جیسا ملزم اپنے لیے چاہتا ہے۔ قانون اس حق کو تسلیم کرتا ہے اور چونکہ ملزم نے وہ حق چھینا ہے اس لیے یہ قصور وار ہے اور اسے سزا ملنی چاہیے۔

(فیڈ آوٹ)

تیسرا سین

سکرین پر اخبار کا عکس۔ پہلا عنوان ہے

''بچے کے قاتل کو پھانسی کی سزا''

مشہور مقدمہ قتل کا فیصلہ

چوتھا سین

جیل کا کمرہ قریباً دس فٹ لمبا اور آٹھ فٹ چوڑا۔ سامنے سلاخوں کا دروازہ۔ ملزم افضل چٹائی پر بیٹھا ہے۔ اور قرآن شریف پڑھ رہا ہے۔ مگر اس میں محویت نہیں ہے۔ تھوڑا پڑھتا ہے، پھر سوچ میں ڈوب جاتا ہے، پھر پڑھنے لگتا ہے۔ مگر پڑھتا پڑھتا خالی الذہن ہو جاتا ہے۔ اتنے میں ایک لڑکی سلاخوں والے دروازے کے پاس ہولے ہولے آ کر رکتی ہے۔ ملزم کو چند ثانیے دیکھتی ہے۔ پھر سلاخیں پکڑ کر قریباً جھول سی جاتی ہے۔ اس طرح کہ اس کا چہرہ ایک بازو کے پیچھے چھپ جاتا ہے۔ وہ جھولتے وقت بڑے کرب انگیز انداز میں کہتی ہے ''خدا۔'' ملزم لاپروائی سے سر اُٹھاتا ہے۔

ملزم: کون؟

(لڑکی آہستہ آہستہ منہ اُدھر گھماتی ہے۔ ملزم ایک دم۔ تڑپ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ پھر لپک کر آگے آتا ہے۔ اور بے تابی سے اس کے سلاخوں پر ٹکے ہوئے ہاتھوں کو پکڑ لیتا ہے۔ حیرت اور شوق سے اسے چند ثانیے دیکھتا ہے)

ملزم: سیمیں تم؟؟ تم ادھر کیسے؟

لڑکی: (محویت کے عالم میں اسے دیکھتی رہتی ہے۔ پھر سپاٹ انداز میں کہتی ہے) میں نے اخبار میں دیکھا تھا۔ (ملزم اسے اوپر نیچے دیکھتا ہے، جیسے اس کا ردِعمل جانچ رہا ہو) مگر مجھے یقین نہیں آتا تھا۔ (تڑپ کر) فضلی یہ تم نے کیا کر دیا؟؟

ملزم: (گرفت اس کے ہاتھوں پر ڈھیلی پڑ جاتی ہے اور وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر ہارے ہوئے انداز میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ دو چار ثانیے چپ رہتا ہے اور پھر شکایت بھرے انداز میں بولتا ہے) سیمیں! تم بھی یہی کہتی ہو کہ میں نے کیا کیا

ہے؟ کیا بے غیرتی کے طعنے دینے والوں نے کچھ نہیں کیا۔ کیا میرے دفتر والوں نے کچھ نہیں کیا جن کی آنکھوں میں میرے لیے ہتک کے سوا کچھ نہ تھا۔ کیا امینہ نے کچھ نہیں کیا جو میری بیوی ہوتے ہوئے بھی شار کے بچے کو مجھ پر ترجیح دیتی تھی اور مجھ سے کھُلم کھُلا نفرت کا اظہار کرتی تھی! کیا میرے گھر والوں نے کچھ نہیں کیا جو مجھے اس جہنم میں مستقل طور پر رکھنا چاہتے تھے؟ (بے چینی سے کمرے میں ایک چکر لگاتا ہے)

سیمیں: قصور جس کا بھی ہوا افضل، تم تو مجھ سے چھن گئے نا۔۔۔ جب تم آخری دفعہ مجھ سے ملے تو مجھ سے تم نے شادی کا وعدہ کیا تھا۔ (رونے لگتی ہے) میں سمجھتی تھی اگلی دفعہ تمہیں دولہا کے روپ میں۔۔۔ دیکھوں گی۔۔۔ مگر آج کیا دیکھ رہی ہوں!!

ملزم: مجھے سب یاد ہے سیمیں! جب تم سے آخری دفعہ ملا تھا تو میں۔۔۔ واپسی پر جیسے اُڑ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ امی سے بات کرنے کی دیر ہے اور سب کچھ طے ہو جائے گا۔ مگر۔۔۔ جب میں گھر پہنچا تو شام سے پہلے۔۔۔ میرا نکاح ہو گیا۔ میں اُف نہ کر سکا۔۔۔ تمہیں کیا بتاتا اور کس منہ سے بتاتا۔۔۔ مر تو میں اسی دن گیا تھا۔۔۔ اب تو صرف رسم ہی پوری کرنی ہوگی۔

سیمیں: (روتے ہوئے) ایسا نہ کہو افضل۔ انشاء اللہ تعالیٰ اپیل منظور ہو جائے گی۔

افضل: (قریب آ کر) اپیل بھی تو قانون کے مشینی پرزے سنیں گے سیمیں! ان میں انسانیت کہاں۔ وہ منظور نہیں ہوگی۔

سیمیں: نہیں افضل ضرور ہوگی۔

افضل: (زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ) اگر ایسے ہی یقین تھا تو پرسوں آتیں، جب اپیل کا فیصلہ ہوگا تاکہ تمہیں آزادی سے ملتا۔ آج کیوں آئی ہو؟

سیمیں: (چند لمحے اسے دیکھتی ہے) میں تو کچھ سمجھنے کو آئی تھی۔ میں تو صرف یہ جاننا چاہتی تھی کہ میرا افضل قاتل کیسے ہو سکتا ہے۔ تم جو میرا آئیڈیل تھے۔ جو کالج کی مجلسوں کی جان تھے۔ جس کے نغمے میری رُوح سلب کر لیتے تھے۔ اور جس کے بشاش چہرے پر مسکراہٹ کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔ تم کیسے قتل کر سکتے تھے۔ میرا آئیڈیل مجھے کیسے مایوس کر سکتا تھا؟ مگر مجھے ساری کہانی یہاں آ کر پتہ چلی۔

افضل: اب تو تم سب کچھ جان گئی ہو!!

سیمیں: ہاں افضل۔۔۔ تم نے مجھے دو رومال دیے تھے۔ گھر سے چلی تو ساتھ لے لیے۔۔۔ کہ اگر تم نے کسی سفلے پن کی وجہ سے قتل کیا ہے تو میں یہ رومال واپس کر دوں گی۔ اور تم سے سارے رشتے توڑ لوں گی۔

افضل: (سلاخوں میں منہ دبا کر) پھر اب؟

سیمیں: مگر نہیں۔۔۔ تم تو اُلجھنوں سے چھٹکارا پانا چاہتے تھے۔ خدا کی اتنی حسین دنیا ہے، اس میں اتنی نعمتیں ہیں، مگر حالات کی اُلجھنیں اسے جہنم بنا دیتی ہیں۔ الجھنوں سے نجات کی کوشش کرنا کوئی گناہ نہیں کوئی جرم نہیں۔ میں اب بھی تمہاری ہی ہوں فضلی۔

افضل: (شدتِ جذبات سے اس کے بازو پکڑ لیتا ہے) سیمیں ایک رومال مجھے دیتی جاؤ۔

سیمیں: تم کیا کرو گے؟۔۔۔ وہ میرے پاس تمہاری نشانی ہے۔

افضل: اس دنیا میں میرے تین دن باقی ہیں۔۔۔ صرف تین دن۔۔۔ ان تین دنوں سے آگے میرا کوئی مستقبل نہیں جس کے متعلق سوچ سکوں۔ نہ کوئی امنگ اُٹھے گی، نہ کل کے خواب ہوں گے، نہ خواہشیں جنم لیں گی، نہ آئندہ کے لیے ہونٹوں سے دعائیں نکلیں گیں۔ آگے دیکھنے کو میرے پاس کچھ بھی تو نہیں سیمیں۔ یہ تین دن گو آنے والے ہیں لیکن ابھی سے ماضی کا حصہ ہیں، کیوں کہ میں ان دنوں میں صرف ماضی کو ہی یاد کر سکوں گا۔ موت کی تلخی چکھنے سے پہلے میں تلخ یادوں سے بچنا چاہتا ہوں۔ تم رومال دو گی تو میں اپنا ذہن اس میں لپیٹ کر تمہاری گود میں رکھ دوں گا۔

سیمیں: (روتے ہوئے رومال بڑھاتی ہے) بس کرو افضل۔ بس کرو۔

افضل: (رومال کے ساتھ اس کا ہاتھ بھی تھام لیتا ہے) میں وصیت کر جاؤں گا سیمیں کہ میرے بعد یہ رومال صرف تمہیں واپس کیا جائے گا۔۔۔ یہ گھاٹے کا سودا نہیں سیمیں۔۔۔ جب یہ رومال تمہیں واپس ملے گا تو۔۔۔ یہ صرف رومال ہی نہیں ہوگا، اس کے کسی کونے میں میری روح بھی بندھی ہوگی۔

(لڑکی بلک بلک کر رونے لگتی ہے)

فیڈ آؤٹ

پانچواں سین

(سکرین پر اخبار کا عکس)

''افضل کی اپیل نامنظور''

''اقبالِ جُرم کے بعد کوئی گنجائش نہیں رہتی''

عدالت کا فیصلہ

چھٹا سین

(پردے پر تاریکی ہے۔ پس منظر میں صبح کی اذان دُور سے سنائی دیتی ہے۔ اندھیرے میں سلاخوں والا دروازہ کھلنے کی آواز آتی ہے۔ ساتھ ہی ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کی جھنکار بھی ہے۔ قدموں کی چاپ)

وقفہ

(پردے پر آہستہ آہستہ روشنی بڑھتی ہے۔ سلاخوں والا پورا دروازہ نظر آتا ہے۔ کیمرہ قریب جاتا ہے۔ کمرہ اندر سے خالی ہے۔ ایک سلاخ کے گرد رومال گرہ کی شکل میں لپٹا ہے۔ کیمرہ رومال پر فوکس ہو کر دھیرے دھیرے قریب آتا ہے۔ حتیٰ کہ سارا رومال سکرین پر چھا جاتا ہے۔)

فکاہیہ

نسخہ

مسعود مفتی

ڈاکٹر صاحب نے گز بھر ہاتھ ہمارے پیٹ میں گھسیڑ ڈالا، دو گھونسے چھاتی پر دے مارے، ٹھوڑی پکڑ کر گردن جھٹکا ڈالی اور پھر پیشتر اس کے کہ ہمارا سانس درست ہو اور ہم مفصل حالات بتا سکیں وہ قلم لیے کاغذ پر پل پڑے۔ چشم زدن میں نسخہ گھسیٹا گیا۔ الفاظ ہمارے الجھے ہوئے سانسوں میں اٹکے ہی رہے اور حیرت سے کھلے ہوئے ہاتھوں میں نسخہ تھماتے ہوئے وہ تیزی سے بولے: ''کسی کیمسٹ سے دوا بنوا لیجیے۔ تین تین گھنٹے بعد ایک خوراک۔۔۔۔ پانچ روز بعد پھر دکھایئے۔۔۔۔ اگلا مریض بھیجو بھئی۔'' نظر اٹھائی تو چپڑاسی ایک اور ٹوٹے پھوٹے آدمی کو چک اٹھا کر اندر دھکیل رہا تھا اور جب تک ہم اس تبدیلی کو مکمل طور پر سمجھ سکتے ڈاکٹر صاحب اس کے گلے سے بکری کی آواز نکلوا رہے تھے جس کی تان ہمیں بھی کمرے سے باہر بہا کر لے گئی۔

باہر نکلتے ہی ہم نے اپنی لغت کی تمام گالیوں کا ورد کر ڈالا، گو ہمارا روئے دشنام عرفی بھیا کی طرف تھا جنہوں نے ہفتہ بھر سے ناک میں دم کر رکھا تھا کہ چوٹی کے ڈاکٹر کے پاس جاؤ۔ یہ ورد یقیناً عرفی بھیا کے قتل میں ختم ہوتا اگر ہمیں اچانک خیال نہ آجاتا کہ ممکن ہے چوٹی کے ڈاکٹروں کے معائنہ کا انداز ہی یہی ہو۔ اس سے قدرے تسلی ہوئی تو ہم نے مٹھی میں مڑوڑے ہوئے نسخے کو کھولا تاکہ دیکھیں ڈاکٹر صاحب نے کیا تجویز کیا ہے۔

نسخہ کیا تھا کسی بھاگتی ہوئی فوج کی ابتری کا منظر تھا۔ کاغذ پر الفاظ کا تو دور دور بھی نشان نہ تھا۔ البتہ چند اکڑوں لکیریں، چند بیزار سی قوسیں اور چند مونچھ بردار نکتے ٹوٹے ہوئے جام کے ٹکڑوں کی طرح کچھ اس انداز میں بکھرے ہوئے تھے کہ ایک دوسرے سے بظاہر لاتعلقی کے باوجود آپس میں ٹہوکے دیتے نظر آتے تھے۔ الفاظ قسم کی چیز صرف ایک جگہ تھی جو اوپر والے کونے میں ڈاکٹر صاحب کے نام کی شکل میں چھپی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ڈگریوں کی ایک لمبی دم تھی، جس میں ڈگریاں کم اور شہروں کے نام زیادہ تھے۔ اس سے نیچے، جہاں ڈاکٹر صاحب کے قلم نے گھوڑ دوڑ کی تھی، جیومیٹری کے لحاظ سے بے قاعدہ خطوط کچھ اس طرح باہم دست بگریباں تھے کہ کسی سیدھے خط کی پسلی سے یک لخت کوئی قوس پیدا ہو جاتی اور اس کی بغل میں سے سیاہی کی کوئی اور رال ٹپک رہی ہوتی۔ آگے کاغذ کا وسیع، لق و دق صحرا تھا جس میں کوئی مجنوں صفت نکتہ اکیلا سر دھنتا نظر آتا۔ پھر ایک دم تین چار دندانے دار خطوط کسی پتنگ باز کی الجھی ہوئی ڈور کی طرح آپس میں ایسے گتھے ہوئے تھے کہ کوئی راکٹ کی طرح ایک دم اوپر کی طرف پرواز کر جاتا تھا اور کوئی سمندری آبدوز کی طرح نیچے سے غوطہ زن تھا۔ کسی جگہ کوئی نصف دائرہ پورے ہندسے کی نمائندگی کر رہا تھا تو کسی جگہ دو تین لڑکھڑاتی ہوئی لکیریں اپنی اٹھک بیٹھک سے کسی معرکہ آراء دوائی کا نام جپ رہی تھیں۔ کہیں سیدھے سپاٹ عمود جھنڈے گاڑے کھڑے تھے تو کہیں چھوٹی چھوٹی گھنڈیاں نئی دلہن کی طرح اندر ہی اندر سمٹی جاتی تھیں۔ اوپر نیچے، دائیں بائیں، ہر طرف ایک ہی حشر برپا تھا۔ پہلے تو ہم سمجھے کہ غلطی سے ڈاکٹر کی بجائے کسی عامل کے پاس آن پھنسے ہیں، جس نے آسمانی زبان میں کوئی تعویز لکھ دیا ہے۔ لیکن کانوں نے شہادت دی کہ انہوں نے یہ کاغذ کسی دریا کے کنارے جلانے کو نہیں کہا تھا بلکہ کسی کیمسٹ کو دکھانے کی ہدایت کی تھی۔ پھر خیال آیا کہ ممکن ہے ہزاروں سال پہلے ڈاکٹر صاحب کے آباؤ اجداد میں سے کوئی بزرگ کسی مصری یا یونانی مندر کے کاہن ہوں اور اس نسلی ورثے کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب اب بھی لاشعوری طور پر نسخہ کسی ایسی زبان میں لکھ رہے ہوں جو اہرام مصر کے تاریک ترین گوشوں میں کندہ ہے۔ لیکن جب ڈاکٹر صاحب کی حد سے زیادہ مصروفیت اور ان کا کاروباری رویہ یاد آیا تو یقین آگیا کہ وہ کلیۃً موجودہ صدی کے ہی آدمی ہیں اور ہمارا خیال غلط ہے۔ بہر حال ہماری نگاہ کبھی ان خطوط کے کنگوروں میں اٹک جاتی، کبھی دندانے دار لکیروں میں پھدکنے لگتی اور کبھی سیدھی لکیروں سے پھسل پڑتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمیں اپنی بیماری اور دوا کا پتہ تو کیا چلتا البتہ پیٹ کی تکلیف کے ساتھ سر میں بھی درد شروع ہو گیا۔ آئے تھے ایک بیماری کا علاج کروانے اور جاتے وقت دو تکلیفیں جھنجھوڑ رہی تھیں۔ اپنی حالت پر ترس کھاتے ہوئے ہم مجبوراً کسی کیمسٹ کی تلاش میں چل نکلے۔

کیمسٹ کا ملازم جب نسخہ لے کر اندر گیا تو ہمارا خیال تھا کہ ڈسپنسر ابھی روتا، چیختا، کپڑے پھاڑتا باہر بھاگ آئے گا اور اپنی تعلیم و تجربے کا نوحہ کرتا ہوا دھائی دے گا کہ اس سے یہ پڑھا نہیں گیا۔ لیکن ہماری حیرت بے اختیار ابل پڑی جب تھوڑی دیر بعد ملازم لڑکا ایک نہایت صاف ستھری شیشی لے کر برآمد ہوا اور بڑی شائستگی سے ہمارے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولا: ''کوئی اور حکم؟'' شیشی میں گاڑھے نسواری رنگ کی دوائی تھی، ساتھ نسخہ تھا اوپر کارک مضبوطی سے بند تھا، کیمسٹ کا لیبل بھی چسپاں تھا۔ کہیں بھی کسی شے کے غیر معمولی ہونے کا احساس نہ ہوتا تھا۔ ہم نے خاموشی سے دوائی اٹھائی اور اپنی قابلیت میں ہزاروں کیڑے ڈالتے ہوئے گھر لوٹ آئے۔

دوائی کا استعمال کیا گیا۔ پیٹ کی تکلیف میں قدرے افاقہ محسوس ہوا لیکن ساتھ ہی سخت قبض کی شکایت لاحق ہو گئی۔ ہم نے سوچا ممکن ہے کوئی بد پرہیزی کی ہو گی۔ اگلے روز خوراک میں زیادہ احتیاط کا تہیہ کرتے ہوئے ہم

پھر سے اسی کیمسٹ کی دکان پر پہنچ گئے۔

لڑکا حسب سابق اندر غوطہ لگا گیا؟ اور جب برآمد ہوا تو دوائی کی شیشی اس کے ہاتھ میں تھی لیکن بخدا۔۔۔۔دوائی کا رنگ سرخ تھا، حالانکہ پہلے روز والی نسواری رنگ کی تھی!

''ارے بھائی یہ کس کی دوا اٹھا لائے؟ اس نسخے کی دوا لائی ہوتی'' ہم نے ڈانٹا۔

''اسی کی ہے صاحب۔ یہ دیکھیئے ٹوکن'' اس نے گتے کا ایک ٹکڑا دکھایا جو ولادت کے وقت تو یقیناً چوکور ہوگا لیکن اب زمانے کی مار سے مائل بہ گولائی تھا۔

''جاؤ جاؤ اندر لے جاؤ۔ اس سے کہو یہ دوائی ٹھیک نہیں'' ہم نے سخت گاہک کے انداز میں رعب جمایا۔ لڑکا دوائی اور نسخہ لے کر اندر چلا گیا لیکن اس کے بجائے ایک مریل سی آدمی نما چیز ایپرن میں لپٹی ہوئی نکلی اور گھسی ہوئی آواز میں احتجاج نافذ ہونے لگا: ''دیکھیے صاحب ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ دوائی بھی بنائیں اور پھر اس کی تشریحات بھی کرتے پھریں۔ ہمیں تو جو نسخے میں نظر آئے گا ہم وہی بنائیں گے''

دیکھیئے جناب!'' ہم نے مصالحانہ سختی سے کہا'' کل جو دوا آپ نے دی تھی، اس کا رنگ نسواری تھا اور یہ سرخ ہے۔۔۔۔''

''جی کل والی دوا کل والے نسخے کے مطابق ہوگی'' وہ ہماری بات کاٹ کر بولے اور آج کی دوا آج کے نسخے کے مطابق ہے''

''لیکن بھئی کل کا اور آج کا نسخہ ایک ہی ہے''

''ایں؟ ایک ہی ہے؟'' انہیں ذرا بریک لگی، لیکن پیشہ وارانہ وقار ایک دم پھر سے ابل پڑا'' جی نہیں ہمیں کچھ پتا نہیں، ہم تو جو نسخے میں دیکھیں گے وہی بنائیں گے'' اور دھڑاک سے دروازہ بند کرتے ہوئے اور فضا میں اپنی بڑبڑاہٹ کی گونج چھوڑتے ہوئے چلے گئے۔

ہم مجبوراً مالک کے پاس پہنچ گئے جو ایک کاؤنٹر کے پیچھے پھنسے بیٹھے تھے۔ ان کے کپڑوں سے وٹامن بی کی بو آرہی تھی اور وہ سامنے پڑی ہوئی انجکشن کے پانی کی چار شیشیوں کو انگلی سے بجا بجا کر جلترنگ کا ساں پیدا کر رہے تھے۔ انہوں نے بڑی ہمدردی سے ہماری شکایت کو سنا اور پھر اطمینان سے نسخہ ہاتھ میں لے کر کمال خوداعتمادی سے اس پر نظر دوڑائی لیکن ساتھ ہی ان کے چہرے پر پریشانی اور بے چارگی کی لہریں دوڑنے لگیں اور وہ نسخے کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے جیسے کسی شیرخوار بچے کو الارم بجنے کے بعد پہلی دفعہ ٹائم پیس گھڑی ہاتھ میں پکڑنے کا اتفاق ہوتا ہے۔

ایک دم ان کا ہاتھ اُچھلا اور گھنٹی بج اُٹھی۔ چند لمحے بعد ایپرن میں ملفوف مخلوق پھر سے آن موجود ہوئی۔

''دیکھو بھئی یہ نسخہ پھر سے دیکھ لو تاکہ ان کی تسلی ہو جائے''

''عجب بات ہے جناب، ابھی ان کو نہایت شرافت سے بتایا ہے کہ دوائی نسخے کے عین مطابق بنائی گئی ہے لیکن اگر ان کی تسلی نہ ہو تو بنانے والے کا کیا قصور؟''

''جی بنانے والے کا قصور یہ ہے'' اب تو ہم بھی سچ مچ غصے میں آ گئے'' کہ وہ نسواری اور سرخ رنگ میں تمیز نہیں کر سکتا''

بنانے والے نے ضبط کا گھونٹ بمشکل نگلتے ہوئے نسخہ ہاتھ میں پکڑا اور سب سے اوپر والی سطر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا'' صاحب یہ تو ہے۔۔۔(اس نے نہ معلوم کس دوائی کا نام لیا، جس کا نام لینا تو کجا محض اس کا خیال کرنے ہی سے ہمارے گلے کی رگیں پھول جاتی ہیں) اور یہ یہاں لکھی ہے پانچ ملی گرام۔ (وہ نسخے پر ایک گھنڈی پر ہاتھ رکھ کر بولا) دوسری یہ یہ۔۔۔۔ (اس نے ایک اور ڈکار نما نام لیا) یہ ہے ایک ڈرام، اور اتنی ہی میں نے ڈالی ہے۔ اور یہ ہے تیسری''

اسی طرح اس نے چار پانچ نام لے ڈالے اور مالک صاحب ایسے سر ہلاتے گئے جیسے کلاس کا نالائق لڑکا کچھ سمجھے بغیر استاد کے ساتھ سر ہلاتا جائے۔ ہم نے بالآخر مالک کی طرف دیکھ کر بولا: ''کیوں صاحب یہ ٹھیک ہے کیا؟'' تو مظلومیت سے بولے: ''جی نسخہ تو پڑھ نہیں سکتا لیکن ہمارے آدمی نہایت تجربہ کار ہیں اور بڑی احتیاط سے نسخہ بناتے ہیں'' یہ کہہ کر نسخہ اور دوائی انہوں نے ہمارے ہاتھ میں تھما دی اور خود جلترنگ کی مشق فرمانے لگے۔ جب ہم وہاں سے نکلے تو سر درد پھر سے عود کر آیا تھا۔

ہمارا اگلا خیال قدرتی طور پر کسی چوٹی کے کیمسٹ کے پاس جانے کا تھا، چنانچہ جب وہاں پہنچے تو کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے ہوئے ایک باوردی سیلز مین نے نسخہ ہاتھ میں لے کر ہمیں ایک پرچی دے دی اور نسخہ ایک لڑکے کے ہاتھ کسی نامعلوم تہ خانے کی طرف روانہ کر دیا۔ ہم ایک کاؤچ پر بیٹھے انتظار کی گھڑیاں اور دکان کی شیشیاں گنتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد عدالت کی آواز کے انداز میں ہمارا نمبر پکارا گیا اور ہم ادھر لپکے، تو لفافے میں بند ایک شیشی ہمیں دی گئی۔ ہم نے بے صبری سے لفافہ اتار کر دوائی کا رنگ دیکھنا چاہا تو سخت ناامیدی ہوئی کیونکہ دوائی بالکل بے رنگ تھی۔ اب جو ہم نے بے چارگی سے دوائی، نسخے اور سیلز مین کو دیکھنا شروع کیا تو وہ ہمارے قریب منہ لا کر راز داری سے بولا:

''جناب اگر کسی خاص چیز کی ضرورت ہو تو بلاتکلف کہیے، شرم کاہے کی''

ہم قدرے جھینپ سے گئے اور صفائی پیش کرنے کے طور پر جو بولنا پڑا تو صرف یہی کہہ سکے: ''جی نہیں، چاہیے تو کچھ نہیں، لیکن کیا آپ کو یقین ہے کہ یہ دوائی اسی نسخے کی ہے؟''

''ہی ہی ہی'' وہ دانت نکالنے لگا'' یہ کیا فرمایا جناب نے؟ جب آپ نسخہ دیتے ہیں تو دوائی اس کے مطابق ہی بنتی ہے''

''جی نہیں، ہم قدرے ترش ہو گئے میرا مطلب یہ ہے کہ کیا نسخے

اوردوائی میں تبدیلی تو نہیں ہوگئی؟''

''استغفراللہ،صاحب کیابات کرتے ہیں؟ بھلا یہ بھی کبھی ممکن ہے ؟اتنا بہترین سٹاف ایسی غلطی کہاں کرسکتا ہے!''

''لیکن کل میں نے ایک کیمسٹ سے یہی دوائی بنوائی تھی تو وہ گاڑھے نسواری رنگ کی تھی اور یہ بالکل بے رنگ ہے''

''کون کیمسٹ تھا وہ؟''

اور جب ہم نے نام بتایا تو وہ ہنس کر بولا:''غیبت اچھی نہیں ہوتی جناب،لیکن کیا کریں اگر کوئی آدمی اپنے سٹاف میں گھسیارے رکھے گا تو ویسی ہی دوائی بنے گی۔ ہمارے ہاں تو ہر احتیاط برتی جاتی ہے۔ شیشیاں جراثیم کش دوائیوں سے صاف کر کے ریفریجریٹر میں رکھی ہوتی ہیں۔ ایک آدمی دوائیاں بناتا ہے،دوسرا انھیں پرکھتا ہے،تیسرا نمبر لگاتا ہے۔ بھلا غلطی کیسے ممکن ہے!''

اور پھر ہمارا کھلا ہوا منہ دیکھ کر بولا''آپ تو بس بالکل وہم نہ کریں اس معاملے میں۔ ہم ہر چیز کے ذمے دار ہیں،انشاء اللہ آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہ ملے گا''

''کبھی''جائے بھاڑ میں،ہم نے بھنا کر سوچا۔آج کی شکایت کا تو علاج نہیں ان کے پاس اور آئے ہیں مستقبل کے سودے کرنے۔ چنانچہ وہاں سے جو شیشی چھین کر بھاگے تو خدا جھوٹ نہ کہلوائے تو کم از کم درجن بھر کیمسٹ گھوم ڈالے۔لیکن قسم لے لیجئے جو ایک دکان کی دوائی دوسری دکان والی سے معمولی سی بھی ملتی ہو۔کہیں سے گھلا ہوا چاک ملا تو کہیں سے تیل کی سی شفاف دوائی،کسی نے تیرتے ہوئے سفوف ڈال دیئے تو کسی نے لپالپ کرتی جھاگ بھر دی،کسی کی دوائی بند شیشی میں شوں شوں ابل رہی ہے تو کسی کی لئی کی طرح شیشی کی دیواروں کے ساتھ اس طرح چپکی ہوئی ہے کہ لاکھ ہلاؤ پر اس کے قطرے کروٹ تک نہیں بدلتے۔اتنی دکانیں پھرتے پھرتے جیب تو خالی ہوگئی تھی،اب یقین بھی خالی ہونے لگا۔بار بار وہم ہوتا کہ خدا معلوم کل بھی صحیح دوا پی یا نہیں۔ ممکن ہے کہ آج کی رنگا رنگ جھلکوں میں سے ہی کوئی اصل اکسیر ہو۔لیکن فرق یہ تھا کہ کل والی دوا پینے کے بعد ابھی تک جسم چلنے پھرنے کے قابل تھا اور آج کی نا آزمودہ دوائیوں کے متعلق کوئی یقین نہ تھا کہ پینے کے بعد جسم کے کس حصے میں آتش فشاں پہاڑ پھوٹ پڑے۔اسی فکر میں سرگرداں پھرتے رہے اور نہ معلوم کب تک پھرتے رہتے اگر ایک کیمسٹ سے قریباً قریباً اسی رنگ کی دوائی نہ مل جاتی جیسی ایک روز پہلے پی چکے تھے۔

گھر آ کر ہم نے اس کا استعمال شروع کیا،لیکن آج تک اپنے ستاروں کو کوس رہے تھے،ایک ہی خوراک پینے سے پیٹ میں گھوڑے دوڑنے لگے۔کہاں تو سخت قبض کی شکایت تھی اور کہاں یہ عالم کہ دوسری خوراک پیتے ہی اتنی شدید پیچش نے آن گھیرا کہ گھنٹے بھر میں پیٹ کمان بنا کمر سے جا چپکا۔اس نئی تکلیف نے اتنا مصروف رکھا کہ یہ سوچنے کی مہلت ہی نہ ملی کہ ایک ہی دوائی کی دو دنوں میں متضاد تاثیر کیسے پیدا ہوگئی،اور حیران کن بات یہ کہ دوسری اتنی زود اثر کہ شیشی کی طرف دیکھو تو پیٹ میں پھنسے لڑنے لگیں۔خدا خدا کر کے وقت کاٹا اور جب یقین ہوگیا کہ ڈاکٹر صاحب اپنی کائنات میں بطور یزداں جم چکے ہوں گے تو فون اٹھایا:

''ہلو!ہلو!ڈاکٹر صاحب ہیں؟''

''جی!بول رہا ہوں''

''ڈاکٹر صاحب میں کل حاضر خدمت ہوا تھا۔نسخہ کا نمبر ۴۲۰ ہے۔ یاد آ گیا آپ کو''

''جی۔جی بولتے جایئے آپ''

''تو وہ عرض ہے کہ پیٹ کی تکلیف تو کچھ زیادہ ہی ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے پیٹ اپنی تمام بیماریوں کا تجربہ کر رہا ہے۔ پہلے روز تو سخت قبض تھی، اب پیچش سے برا حال ہے۔۔۔۔''

''لیٹ جایئے''فون پر ڈاکٹر صاحب کی یہ آواز سن کر ہم حیران ہوئے کہ ڈاکٹر صاحب کا کیا مطلب ہے۔ پھر ایک دم ان کا مطلب سمجھ کر ہمیں اپنی ناسمجھی پر افسوس ہوا اور ہم کھسیانے ہو کر بولے:

''جی سارا دن لیٹا رہا ہوں لیکن کسی کل چین نہیں پڑتا''

منہ کھولیے''ٹیلیفون پر پھر آواز آئی اور ہم حیران کہ ڈاکٹر صاحب فون کو ٹیلی سکوپ سمجھے ہیں۔نہ معلوم وہ فون سے کتنے کام لے سکتے ہیں۔

''جی کیا فرمایا؟''ہم نے خواہ مخواہ اپنی سمجھ پر شک کرتے ہوئے دوبارہ تسلی چاہی۔

''گلے سے آواز نکالیے''ڈاکٹر صاحب کی آواز پھر آئی اور یقین جانیے ہمیں اپنے یا ڈاکٹر صاحب کے آسیب زدہ ہونے کا یقین ہونے لگا۔لیکن ساتھ ہی ٹیلیفون پر ایک بکری کی آواز سنائی دینے لگی تو عقدہ کھلا کہ ڈاکٹر صاحب رسیور کان سے لگائے کسی اور مریض کا معائنہ فرما رہے تھے۔ جی میں آیا کہ اپنا رسیور اتنے زور سے پٹکیں کہ اس کی آواز جا کر ڈاکٹر صاحب کے کان میں سوراخ کردے لیکن بدقسمتی سے ایسے اوقات میں ہمارا ضبط غصے سے کچھ زیادہ ہی تیز ہو جاتا ہے،اس لیے چلا کر فقط اتنا کہا:''ڈاکٹر صاحب! آپ میری بات سن رہے ہیں یا نہیں؟''

''جی جی!سن رہا ہوں۔آپ چاہتے کیا ہیں؟''

ہم کباب ہوگئے۔بمشکل زبان کو دانتوں تلے دبا کر ضبط کیا اور عرض کیا:''جی میری تکلیف نہ صرف بڑھ گئی ہے بلکہ اور بھی کئی تکلیفیں شروع ہوگئی ہیں۔اس وقت حاضر ہوجاؤں تاکہ آپ پھر دیکھ سکیں''

''نہیں نہیں، آنے کی ضرورت نہیں ، ڈاکٹر صاحب جلدی سے بولے''میں نے خوب اچھی طرح دیکھ بھال کر نسخہ لکھا تھا۔ممکن ہے کیمسٹ نے لاپروائی کی ہو۔آپ کسی دوسرے سے دوا بنوالیں۔پانچ روز بعد دکھایئے''

''لیکن ڈاکٹر صاحب۔۔'' مگر وہ فون بند کر چکے تھے''ڈاکٹر صاحب''،ہم چلاّئے لیکن آواز اپنے ہی کانوں میں گونج کر رہ گئی اور ہم سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

اس کے بعد تین روز دوائی تو کیا پیتے البتہ پہلے روز کی کاوش سے کمائی ہوئی تمام رنگا رنگ شیشیوں کی قطار کو میز پر سجا کر سوچتے رہے کہ ان میں سے کون سی دوائی پئیں؟ لیکن خدا بھال کرے اس غیر معروف محسن انسانیت کا جس کے ایک قول کے بار بار یاد آنے کی وجہ سے ہماری جان بچادی۔ وہ قول یہ ہے کہ ''جب تم بیمار پڑو تو ضرور ڈاکٹر کے پاس جاؤ کیونکہ ڈاکٹروں کو بھی زندہ رہنا ہے۔ جب تم ڈاکٹر سے نسخہ لکھوالو تو کسی کیمسٹ سے دوائی ضرور بنوالو کیونکہ کیمسٹوں کو بھی زندہ رہنا ہے اور جب دوائی بنوا چکو تو ہرگز نہ پیو کیونکہ تم کو بھی زندہ رہنا ہے''

پانچویں روز جب ہم ڈاکٹر کے پاس دوبارہ گئے تو ہم اکیلے نہیں تھے بلکہ ہمارے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا جو ہم نے ایک گھنٹے کے لیے کرائے پر لیا تھا وہ ٹائپسٹ تھا۔ ٹائپ رائٹر اس کے کندھے پر تھا اور اس کے تن و توش کو مدنظر رکھتے ہوئے یقین تھا کہ اگر ڈاکٹر صاحب سے کہا جائے کہ وہ خود نسخہ لکھنے کی بجائے اسے ٹائپ کروا دیں تو وہ اپنی سلامتی کی خاطر فوراً راضی ہو جائیں گے۔

ڈاکٹر انور سدید کہتے ہیں کہ ''ہر اچھے افسانے کی کوکھ میں حیرت موجود ہوتی ہے۔'' لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ شرط بھی عائد کرتے ہیں کہ ''اس حیرت کو دیکھنے یا پانے کے لیے قاری کا صاحب ذوق ہونا ضروری ہے۔'' مزید وضاحت یوں کی گئی کہ ''جس طرح خوبصورت منظر ہر ایک ناظر کی آنکھ پر اپنا حسن آشکار نہیں کرتا اسی طرح افسانہ بھی ہر قاری پر اپنی حیرت نہیں جگاتا۔''

میں ڈاکٹر انور سدید صاحب کی رائے سے پوری طرح متفق ہوں۔ مجھ پر مسعود مفتی کے تقریباً ہر افسانے نے حیرت کے ایسے ہی کئی در وا کئے ہیں۔ اگر ڈاکٹر انور سدید کی مندرجہ بالا رائے درست نہ ہوتی تو آج مسعود مفتی کی افسانہ نگاری کا طوطی پورے اردو ادب میں بول رہا ہوتا۔ عہد موجود میں ایک نعرہ عام ہے۔ وہ یہ کہ ''اردو ادب زوال پذیر ہے اور اچھی فکشن نہیں لکھی جا رہی۔'' میرے خیال میں دونوں ہی باتیں غلط ہیں۔ اصل بات قاری کی ادب سے عدم دلچسپی ہے جہاں تک مسعود مفتی کی افسانہ نگاری کا تعلق ہے تو ان کے افسانے انسانی رویوں کی تہہ داری کی کئی جہتیں اپنے قاری پر کھولتے ہیں ان کے افسانوں کے کردار ہمارے روز مرہ میں شامل ہیں۔ مفاد پرست، اعلیٰ عہدیدار، سرکاری اور نیم سرکاری مقطع چقطع بظاہر دیندار مگر گانٹھ کے پورے افسران۔ ان کے افسانوی مجموعے ''ریزے'' اور ''رگِ سنگ'' کے افسانے المیہ مشرقی پاکستان اور 1965ء کی جنگ کے پس منظر میں تخلیق کیے گئے ہیں۔ انہوں نے مشرقی پاکستان کو اپنی آنکھوں اجڑتے اور ٹوٹتے دیکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سانحہ مشرقی پاکستان پر ان کی فلمکاری عروج پر ہے۔ موثر، دلگداز اور دلکدوز۔۔۔۔ یہ تاریخ ہے۔

عذرا اصغر (کراچی)

میرے خیال میں مسعود مفتی کو خاصا نظر انداز کیا گیا ہے۔ کیوں؟ وجوہ کچھ بھی رہی ہوں مگر میری ناقص رائے میں ایسا ہی ہوا ہے، جس قدر پذیرائی کے وہ مستحق ہیں، ادب کے نقادوں کی طرف سے انہیں وہ پذیرائی نہیں مل سکی۔ شاید ایک وجہ یہ بھی ہو کہ

اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں!

ترقی پسند ادب، مزاحمتی ادب، جدید ادب اور ادب برائے ادب کے غلغلے میں انہوں نے زیادہ تر قومی ادب تخلیق کیا ہے۔ ایک اور وجہ بھی ہو سکتی ہے۔ کوئی لکھنے والا اگر دنیاوی طور پر کسی بڑے منصب پر متمکن ہو تو اکثر ''ناشناس'' قسم کے چھوٹے لوگ اس پر تحسینِ بے جا کے اس قدر ڈونگرے برسا دیتے ہیں کہ سچ پر بھی اعتبار نہیں رہتا۔ دوسری جانب جینوئن قسم کے نقاد اس لیے مصلحتاً ''سکوت سخن شناس'' اختیار کیے رکھتے ہیں کہ ''بڑے منصب والے کی قصیدہ گوئی'' کی تہمت سے بچے رہیں۔ دونوں صورتوں میں نقصان بہرحال حقیقی ادیب کا اور حقیقی ادب کا ہوتا ہے۔ مصطفےٰ زیدی مرحوم اس نقصان کی واضح مثال ہیں، ایک عہد ساز شاعر کو ڈپٹی کمشنری مار گئی!

عہد موجود کے اردو ادب میں مسعود مفتی، کسی بھی زاویے سے نظر انداز کیے جانے کے سزاوار فلمکار نہیں ہیں۔ ''قومی ادب'' کے حوالے سے بالخصوص وہ یہ کہنے کا استحقاق رکھتے ہیں:

حُسن کو حُسن بنانے میں مرا ہاتھ بھی ہے
آپ مجھ کو نظر انداز نہیں کر سکتے

ناصر زیدی (لاہور)

''چشمِ کرم''

نعتِ رسولؐ

غالب عرفان

(کراچی)

مُرسلِؐ آخر کہیں یا دستِ قدرت کا جمال
اُسوۂ حسنہ میں ہے حُسنِ مشیت کا جمال

وقت کی تسبیح میں اسمائے حسنہ کا سفر!
کر رہا ہے منعکس رُشد وہدایت کا جمال

کاش مل جائے ہمیں وہ گُم شدہ ماضی جہاں
روشنی دیتا رہا عہدِ رسالت کا جمال

گنبدِ خضریٰ تلے پڑھتے ہوئے اپنی نماز
صف بہ صف محسوس ہوتا ہے عقیدت کا جمال

ہم نوا صدّیق جیسے مل گئے جب آپؐ کو
دیکھنے والوں نے دیکھا ہے صداقت کا جمال

آپؐ کے نقشِ قدم پر چل کے دیکھیں تو ذرا
منکشف ہو جائے گا انوارِ وحدت کا جمال

کیا عجب کہ آپ کی چشم کرم ہو جائے پھر!
بزمِ عرفاںؔ تک چلا آئے شفاعت کا جمال

○

نعت شریف

حفیظ انجم کریم نگری

(بھارت)

حِرا گنبۂ بنیاً جلوہ گاہے
بہت ہی یہ پُرانہ سلسلہ ہے

محمدؐ سے ہمیں جو بھی ملا ہے
خدائے عزّ وجل کی یہ عطا ہے

سُبک روچل رہی بادِ صبا ہے
یہاں سرکارؐ کا خِلوت کدہ ہے

نبیؐ کے سامنے کوئی بچا ہے
فلک کا چاند بھی پھیکا لگا ہے

ازل سے دِل دِوانہ آپکا ہے
شرابِ عشق پی کر جھومتا ہے

گلابوں سا مہک جاتا ہے وہ بھی!
نگاہوں سے جو روضہ چومتا ہے

درودِ پاک پڑھنا عاجزی سے
نبیؐ سے بات کرنے میں مزہ ہے

مری آنکھوں میں کعبہ کا ہے منظر
مرے دل میں مدینہ بس گیا ہے

نبیؐ کے اِک اشارے پر ہی انجم!
جو پورہ ہو وہی تو معجزہ ہے!!

''نصیب اپنا اپنا''

جتیندر بلو

(لندن)

قِصّہ پُرانا ہے۔ بھلائے نہیں بھولتا۔ دِل میں یوں لگا بیٹھا ہے کہ باوجود کوشش کے میں اُسے اپنی ذات سے الگ نہیں کر پایا۔

میں نے برطانیہ کی بندرگاہ ڈوور پر پاؤں رکھا ہی تھا کہ اچانک مجھے جیولیس سیزر کا تاریخی جملہ یاد آ گیا جو اُس نے پومپئی کی بغاوت کے دوران پونٹس کے بادشاہ کو ایک ہی روز میں شکست دینے پر کہا تھا: ''میں آیا۔ میں نے دیکھا۔ میں نے فتح کر لیا۔'' لیکن اُس تاریخی جملے اور مجھ میں فرق صرف اتنا تھا کہ ابھی مجھے جملے کے تیسرے ٹکڑے کو سچ ثابت کرنے کے واسطے پردیس میں اپنی سماجی، معاشی اور ادبی زندگی کا آغاز کرنا تھا۔

ریسٹورنٹ عالیشان تھا۔ لندن شہر کے مرکزی علاقے آکسفورڈ اسٹریٹ میں واقع تھا۔ دنیا بھر کے سیاح وہاں گھومنے پھرنے اور شاپنگ کی غرض سے آیا کرتے۔ ریسٹورنٹ جدید فرنیچر سے آراستہ تھا۔ فلور، کُرسیوں، میزوں کے علاوہ ایک طرف کی دیوار پر مصوّر ردان گاگ، پال گوگان اور کانسٹیبل کے شاہکار پرنٹ آویزاں تھے۔ جبکہ دوسری طرف کنگ ہینری آٹھ، چارلس ایک اور ایلزبیتھ ایک کی تصویریں سنہری فریموں میں جڑی ہوئیں دیواروں کی شان تھیں۔ ہینری آٹھ اپنی چھ شادیوں کے لیے مشہور تھا۔ اُس کی پہلی بیوی ہوتے ہوئے بھی اُس نے دوسری شادی کرنا چاہی تھی۔ لیکن جب پاپائے روم نے اجازت نہ دی تو اُس نے چرچ آف انگلینڈ کی داغ بیل رکھ ڈالی۔

چارلس ایک کا سر کرامویل نے قلم کروا ڈالا تھا کہ وہ کیتھولک ازم کا احیا کرنے کے حق میں تھا۔

الزبیتھ ایک نے آخری دم تک شادی نہیں کی تھی۔ بلکہ اُس کا کہنا تھا کہ تخت پر بیٹھتے ہی اُس نے اپنے ملک سے شادی کر لی تھی۔ میں چونکہ تاریخ کا طالب علم رہا تھا اتنی شُد ھ بُد ھ ضرور رکھتا تھا کہ کسی تعلیم یافتہ انگریز سے بات کرتے ہوئے کم نہ پڑ جاؤں۔

ریسٹورنٹ میں جو کام میرے ذمے کیا گیا تھا وہ ایک قومی ویٹر (QAUMI WAITER) کا تھا، جو تیسری دنیا کے ملکوں میں نہایت گرا ہوا خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن میں مجبور تھا۔ ایک تو پردیس، اُس پر میں رنگدار شخص۔ پھر پاپی پیٹ کو بھی بھرنا لازم تھا۔ میں ریسٹورنٹ کی پوشاک پہنے ہاتھ میں ٹرے تھامے کاؤنٹر کے ایک طرف کھڑا رہتا۔ جونہی گاہک کھا پی کر بل ادا کرتے اور اُٹھتے وقت تصویروں پر سرسری سی نگاہ ڈال کر صدر داخلے کی طرف بڑھتے۔ میں اُس خالی میز کی طرف بڑھتا۔ جلدی سے برتن اُٹھا کر ٹرے میں رکھتا پھر میز کو شیشے کی مانند چمکا کر بھاری ٹرے اُٹھائے کچن کی طرف بڑھ جاتا۔ اُسے وہاں کچن پور ٹر کے حوالے کر کے نئی ٹرے اٹھا کر پھر سے کاؤنٹر کے قریب آن کھڑا ہوتا۔ یہ سلسلہ صبح سے شام تک کولہو کے بیل کی طرح چلتا رہتا۔ بعض دفعہ مجھے خود سے نفرت اور کراہت بھی ہوتی۔ لیکن میں مجبور تھا کہ مجھے پردیس میں بنیاد بنا کر آگے بڑھنا تھا۔ تمام ویٹرسز سفید فام تھیں۔ اُن میں زیادہ تر انگریز تھیں۔ جوان، حسین، گاہکوں کو مسکراہٹ سے اپنی طرف متوجہ کرتی ہوئیں کہ وہ ان کے سیکشن میں براجمان ہوں اور وہ زیادہ سے زیادہ بخشش (Tips) سے سرفراز ہوں۔ میں جب کسی ویٹرس کی میز صاف کرتے ہوئے اُسے دیکھتا تو وہ کھلی مسکراہٹ کا مظاہرہ کرتی۔ اُس میں اپنائیت بھی ہوتی، دوستی کی دعوت بھی اور بناوٹ کی جھلک بھی۔ لیکن شام میں ریسٹورنٹ بند ہونے پر کوئی بھی ویٹرس مجھ سے آنکھ نہ ملایا کرتی۔ بلکہ تیزی سے پوشاک بدل کر چل دیتیں۔ بعض کے بوائے فرینڈ ریسٹورنٹ کے باہر کھڑے بار بار گھڑی کو دیکھا کرتے اور بعض اپنے اپنے ٹھکانے کی طرف بڑھ جاتیں۔

فلور پر ایک نہایت پھرتیلی، ہوشیار اور اپنے کام سے مطلب رکھنے والی لڑکی بنام جینی کروک وِچ بھی تھی۔ وہ پولش نژاد تھی اور شہر وارسا کی رہنے والی تھی۔ چند دنوں کی رفاقت میں ہی میں نے جان لیا تھا کہ وہ بھی میری طرح غُربت زدہ اور مادی اشیاء سے محروم رہی ہے۔ وہ ہمیشہ ایک ہمدرد دوست کی طرح مجھ کو دیکھ کر مسکرا دیتی۔ روزِ اول سے ہی میں نے اس کے لب و لہجے اور اُس کے روّیوں میں مخلص پن پایا تھا۔ ایک روز اتفاق کچھ ایسا ہوا کہ لنچ بریک کے دوران ہم اسٹاف روم میں بیٹھے، اسٹاف کے واسطے پکا ہوا کھانا کھا رہے تھے کہ وہ اچانک مجھ سے پوچھ بیٹھی:

''کہاں سے ہو؟ انڈیا سے یا پاکستان سے؟''

''انڈیا سے''

''میرا بھی یہی خیال تھا۔'' پھر جینی نے چاروں طرف نگاہ دوڑا کر دبے دبے لہجے میں کہنا شروع کیا: ''سنو۔۔۔تم میزیں اتنی تیزی سے صاف مت کیا کرو۔۔۔ورنہ یہاں تک ہی رہو گے؟''

''مطلب؟''

''منیجر مسٹر کانن ایلن اپنے دفتر میں بیٹھا سب کچھ دیکھا کرتا ہے۔ وہ بگ برادر ہے۔۔۔اسے تم جیسا تیز، پھرتیلا اور اسمارٹ ورکر کہاں ملے گا؟''

''لیکن اگر میں ایسا نہیں کروں گا تو وہ مجھے کام سے نکال دے گا؟''

''نہیں۔ وہ ایسا نہیں کرے گا؟''

''کیوں؟''

''سفید لوگ یہ کام نہیں کرتے، جو تم کر رہے ہو۔۔۔یہی وجہ ہے

تم یہاں موجود ہو۔''

بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آ چکی تھی۔ لیکن میں اُس سے مزید جاننے کا طلب گار تھا۔لہٰذا خاموش رہا۔

''کیا تم نے کبھی سوچا ہے کہ گاہکوں کے جاتے ہی ہر ویٹرس تم کو کس ڈھنگ سے اشارہ کر کے میز صاف کرنے کو کہتی ہے؟''

جینی کی باتوں میں اتنا سچ تھا کہ میں خود میں اُتر گیا تھا۔

ان دنوں میں لندن کے ایک مضافات ایکٹن میں مقیم تھا۔ اُس رات میں اپنے چھ بائے آٹھ فٹ کے باکس روم میں دراز، کروٹیں بدلتا جینی کے انکشافات، ریسٹورنٹ کا ماحول، سخت گیر منیجر اور ریاکار ویٹرسز کے بارے میں مغز پچی کرتا رہا۔ایک بات میری سمجھ میں ضرور آ چکی تھی کہ میرا رنگ سفید فام لوگوں کو پسند نہیں ہے۔سفید قوم میں کسی ملک کو آزاد کرنے پر بھی اُن کے روّیوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔وہ وہاں کے باشندوں کو اُسی نظر سے دیکھا کرتے ہیں کہ وہ نیم خواندہ، کم عقل، کمزور دماغ اور کمتر نسل سے ہیں۔

جینی ہوشیار تھی اور عقلمند بھی۔ سنبھل سنبھل کر پاؤں رکھا کرتی تھی۔ وہ انگلش لینگویج کا کورس کر رہی تھی۔ اُسی کے سبب وہ ویزا حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہوئی تھی۔سوویٹ یونین کا کڑا نظام اور اُس کی آہنی گرفت پولینڈ ملک پر دوسری جنگ عظیم کے بعد حاوی رہی تھی۔ اُس کے پنجے سے رہائی پانا اتنا آسان نہ تھا۔لیکن جینی خوش قسمت تھی۔ برطانوی سفارت خانے کے ایک ذمہ دار رُکن کو ایک بھاری لفافہ پیش کرنے پر اُس کے پاسپورٹ پر مہر ثبت کر دی گئی تھی۔اب وہ لندن میں برسرِ روزگار تھی اور تعلیم کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ شام میں وہ ایک اسکول میں کبھی حاضری دیا کرتی اور کبھی غیر حاضر رہا کرتی۔اُن دنوں اس کا عشق ایک انگریز جوان کے ساتھ عروج پر تھا۔ ہفتے میں دو تین شامیں وہ اپنے عاشق مارک جیمز کی صحبت میں گزارا کرتی۔ وہ صحیح معنوں میں خوبصورت تھی۔ نیلی آنکھوں کے ساتھ جاذبِ نظر نقش اور معصوم مسکراہٹ کے ساتھ کھنکتی ہوئی آواز بھی پائی تھی۔اُس کا عاشقِ زار اُس کے گرد بھونرا بنا منڈلایا کرتا۔ وہ بھی اُسے دل وجان سے چاہتی تھی۔ وہ لوگ شادی بیاہ کے متعلق بھی سنجیدہ تھے۔لیکن اُن کے درمیان اپنے مذہب کی مختلف شاخیں کھڑی تھیں۔جینی کٹر پنتھی کیتھولک تھی، جبکہ مارک پروٹسٹنٹ تھا۔ یہ جان کر مجھ کو شدید جھٹکا لگا تھا کہ یہ جدید ملک بھی مذہبی فرقوں کی قید سے آزاد نہیں ہو پایا۔ مجھے اپنے دیش کے تناظر میں شعیہ/سُنی کے اختلافات کی بازگشت سنائی دیتی۔جن کے مسلک صدیوں سے الگ رہے تھے اور شاید تا قیامت الگ ہی رہیں گے؟ جینی کسی بھی قیمت پر عیسائیت کی بنیادی اور طاقت ور شاخ کو چھوڑنے پر آمادہ نہ تھی۔ اُس کا نقطہ نظر اپنی جگہ کمال کا تھا۔ اتفاق سے وہ میرا بھی نظریہ تھا۔

''آدمی جس گھرانے میں جنم لیتا ہے۔ وہ اُس خاندان کا مذہب، اقدار، رسم و رواج اور اخلاقیات کے سہارے نشو ونما پاتا ہے اور اُن ہی کے سہارے جہاں سے کوچ کرتا ہے''۔

''تو پھر تم لوگوں کی میرج کیسے ہوگی؟''

''مارک آزاد خیال کا جوان ہے۔ یونیورسٹی میں پہنچ کر اُس کے خیالات اور بھی آزاد ہوگئے ہیں۔۔۔۔وہ اکثر کہا کرتا ہے کہ آدمی کا دل ہی اُس کا گاڈ ہے اور وہی اُس کا چرچ بھی۔۔۔۔ہم رجسٹرار کے دفتر میں ایک دوسرے کو قبول کریں گے۔''

''واہ۔۔۔تو پھر تم لوگ میرج کب کر رہے ہو؟''

جینی بھی دنیا کی ہر لڑکی کی طرح شرما کر رہ گئی تھی۔ بولی:

''مارک کا یونیورسٹی میں آخری سال ہے۔ابھی میرے پاس بھی وقت ہے۔لینگویج ڈپلوما تو مل گیا ہے۔ آگے کمیونکیشن کورس کرنے کا ارادہ ہے۔فیس بھرنے پر ویزا ضرور مل جائے گا۔۔۔تمہاری پوزیشن کیا ہے؟''

''میری؟ مطلب؟''

''یعنی تم چھ ماہ کا ویزا لے کر یہاں آئے ہو یا ایک برس کا؟''

''نہیں جینی۔ میرے پاس تو پوری ایمگریشن ہے۔۔۔میں پڑھا لکھا شخص ہوں۔۔۔کئی کتابیں لکھ کر انعام بھی پا چکا ہوں۔۔۔تم سے ایک ذاتی سوال پوچھ سکتا ہوں؟''

''کیوں نہیں؟'' اُس نے بخوشی اثبات میں سر ہلا کر کہا۔

''اگر کسی وجہ سے تم کو ویزا نہ ملا تو؟''

میرے سوال نے اُسے سنجیدہ کر ڈالا تھا۔ جلد ہی مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔لیکن اس خیال نے مجھے تقویت ضرور بخشی کہ ہر شخص آزاد ہے اور پوچھنے کا ادھیکار بھی رکھتا ہے۔جینی نے پلیٹ کو ایک طرف سرکا کر کہا:

''اُس صورت میں مجھے پولینڈ لوٹنا ہوگا۔ میں ناجائز طریقے سے یہاں ایک دن بھی نہیں رہنا چاہوں گی''۔ یہ کہتے ہوئے اُس نے تیزی سے نظریں چُرا لیں اور پلیٹ کو اُٹھا کر سنک کی طرف بڑھ گئی۔

اُس کے حالات جان کر میں خوش نہ تھا۔اس لئے کہ ریسٹورنٹ میں وہ میری واحد ہمدرد تھی۔ مخلص دوست اور خیر خواہ بھی۔ میں آنکھیں بند کئے اُس پر اعتبار کر سکتا تھا۔ دیگر ویٹرسز تو مجھے محض استعمال کرنے کی غرض سے مُسکرا دیا کرتیں۔ میرے قد کاٹھ اور مردانہ حسن کی تعریف ضرور کرتیں۔اکیلے میں کبھی کبھی میں سوچا کرتا کہ میں اور جینی اُن ملکوں کے شہری ہیں جو برسوں تک بیرونی قوتوں کا شکار رہے ہیں۔میرا دیش دوسو برسوں تک انگریزوں کی ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کی دوغلی پالیسی کا شکار رہا اور غلام بھی۔ جبکہ پولینڈ دوسری جنگ عظیم کے اختتام سے موجودہ عہد تک سوویٹ یونین کے آہنی پنجے میں سانس بھرتا ہے۔ جانے وہاں کے شہری کب معاشی جبر اور تنگدستی سے آزاد ہوں گے؟ جینی مجھے بتایا کرتی تھی کہ وہاں کا نظام اِتنا سخت ہے کہ وہ ہر اُس شہری کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے جو اُس کڑے نظام سے فرار چاہتا ہے اور مغرب میں آباد

ہونے کی خواہش رکھتا ہے۔ اُس کے والد پارلیمنٹ کے دفتر میں کلرک تھے۔ ہر ماہ اُن کے بینک کا کھاتا دیکھا جاتا تھا۔ کہیں اُن کو مغرب سے کوئی رقم تو موصول نہیں ہو رہی؟ ایک بار اُن کے مکان کی تلاشی بھی لی گئی تھی، محض یہ جاننے کی خاطر کہ کسی کونے کھدرے میں اُس کے باپ نے کہیں کوئی خفیہ ٹرانسمیٹر یا ریڈیو تو نہیں لگا رکھا؟

مارک گاہے گاہے ریسٹورنٹ بند ہونے سے آدھ پون گھنٹے پہلے چلا آتا۔ اُس کی ہر ممکن کوشش یہی رہتی کہ وہ جینی کے سیکشن میں نہ بیٹھے۔ وہ کسی دوسرے سیکشن میں بیٹھ کر چائے کا بل ادا کرتا اور ٹپ بھی ہمیشہ چھوڑتا۔ وہ ویٹرسز سے چہک چہک کر باتیں کرتا۔ اُن سے مذاق بھی کرتا۔ مگر ان تمام کو علم تھا کہ وہ جینی کا بوائے فرینڈ ہے اور وہ دونوں بہت جڑے ہوئے ہیں۔

اب میں بھی مارک کو کچھ کچھ جاننے لگا تھا۔ دو تین مرتبہ جینی کے اصرار پر میں اُن کے ساتھ پب (PUB) میں بھی گیا تھا۔ ایک چھوٹی سی بیئر پی کر جوان پرقلیوں کو اکیلا کو چھوڑ کر چلا آتا۔ مارک بیالوجی (Biology) کا طالب علم تھا۔ انسانی بدن، اس کے تمام اعضاء اور اُن کی تمام حرکات کا دماغ پر اثر انداز ہونے کے متعلق معلومات رکھتا تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ انسانی دماغ کی ترقی سے ہی دنیا نے موجودہ شکل پائی ہے۔ ابھی اُس کا ارتقاء جاری ہے اور جاری ہی رہے گا۔ مگر انسانی دماغ خود میں نہایت پیچیدہ عناصر رکھتا ہے۔ اُس پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ وہ کسی بھی وقت کوئی بھی راہ اختیار کرنے کا اہل ہے۔ وہ کبھی بھی دوسروں کو گمراہ کرسکتا ہے اور خود بھی گمراہ ہوسکتا ہے؟ میں حیرت کا مارا اکثر سوچا کرتا کہ ابھی وہ بائیس تیئس برس کا بھی نہیں ہوا۔ لیکن باتیں عمر رسیدہ سیانوں کی طرح کرتا ہے۔ میں اُس کی ذہانت کو سراہتا تو وہ جینی کو دیکھ کر مُسکرا دیتا اور کہا کرتا:

''یہ میرا گلاب ہے۔۔۔۔ اس کی خوشبو سے میں سرشار رہتا ہوں۔۔۔۔ جینی کو پا کر میں کتنا خوش نصیب ہوں، بتا نہیں سکتا۔''

جینی آنکھیں موندے اپنا سر مارک کے کندھے پر رکھ دیتی اور اپنا بازو مارک کے بازو میں ڈال کر دُنیا کو فراموش کر بیٹھتی۔ ایک بار اُس نے مجھ سے کہا تھا:

''جینی پیرس دیکھنا چاہتی ہے۔۔۔۔ میرج کے بعد میں اپنے گلاب کو پیرس لے جاؤں گا اور وہیں ہم ہنی مون منائیں گے۔''

ریسٹورنٹ کا کاروبار جاری وساری تھا۔ البتہ وہاں ایک اہم تبدیلی ضرور رونما ہوئی تھی۔ مجھے قومی ویٹر کے رتبے سے اچانک ہی نجات مل گئی تھی۔ میرا مستقل ٹرے اٹھانے کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ میرا دل بلیوں دیر تک اُچھلتا رہا اور میں نے خود کو آسمان پر چہل قدمی کرتے ہوئے پایا۔ اس لئے کہ جب ریسٹورنٹ میں ایشیائی سیاح یا مقامی اپنے لوگ وارد ہوتے تو مجھ کو میزیں صاف کرتے ہوئے اور برتن اٹھاتے ہوئے دیکھ کر حقارت سے مونہہ پھیر لیتے۔ گویا میں انڈیا سے اسی حقیر کام کے لئے برآمد کیا گیا ہوں۔ مگر میں اُن کو کیسے سمجھاتا کہ یہاں WORK FOR WORSHIP کا تصور قائم ہے۔

درحقیقت ہوا یوں تھا کہ ایک شام کو میں ریسٹورنٹ سے نکلتے وقت مصوّر پال گوگاں کی تصویر ''TWO TAHITI WOMEN'' کو دیکھ کر اچانک رک گیا تھا۔ حالانکہ اُس تصویر میں فلور پر گھومتے پھرتے یا میزیں صاف کرتے ہوئے ہزاروں بار دیکھ چکا تھا۔ مگر جانے اُس شام کو اُس تصویر نے میرے پاؤں کیوں پکڑ لئے تھے؟ اُن دونوں عورتوں میں سے ایک نے پھولوں سے لدی رکابی اُٹھا رکھی تھی۔ جبکہ دوسری عورت نے اپنا سر پہلی کے کندھے پر اسی انداز سے ٹکا رکھا تھا گویا ان کے درمیان جنسی تعلقات دیر سے قائم ہوں۔ میں تصویر کے لال، پیلے، نیلے اور سبز رنگوں کی ہلکی، گہری آمیزش میں ڈوبا ہوا تھا۔ لیکن منیجر ایلن چند قدموں کے فاصلے پر کھڑا، ماتھے پر تیوریاں چڑھائے مجھے لگا تار گھورے جا رہا تھا۔ میں تصویر میں نئے نئے معنی تلاش کر رہا تھا کہ میرے کانوں میں منیجر کی کرخت آواز ٹکرا گئی:

''مسٹر دیو۔ مجھے ریسٹورنٹ کا دروازہ بند کرنا ہے۔ مگر تم تصویر میں یوں کھوئے ہو جیسے اس آرٹسٹ کو مدت سے جانتے رہے ہو؟''

''ہاں۔ اس آرٹسٹ کا نام پال گوگاں ہے۔ فرانس کا رہنے والا تھا۔۔۔۔ اسٹاک بروکر تھا۔ مگر تصویریں بنانے کا شوق اور آگ اُس میں بھری پڑی تھی۔۔۔۔ بیوی بچوں کو چھوڑ کر وہ وان گاگ کے پاس بھی چند روز رہا تھا''۔

''پھر؟'' اُس نے اتنے گہرے طنز اور یقین کے ساتھ کہا تھا کہ وہ بذاتِ خود گوگاں کے حالاتِ زندگی سے واقف رہا ہو۔

''پھر وہ تاہتی آئی لینڈ (TAHITI ISLAND) چلا گیا تھا۔۔۔۔ وہاں اُس نے شاہکار تصویریں بنائیں اور وہیں سفلس (SYPHILIS) سے مرا''۔

''بلیڈی ہیل۔'' وہ چیخ سا پڑا: ''تم اتنا کچھ پال گوگاں کے بارے میں جانتے ہو۔۔۔۔ میں تو اسی خیال میں تھا کہ تم صرف ٹرے اٹھانے اور میزیں صاف کرنے کو ہی پیدا ہوئے ہو۔''

میں ہونٹ کاٹ کر رہ گیا تھا۔ من میں آیا کہ آگے بڑھ کر سالے کے دانت توڑ دوں۔ مگر پردیس میں زندہ رہنے کا دائرہ گھوم کر رہ گیا۔

چند مہینوں بعد میری ترقی کر دی گئی تھی۔ میری جگہ سوڈان کا ایک سیاہ فام اسٹوڈنٹ رکھ لیا گیا، جو شام کو اسکول جایا کرتا تھا۔ تربیت کے بعد میرے پے پیکٹ میں بھی اضافہ کر دیا گیا تھا۔ میں فلور انچارج کا رُتبہ پا کر واقعی خوش تھا۔ اب میرا کام یہ تھا کہ گاہکوں کو مینو کارڈ پیش کروں۔ اُن کا آرڈر لے کر اُسے ویٹرس کے سپرد کر دوں۔ پھر کھانا پروسنے کے دوران ویٹرس کی مدد کروں۔ اب میں کمپنی کا سوٹ پہنے، ٹائی باندھے فلور پر شان سے گھوما کرتا تھا۔ ویٹرسز

مجھے تعجب سے دیکھا کرتیں۔اُن کے نزدیک میرا وقار بڑھ گیا تھا۔مجھ سے زیادہ تو جینی خوش تھی۔میرے سوٹ کی تعریف کرتے ہوئے کہا کرتی تھی:

''تم سوٹ میں بہت اچھے لگتے ہو۔اگر مارک میری زندگی میں نہ آیا ہوتا تو میں تم کو اپنا بوائے فرینڈ بنالیتی''۔

''کاش کہ ایسا ہوتا''۔میں مذاق میں کہتا۔اُس کے سپید سپید دانت چمک اُٹھتے۔

اب میری شعوری کوشش رہنے لگی تھی کہ میں جینی کے سیکشن میں زیادہ گاہک بیٹھاؤں۔لیکن دیگر ویٹرسز پر میرا ایسا کرنا گراں گزر رہا تھا۔دراصل میں چاہتا تھا کہ جینی کو کالج کی فیس بھرنے اور مزید ویزا حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔وہ اپنے عمر رسیدہ والدین اور چھوٹے بہن بھائیوں کی بھی مدد کرتی رہے۔لیکن جینی ہر بات کو بہت قریب سے محسوس کر رہی تھی۔ایک دوپہر کو لنچ بریک کے دوران اُس نے مجھے آڑے ہاتھوں لے لیا۔وہ غصّے میں بپھری ہوئی تھی:

''تم میری غیر ضروری طرف داری مت کیا کرو۔۔۔۔اصولوں کے مطابق چلو۔ورنہ تمام ویٹرسز میرے اور تمہارے خلاف ہو جائیں گی۔منیجر کا تم کو علم ہے ہی۔وہ بڑا سخت آدمی ہے۔تمہاری نوکری بھی جاتی رہے گی''۔

جینی کا مختصر سا لیکچر سُن کر میں واقعی محتاط ہو گیا تھا۔لیکن مجھے اُس سے زیادہ ہمدردی ہو گئی تھی۔

ریسٹورنٹ کا کاروبار حسبِ معمول جاری تھا۔لیکن مارک کا ریسٹورنٹ میں آنا کم ہو گیا تھا۔غالباً وہ اپنے گلاب کی خوشبو سونگھ سونگھ کر اوب سا گیا تھا،ایسا میرا خیال تھا۔وہ جینی سے بھی کم کم ملا کرتا۔مگر وہ کسی بھی طور مایوس ہونے میں نہ آئی۔بلکہ اُس کا کہنا تھا کہ مارک سالانہ امتحان کے لئے تیاری کر رہا ہے۔وہ دن رات محنت کر رہا ہے۔پھر وہ وقت بھی چلا آیا،جب امتحان گزر گئے۔لیکن مارک کی سرگرمیوں میں کوئی واضح تبدیلی نہ آئی۔جینی فکر مند اور پریشان رہنے لگی۔کام میں اُس سے چھوٹی موٹی غلطیاں بھی سرزد ہونے لگیں۔اُسے مارک کی وفاداری پر کچھ کچھ شبہ سا ہوا۔پھر عورت تو اپنے عاشق کی وفا اور بے وفائی کو دُور سے سونگھ لیا کرتی ہے۔ایک شام میں وہ مارک کو اطلاع کئے بغیر سیدھی اُس کے ہوسٹل میں پہونچ گئی۔اتفاق سے مارک اپنے کمرے میں تھا۔لیکن اکیلا نہیں تھا،کوئی انگریز لڑکی بھی وہاں موجود تھی۔جینی اُلٹے پاؤں وہاں سے پلٹ آنا چاہتی تھی۔مگر مارک نے ''مائی ڈارلنگ،مائی روز'' کہہ کر اُسے روک لیا۔مگر جینی آپے سے باہر ہو چکی تھی۔بے حد تلخ ہو کر بولی:

''میں ابھی اتنی ماڈرن نہیں ہوئی کہ تمہاری گرل فرینڈ نمبر دو کو اپنے ساتھ برداشت کرلوں۔۔۔۔گڈ بائے''۔

لیکن مارک کا ''مائی ڈارلنگ،مائی روز'' کہنے کا عمل جاری رہا۔اُس نے جینی کو زبردستی اپنی بانہوں میں لینا چاہا۔مگر وہ تو کب سے اپنے حواس کھو چکی تھی۔اُس نے ایک زوردار چانٹا مارک کے چہرے پر جڑ دیا اور سیدھی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ابھی اس نے دو تین قدم بھی نہ بڑھائے تھے کہ پیچھے سے آواز آئی:

''جینی،میں اس چانٹے کو اپنی موت تک نہ بھلا پاؤں گا۔مگر یہ چانٹا تم کو بہت مہنگا پڑے گا۔۔۔۔تم زندگی بھر پچھتاؤ گی۔۔۔۔میرے واسطے بھی اور اس ملک کے واسطے بھی۔۔۔۔گڈ بائے''

جینی کے واسطے یہ صدمہ ناقابلِ برداشت تھا۔اُسے خود کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔میں سمجھتا تھا کہ عورت جب گہری چوٹ سے دوچار ہوتی ہے تو وہ موت کے دہانے پر آن کھڑی ہوتی ہے۔اُسے خود کو سنبھالنا نہایت مشکل ہوتا ہے۔جینی کام کاج کے دوران بہت سی غلطیاں کرنے لگی تھی۔حتیٰ کہ وہ پانچ نمبر میز کا کھانا سات نمبر والوں کو پروسنے جا رہی تھی۔چونکہ میں اُس کی ذہنی کیفیت سے واقف تھا،بر وقت وہاں پہنچ کر معاملہ سلجھا دیا۔میں اُس کی نگرانی میں کامیاب بھی ہو رہا تھا۔رفتہ رفتہ اُس کی ذہنی حالت بدلی اور جب وہ گھنے بادلوں سے بالکل آزاد ہو گئی تو ایک روز اُس نے مجھ سے کہا ''اگر تم نہ ہوتے تو میں جاب (JOB) سے بھی گئی ہوتی اور ہسپتال میں ہوتی۔۔۔۔تمہارا شکریہ میں کیسے ادا کروں؟''

''جینی،میں نے تم کو ہمیشہ ایک الگ نظر سے دیکھا ہے۔۔۔تم دنیا کی ہر عورت سے الگ نہیں ہو۔۔۔۔وہ ہمیشہ مرد کی ہوس کا شکار رہی ہے۔۔۔۔یہ بتاؤ آگے کیا سوچا ہے؟

''یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی،آگے کیا کروں گی؟ ابھی میرے پاس کچھ وقت ہے۔۔۔۔سوچتی ہوں پولینڈ واپس چلی جاؤں۔۔۔۔ماں باپ،،بہن بھائی،بہت یاد آتے ہیں۔۔۔۔مگر لوٹتے ہوئے میں ڈرتی ہوں؟''

''کیوں؟ کوئی خاص وجہ ہے؟''

''ہاں۔وہاں سختیاں اور پابندیاں بہت ہیں۔میں تم کو بیان کر چکی ہوں۔۔۔۔جو آزادی میں یہاں پا رہی ہوں،وہاں رہ کر میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی''۔

''ہاں یہ تو ہے۔۔۔۔یہاں آزادی بہت ہے،مگر اخلاقیات کی بنیاد،بہت کمزور ہے''

جینی کا سر سینے کی طرف ڈھلک گیا تھا۔کیتھولک ہو کر بھی وہ گناہوں سے پاک نہ تھی۔اُسے افسوس بھی تھا اور دُکھ بھی۔وہ شادی سے پہلے مارک کے ساتھ آزادانہ طور پر تمام مراحل سے گزر چکی تھی۔اُس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

اُن دنوں وقت مجھ پر واقعی مہربان تھا۔کمپنی کے ڈائریکٹر میرے کام سے خوش تھے۔گاہکوں کے ساتھ میرا مہذب لہجہ،برتاؤ اور اُن کی ہر مانگ کو خوشگوار ڈھنگ سے پورا کرنا میرے کردار کا حصہ بن چکا تھا۔منیجر بھی میری ذمہ

داریوں کو سراہا کرتا اور مجھے فلور انچارج بنا کر وہ اپنے فیصلے پر نازاں تھا۔ ڈائریکٹرز بھی اُس کے اقدام پر خوش تھے۔

ریسٹورنٹ کا کاروبار روز کی طرح جاری تھا۔ باہر سڑک پر دھوپ چمک رہی تھی۔ موسم خوشگوار تھا۔ علاقہ سیاحوں سے اٹا پڑا تھا۔ اچانک میرے کانوں سے دُور سے آتی پولیس کی پانڈہ کار کی آواز پاں۔ پاں۔ پاں ٹکرائی۔ پھر وہ آواز نزدیک آ کر فضا میں شور مچانے لگی۔ لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ آئے دن وہ ہمارے ریسٹورنٹ سے گزر کر آگے بڑھ جایا کرتی تھی۔ مگر اس مرتبہ وہ عین ہمارے ریسٹورنٹ کے دروازے پر آن کھڑی ہوئی۔ تین بہ وردی پولیس والے پانڈہ کار سے اُترے۔ اُن میں ایک عورت بھی شامل تھی۔ کچھ دریافت کرنے پر دو کانسٹیبل سیدھا منیجر کے کمرے کی طرف سیڑھیاں اُتر گئے۔ تیسرا کانسٹیبل صدر داخلے کے عین وسط میں کھڑا ہو گیا۔ وہ نہ تو کسی گاہک کو اندر جانے دے رہا تھا اور نہ ہی کسی کو باہر جانے کی اجازت دے رہا تھا۔ ماحول میں بے چینی سی پیدا ہو چلی تھی۔ گاہک بھی پولیس کو وہاں دیکھ کر خوش نہ تھے۔ میں بھی ہر ویٹرس کی طرح حیران تھا۔ لیکن جینی کے چہرے کا رنگ بدلتے ہی ٹرے اُس کے ہاتھوں میں لرز اُٹھی تھی۔ میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اُسے یکبارگی کیا ہو گیا ہے؟ منیجر نے فون پر مجھے جینی کو فوراً دفتر میں بھیجنے کو کہا۔ اور جب میں نے جینی کو منیجر کا حکم سنایا تو اُس کا چہرہ ویران ہو گیا۔ میری سمجھ سے قطعاً باہر تھا کہ منیجر نے اُسے کیوں کر طلب کیا ہے؟ پھر پولیس کو دیکھ کر اُس کی حالت غیر کیوں ہو گئی تھی؟ تمام ویٹرسز جاننا چاہ رہی تھیں کہ پولیس کے آنے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ آخر ماجرا کیا ہے؟ میں نے اُنہیں گاہکوں کی طرف سے توجہ دینے کو کہا اور یقین دلایا کہ جلد ہی ہمیں حقیقت کا پتہ چل جائے گا۔

میری نظریں سیڑھیوں پر جمی ہوئی تھیں اور جمی ہی رہیں۔ میرا دماغ قبول کرنے کو تیار نہ تھا کہ جینی غیر قانونی طور پر اس ملک میں قیام پذیر تھی۔ وہ تو گذشتہ تین برسوں سے جائز طریقے سے یہاں مقیم تھی۔ میری سوچ کا دھارا بہہ رہا تھا کہ سیڑھیوں سے چند سر نمودار ہوئے۔ جینی نے ریسٹورنٹ کی پوشاک بدل کر اپنا لباس پہن رکھا تھا۔ اُس کا وینٹی بیگ لیڈی کانسٹیبل نے اُٹھا رکھا تھا۔ اور وہ دونوں کانسٹیبلوں کے درمیان اپنی پشت پر ہتھکڑی میں جکڑی سر جھکائے زمین میں گڑی جا رہی تھی۔ وہ تینوں اِدھر اُدھر دیکھے بغیر سیدھا پانڈہ کار کی طرف بڑھ گئے۔ میں بھاگا بھاگا سیڑھیوں سے اُتر کر دفتر میں داخل ہو گیا۔ منیجر صوفہ نما کرسی میں دھنسا ہوا نہایت سنجیدگی سے مجھ کو دیکھ رہا تھا۔ بولا: ''بیٹھ جاؤ''۔

میرے بیٹھنے پر اُس نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا:

''جینی ILLEGAL تھی۔۔۔۔ ناجائز طریقے سے یہاں رہ رہی تھی۔۔۔۔ اُس کے بوائے فرینڈ نے اُس سے شادی کرنے کا وعدہ کر رکھا تھا اور وہ اُسی اُمید پر رسک (RISK) لئے جا رہی تھی۔''

''تو اُس نے آپ کو بھی اندھیرے میں رکھا؟''

''نہیں۔ صرف تمہیں۔۔۔۔ وہ برسوں پہلے جب یہاں نوکری کے واسطے آئی تھی تو اُس کے پاس چھ آٹھ مہینے کا ویزا تھا۔۔۔۔ بعد میں مَیں خاموش رہا کہ وہ بہت اچھی ویٹرس ثابت ہوئی تھی۔ پھر وہ حسین بھی بہت تھی۔ پولینڈ بڑا غریب ملک ہے۔ کرائسٹ کسی کو غریبی نہ دکھائے۔ کینسر بن کر آدمی کو کھا جاتی ہے۔''

دفتر سے نکلتے ہوئے ہر پہلو میری سمجھ میں آ چکا تھا۔ بوجھل دل کے ساتھ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ایک ہی خیال میرے ذہن میں گردش کر رہا تھا۔

''کیا عورت اپنی بقا کی خاطر اس حد تک بھی خطرہ مول لے سکتی ہے؟؟''

تیسرے روز جینی کو ڈی پورٹ (DEPORT) کر دیا گیا تھا۔

کاش جینی نے مارک کے ساتھ سلسلہ ختم ہونے پر مجھے ہلکا سا اشارہ بھی کیا ہوتا تو میں اُس سے شادی کر کے اُسے مستقل قیام کا رُتبہ دلوا دیتا کہ مجھ پر کوئی قانونی پابندی عائد نہ تھی۔ مگر نصیبوں کا لکھا کون مٹا سکتا ہے؟؟ ہونی ہو کر رہتی ہے۔

۔ مشرقی اقدار کا احیا۔

مکرمی آداب!

اُمید ہے آپ اور اہلِ خانہ خوش و خرم ہوں گے۔ عرضِ احوال یہ ہے کہ نورِ چشم سمیر فاروقی سلمہٗ خیرت سے جوان ہو گئے ہیں لہٰذا کھونٹے سے باندھنے کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ اب آپ سے کیا پردہ، کھونٹا ہماری آدھی گھر والی سے مل گیا ہے۔ لڑکی کے والد اور ہم ایک ہی زلف کے اسیر یعنی ہم زلف ہیں۔

معاملاتِ نکاح و رخصتی بہ رغبت و رضامندی فریقین طے پا گئے ہیں۔ ولیمہ مسنونہ کا اہتمام انشاءاللہ ۲۴ جولائی کو علی گڑھ لان یونیورسٹی روڈ کراچی پر کیا گیا ہے۔

اس تقریبِ سعید میں آپ کی شرکت ضروری ہے۔ اوّل آپ کی دعائیں دولہا، دولہن کے لئے درکار ہیں، دوئم اس لئے کہ دانہ دانہ پر لکھا ہے کھانے والے کا نام اور دانے کا انشاءاللہ وافر بندوبست ہوگا۔

وقتِ مقررہ رات دس بجے ہے۔ اگر آپ نہیں آئے تو احتجاجاً ہم بھی نہیں کھائیں گے۔ اس طرح دانے ضائع ہو جائیں گے۔ آیئے گا ضرور انتظار رہے گا۔

''بیگی دا''

طاہرہ اقبال
(فیصل آباد)

جون جولائی کے روزے تھے اور کپاس کی بوائی کا موسم تھا۔ وڈی سرگی (فجر سے پہلے) جب کسان کھیتوں میں بھاپیں مارتے سورج کے بھٹے میں دِن بھر بھننے کی تیاری کر رہے ہوتے تو مولوی ابوالحسن مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے اعلان کرتا۔

''روزے دارو اللہ کے پیارو سحری کا وقت ہو گیا ہے کھانے پینے کا انتظام کرلو۔''

ٹریکٹر کے ساتھ ہل جوڑتے بھل آ بلی کی ٹرالیاں بھرتے اسپرے کی مشینیں پُشت پر جماتے کھاد بیج کی جھولیاں باندھتے کسان میلوٹی پگڑیاں منہ پر کھینچ مولوی کی نادانی پر حلق کے اندر ہی اندر تضحیک آمیز قہقہے اُنڈیلتے۔

''مُلّا! یا تُو روزہ رکھےّ یا تیرا رب رکھے جو چار پہر آسانوں کے ہنڈولے میں جھولے لیتا ہے اور خود تو مسیت کیٹھنڈے فرشوں پر پانی چھڑک دِن بھر ویلا سوتا ہے۔ پانچ اذانیں کوک دیں پانچ ٹیم ماتھا ٹیک لیا کبھی دھوپ کے کراہے میں اُمس چھوڑتی فصلوں پر زہریلے اسپرے چھڑک کبھی آسانوں کی دہکتی انگیٹھیوں تلے گوڈیاں کر سہاگے اور جندرے مار کبھی ہاڑ جیٹھ کی بھاپیں مارتی کھیتوں کی آوی میں کوزوں کی طرح دم پر لگ۔ جب پنڈے کا سارا پانی پیاسی مٹی چوس لے جاتی ہے اور جیب حلقوم سے چپہ بھر باہر اُلٹ آتی ہے تو پھر میں تجھ سے پوچھوں۔

''مُلّا روزہ رکھے گا اللہ کا پیارا بنے گا۔''

پرلی بہک سے کڑوے تمباکو کو سیاہ چقماق سی ہتھیلیوں میں مروڑے دیتے ہوئے سوہنا بغلیں بجاتا سینے کے بلغم میں ہنستا ''گلا جو دے رکھا ہے تجھے مولوی! وہ کالا خچر، لادو، جسے تو گلام محمد کہتا ہے۔ چاہے تو نمازوں کے لادے ڈال اُس پر چاہے تو روزوں کے بھار اُٹھوا اُس سے۔''

اللہ دِتے کے اکھڑ لفظوں اور سوہنے کی اجڈ ہنسی سے فوجی نصیر ڈر سا گیا، زبان کی نوک چھو کر کانوں کی لویں پکڑیں اور کلمہ طیبہ پڑھا۔

''ہر کوئی رب سوہنے کے حکم سے اپنا اپنا کام کر رہا ہے۔ کیوں ڈراتا ہے یار مُلّا! اگر ہم مٹی میں مٹی ہو محنت نہ کریں تو پھر تو گھی شکر کے ساتھ دو دو چپڑی کھا کر روزہ کیسے رکھے اور اگر ہم بھی تیری طرح نہا دھو روزہ رکھ سو رہیں تو پھر خون پسینہ ایک کر کے اناج کون اُگائے۔''

فوجی نصیر نے حقّے کے لمبے سوٹے میں آنکھوں کی مشفقتی جھڑیوں کو گچھا مچھا کھینچ فلسفیانہ انداز میں ناک سے دُھواں چھوڑا اور سرمئی لہریوں میں سے جواب کھوجا۔

''ہر ایک کی اپنی اپنی ڈیوٹی ہے مُلّا تجھے ربّ سوہنے نے نماز روزے دے دیئے۔ ہمیں مٹی اور مشقت دے دی۔''

مولوی ابوالحسن نے اذانِ فجر کے بعد انتظار کھینچا لیکن مسلمانوں کی اس بستی میں سے ایک بھی نمازی مسجد کی چوکھٹ پر نہ پہنچا۔

مولوی ابوالحسن کے دماغ میں دِن میں پانچ مرتبہ آنے والا خیال پھر آیا۔ یہ بستی چھوڑ دینی چاہیے یہاں قہر خداوندی نازل ہونے والا ہے۔ مسجد کے سامنے سے گزرتی سڑک پر سے چیختے دھاڑتے، ٹریکٹر ٹرالیاں، بھل صفائی کو جانے والے کسانوں کے جتھے عالم لوہار کی جگنیاں اور نوراں لال کے گیت الاپتے ہوئے گزرتے رہے۔ دُکانوں کے تھڑوں پر بیٹھے نوجوان فلمی گانوں کی تال پر اپنی معشوقوں کو ننگے اِشارے اور جملے کستے تو جیسے بھڑوں کے چھتّے میں دھواں دھکا دیا گیا ہو۔ زہریلے ڈنگ ناک کی کرکری پھنک اور کانوں کی لویں ڈ نگنے لگے۔ مولوی ابوالحسن نے کانوں کی باوضو لویں چُھو کر ایک بار پھر توبہ تائب کی اور اپنے لڑکے کو بالمقابل کھڑے ہونے کا اِشارہ کیا۔ کاش اُس کی ساتوں بیٹیوں میں سے کوئی ایک لڑکا ہو جاتی تو کم از کم گھر کی جماعت تو بن جاتی۔

وہ نیت باندھنے کو ہی تھا کہ مسجد کے دروازے میں سے غلاما سیاہ آندھی کا جھولا سا داخل ہوا۔ لمبی لمبی جاہنگوں سے اُٹھی تہمد کے ٹکڑے سے سیاہ چھال تنے جیسے گھٹنے ڈھانپتا مڑی تڑی اُنگلیوں اور کھکھڑی سے پھٹے تلوؤں والے گوبر کیچڑ سے لتھڑے پیر مسجد کی حوضی سے دھوتے ہوئے کامیابی بھرے سیاہ دھبوں والے زرد دانت باہر نکالے جیسے کہتا ہو۔

''آخر میں پہنچ گیا نا۔''

جماعت بن گئی تھی اور تکبیریں پڑھتے ہوئے مولوی ابوالحسن کا بستی چھوڑنے کا اِرادہ پھر متزلزل ہو گیا۔ حالانکہ اُسے معلوم تھا کہ غلاے کو نماز چھوڑ کلمہ بھی نہیں آتا، جب بھی سکھانے کی کوشش کی وہ اُونٹ سے دھانے کے اندر خالی الذہن مسکراہٹ کے ساتھ شرماتا جیسے کہتا ہو۔

'اس کی بھلا کیا ضرورت ہے آپ کا کام تو اس کے بغیر بھی چل جاتا ہے۔'

لیکن جب وہ مولوی ابوالحسن کے اِتباع میں سجود و قیام کرتا تو ابوالحسن کو وہم سا ہونے لگتا کہ کم از کم اس نماز میں تو وہ اُس سے زیادہ نمبر لے گیا ہے۔ نماز سے فراغت کے بعد وہ سرپٹ دوڑتا ہوا مالک کے کھیت میں جا کر جت جاتا اور نماز کے وقت کے عوضیانے میں کئی گنا زیادہ محنت چکا دیتا۔

با چھوں کے دونوں اطراف ہتھیلیاں کھڑی کر کے دِن رات میں کئی کوکیں پڑتیں۔

''گلاما آں ں گلا آ''

غلاما جہاں کہیں ہوتا رسّا تڑوا کر سیاہ خچر سا، سانڈوں جیسے ٹیڑھے میڑھے کھر بجاتا کھالے بنے ڈھائے ہل ویڑیں ٹاپتا کوک کی سیدھ میں آن ہواؤں سے اُترتا۔

شہتیر چڑھانے، اڑوڑی کے گڈے بھرنے، مرے ہوئے جانوروں کی کھال اُدھیڑ کر انھیں گاؤں سے باہر گھسیٹ کر پھینکنے، شرطیں پوری کرنے اور حلالے کروانے کے لیے گاؤں والوں کے پاس شاید ایک ہی شخص بچا تھا۔ ''گلا، گلاما، غلاما، گاما، غلام محمد۔'' جو سحری سے افطاری تک کھیتوں کی دہکتی بھٹی میں روزہ رکھ ایسی جگر توڑ محنت کرتا کہ گاؤں والے بھت اُڑاتے۔

کالا خچر، لادو، کمہار کا کھوتا، مشکی گھوڑا، کملا سانڈ، جس طرح وہ یتیمی کی کوکھ میں آپ ہی آپ پل گیا تھا۔ اسی طرح وہ ہاڑ جیٹھ کے اٹھ پہرے روزے رکھ جلتے بلتے کھیتوں کے کولہو سے جتا تنومند خچر کی طرح ہنہناتا رہتا۔

گاؤں کے نوجوان شرطیں بدھتے۔

غلاما تین روزے پانی سے رکھے گا اور نمک سے کھولے گا۔ غلاما شرط بدھنے والے کو سو روپیہ جتوا دیتا۔ گلا گڑ کے شربت کی پوری بالٹی پی جائے گا اور اُوپر سے پانچ کلو جلیبی بھی کھائے گا۔ پورے گاؤں کے مرد اور بچے چوک میں جمع ہوتے اور سب کے بیچ مداری کا بچہ جمورا یہ کرتب بھی دِکھا جاتا۔

گلام محمد رات کے دو بجے پرانے قبرستان کے بڑ سے پتّے توڑ لائے گا۔

شرط بدھنے والے چڑیلوں کے خونی دانتوں سے بھنبھوڑی ہوئی غلامے کی لاش کے منتظر ہوتے لیکن وہ پتّے توڑ کر زندہ لوٹ آتا۔

گاما اس مہینے تین حلالے کروائے گا۔

وہ شرط بدھنے والوں کو جیت کی جلیبی کھاتے دیکھ حبشی نژاد ٹوٹی ہوئی ہڈی والے پھیلے نتھنوں سے میٹھی مہک سونگھتا اور کامیابی سے چور شرمیلی مسکراہٹ میں گم ہو جاتا۔

مولوی ابوالحسن دُکھی ہوتا رہتا۔

''سن غلام محمد! یہ ناعاقبت اندیش تجھ پر غیر شرعی بدعتوں کا گناہ ڈال رہے ہیں۔'' ڈھیموں جیسے بے حس ڈیلوں اور بڑے بڑے حبشی نژاد جبڑوں کے اندر وہ پوری بتیسی کھول دیتا جیسے کہتا ہو۔

''مُلّا جی! میں جیسے آپ کی جماعت کھڑی کروا دیتا ہوں ویسے ہی ان کی شرطیں بھی پوری کروا دیتا ہوں۔''

ہاڑ جیٹھ ساون بھادوں کی چلچلاتی گرمی میں کیڑے مار ادویات کی اُمس چھوڑتی فصلوں کی حبس میں لتھڑے پتھڑے کسانوں کے منہ سے سورج کی آگ جیسے ہذیان نکلتے رہتے۔ کھیت میں روٹی پہنچانے میں ذرا دیری ہوئی لسی میں نمک زیادہ کھر گیا۔ روٹی پر دھری مرچ زیادہ باریک کوٹی گئی تو وہ اپنی عورتوں کو درانتیاں مار مار لہولہان کر دیتے اور زبان سے ''طلاق طلاق طلاق'' کا جھانپا برس پڑتا۔

موسم کی شدتوں میں سے ٹپک پڑی ایسی بے قابو طلاقوں کے حلالے کے نکاح مولوی ابوالحسن کو کروانے پڑتے کیونکہ وہ انھی کی غصیلی محنت سے چھ ماہی فصلانہ وصول کرتا اور بخوبی جانتا کہ ان غافلوں کی خود ساختہ شرع پر وہ دینِ اسلام کی شرع لاگو نہیں کر سکتا پھر بھی کٹے پروں کی تکلیف میں ایک بار پھڑ پھڑا تا ضرور۔

''غلام محمد نادان ہے۔ فاتر العقل ہے۔ شرعاً وہ نکاح کے قابل ہی نہیں ہے۔'' نمبردار حقے کا لمبا سوٹا گھڑ گھڑا کر پنچائیت میں بیٹھے ہر گھرانے کے ایک ایک معتبر کی طرف دیکھتے ہوئے مولوی کی نادانی پر آنکھ مارتا۔

''کیوں مُلّا جی! جب اُسے نماز کے کولہو میں جوتتے ہو اور روزوں کے لادے اُس پر چڑھاتے ہو، اُس وقت کیا وہ فاتر العقل نہیں ہوتا؟''

پنچائیت کا کوئی دوسرا معتبر مولوی کی بودی دلیل کا بھانڈا پھوڑتے ہوئے نمبردار کو داد طلب نظروں سے دیکھتا۔

''مُلّا جی! اگر وہ جماعت کھڑی کروانے کو پھٹ (فٹ) ہے تو پھر حلالہ کروانے کو بھی بڑا ٹیٹ (ٹائیڈ) ہے۔

مولوی زبان سے نکاح کے کلمے پڑھتے ہوئے دِل ہی دِل میں نعوذ باللہ کا وِرد بھیجتا۔

''آخر یہ نافرمان مذہب کی بیخ چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ مسجد اور مُلّا کو اپنی خرمستیوں کے لیے ڈھال کیوں بنائے ہوئے ہیں۔''

غلاما اُونٹ جیسے چھوچھ پھیلا بیلوں جیسی چتکبری بتیسی نکال دولہے کی طرح شرماتا۔

اب حلالہ کروانے والا اُسے اپنی بیٹھک میں لے جاتا۔ پیٹ بھر کر کھلاتا۔ غلاما دُلہن کا چہرہ دیکھے بنا بے سدھ سو جاتا۔ اگلی صبح حلالے والا طلاق کا گواہ بن مُلّا سے تصدیق نامہ لینے کو آ جاتا۔ کوشش کے باوجود مولوی ابوالحسن یہ بستی چھوڑ نہ پا رہا تھا کہ سترہ افراد کے کنبے کو یہی جاہل پال رہے تھے جو قسمیں بھی اپنی ذات کے حوالے سے نہ کھاتے۔

مُلّا کے رب کی سونہہ۔

مُلّا کے نبی کی قسم۔

مُلّا کے قرآن کی قسم۔

مُلّا کی میت کی سونہہ۔

مولوی ابوالحسن سنتا توبہ استغفار پڑھتا۔

''اپنے بیٹوں کی قسم کھاؤ مال ڈنگر کھیت کھلیان کی قسم کھاؤ ناواقفو بدبختو۔''

وہ رمیاں درانتیاں کسیاں پھاوڑے سروں کے اُوپر ہی اُوپر لہراتے۔

''مُلاّ! اپنی میت اور بانگ تک رہ سوہنہ قسم مال اولاد کے لیے نہیں
ہوتی رب سوہنے کو سو بھتی ہے قسم۔''
وہ تو دُعا بھی اپنے لیے خود نہ کرتے اسی کام کے لیے تو وہ اپنی محنت
میں سے مُلاّ کو ششماہی وظیفہ دیتے تھے اور جتاتے بھی تھے۔
''مُلاّ دُعا کر بارش ہو۔ دُعا کر فصل کو جھاڑ لگے دُعا کر دودھ پوت
بڑھے، فصلانہ لے گھوس مار حجرے میں سوتا نہ رہا کر۔
''ارے مور کھو! کبھی خود بھی دُعا کر لیا کرو۔ سفارشی دُعا بھی کبھی لگی
ہے۔ فوجی نصیر کی خام دانش اُس کی مشقت بھری جھریوں میں سمٹ آئی۔''
''مُلاّ جی! یہ غریب اَن پڑھ محنت کش اپنا خون پسینہ دہکتی چلم سی
دھرتی کو پلا دیتے ہیں پوہ ماگھ کی برفیلی راتوں میں کہرا جمے پانی باندھتے کئی
سانپ ڈسے مرجاتے ہیں کئی کا کلیجہ چڑیلیں پنجہ مار نکال لے جاتی ہیں لیکن
تمہیں فصلانہ برابر دیتے ہیں تا کہ ان کے اور رب کے بیچ واسطہ رہے۔ آپ دِل
سے دُعا کیا کرو مُلاّ جی! کسانوں کی سانسوں سے کیڑے مار ادویات کی بدبو اور
کریرے زرہ بیمار دانتوں کی چھتی جن کیمسکی ہوئی قمیصوں پر میل اور زرعی
ادویات کی تہیں چڑھی ہوتیں جیسے گنے کی راب کے ڈرم میں غوطے کھاتے
ہوں۔ مولوی جہاں سے گزرتا ہوکارے پڑتے۔
''مُلاّ جی! کوئی دم درود کوئی تعویذ دھاگا، تم پڑھے ہوئے ہو فصلوں کو
سوکھا کھا گیا۔ ٹیوب ویل چلوا چلوا ڈیزل کے ادھار میں لوں لوں جکڑا گیا۔ اللہ
سائیں سے مینہ کی دُعا کرو۔''
''ارے نافرمانو! خود کچھ نہ کرنا صرف غفلت اور جہالت کے
کوزے بھرتے رہنا''۔ مولوی ابوالحسن جلی ہوئی زرد فصلوں پر عبرت کی نگاہ ڈالتا
اور توبہ استغفار کا وِرد کرتا۔
نمبردار نے دخانی سانسوں تلے گلہری کی دم جیسی مونچھوں کو
پھڑ پھڑاتے ہوئے آخری فیصلہ دیا۔
مُلاّ چلاّ کاٹو جو یہ کر سکتے ہیں وہ یہ کرتے ہیں گیارہویں کا ختم
دلاتے ہیں محرم میں گڑ کے شربت کے کوزے بانٹتے ہیں۔ منتیں مانتے چڑھاوے
چڑھاتے ہیں ہر فصل پر میٹھی سلونی دیگیں پکا ختم دلاتے ہیں۔ مسجد میں جمعرات
بھیجتے ہیں قبروں والے سائیں کو تین ٹیم روٹی بھجواتے ہیں جوان کا کام ہے وہ یہ
کرتے ہیں جو تیرے کرنے کا ہے تو کر مُلاّ۔''
مولوی ابوالحسن نے مسجد میں اعلان کیا۔ گاؤں کے سارے مرد
ریڑے میدان میں بعد از نمازِ ظہر نماز استسقا کے لیے جمع ہو جائیں۔
مولوی جب نمازِ ظہر کے بعد میدان میں پہنچا تو عجب تماشا دیکھا۔
روڑوں والے ریتلے ٹیلے پر غلاما ایک ٹانگ پر کھڑا تھا اور اُس کے گرد جمع تماشائی
تالیاں پیٹتے ہلا شیری دیتے بکرے بلاتے دور سے ہی چیختے۔
''مولوی! پرے پرے گلاما چلاّ کاٹ رہا ہے جب تک مینہ نہیں
برستا ایسے ہی ایک ٹانگ پر کھڑا رہے گا''۔ دوپہر ڈھلنے لگی، غلامے کی پگھلتی لک
سی جلد پر سیاہ آبلے پڑنے لگے۔ خام ڈیزل سا پسینہ نچڑتا باسی ریت کو بھگوتا رہا۔
جس کے گرم بخارات اُڑ اُڑ کر شاید آسمان پر بادل بنتے تھے۔ مولوی کو وہم سا ہوا
کہیں بارش نہ برس پڑے پھر تو یہ جاہل اسی گلے کو سائیں بابا بنا لیں گے اور بات
بے بات کہیں گے، مُلاّ چلاّ کاٹتا ہے کہ ہم گلے سے کٹوا لیں۔''
وہ کانوں کی لوؤں کو چُھوتے ہوئے عصر کی اذان کے لیے واپس
پلٹا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اس ہنگامے اور شور میں اذان کی پکار کا جواب دینے
والا ایک بھی نہیں۔ آج تو گلا بھی نہیں، لیکن مسلمانوں کی بستی میں اذان نہ گونجے
تو پھر۔۔
تبھی مجمع کا شور بھیانک گھن گرج میں تبدیل ہو گیا۔ غلامے کی
سیاہ مہیب چٹان تڑخ کر گری جیسے کوئلے کی کان منہدم ہوئی ہو جیسے بھٹی میں
اُبلتے لک کا سیال بہہ نکلا ہو چیختے دھاڑتے مرد گھٹنوں گھٹنوں تپتی ریت میں
دھنسے غلامے پر گھونسوں اور ٹھڈوں سے ٹوٹ پڑے''اوئے کالا خچر خنزیر کی
اولاد تھوڑی دیر اور کھڑا رہتا تو مینہ بس برسنے کو ہی تھا۔''
نمبردار دھاڑا۔
او ماں کے یارو! میں نے کہا نہ تھا کہ اسے کمر کمر تک ریت میں
پورو یہیں کھڑا کھڑا مرجاتا لیکن گرتا تو نہ۔''
مولوی ابوالحسن نے خدا کا شکر ادا کیا کہ بارش نہیں برسی۔
نرم دِل عورتیں سحری افطاری روٹی پکالے آتیں۔
''مولوی جویا اتوں قہر گرمی دا گھا پٹھا کرتے مال ڈنگر کی ٹہل سیوا
کرتے تنوروں پر دس دس پور روٹیوں کے لگاتے ٹیم ہی نہیں لگتا۔ مُلاّ جی! مڑکے
(پسینہ) سے بھیگی اوڑھنیاں نچوڑیں تو آپ چاہے وضو کر لو روزے رکھ تو نہیں
سکتیں پر رکھوا تو سکتی ہیں نا۔ مُلاّ جی دُعا کرو اللہ سات بیٹیوں اُوپر تو بیٹا بخش
دے۔ پھنڈر بھینس لگ جائے۔ وِکی ہوئی بھینس کو اللہ کٹی دے۔''
''بی بیبیو! غلام محمد کو رکھواؤ روزہ اُسے پکا کر کھلانے والی کوئی نہیں
ہے۔ زیادہ ثواب ملے گا۔۔''
مولوی چارخانہ رومال کے گھونگھٹ میں نظریں حجرے کے فرش
میں گاڑے رکھتا، عورتیں اُس کے پردے کو بٹ بٹ دیکھتیں ایک دوسرے کو
چپے دیتیں۔
''ہائے نی مرد ہو کر زنانیوں سے پردہ کرتا ہے۔ اللہ سائیں کا حکم آیا
ہے مرد عورتوں سے پردہ کریں۔''
نہ مُلاّ جی! اس خچر کو کھانے کی کیڑی لوڑ ہے۔ اُسے کوئی نماز
روزے کی سر سمجھ ہے بھلا وہ تو تیری ریس میں بھوک کاٹتا اور ٹکریں مارتا ہے اُس کا
نماز روزہ کوئی لگتا ہے بھلا۔۔''
مسجد کی صفوں پر ٹکریں مار مار غلامے کے کالک زدہ بجھے دیئے سے

ماتھے پرمستا پڑ گیا، جسے مُلّاً محراب کہتا،تو گاؤں کی عورتیں اوڑھنیاں منہ میں دبا دبا ہنستیں۔

گلا کملا میت کا دیا بن گیا اس میں جمائیاں کا کڑوا تیل ڈالو۔''

ایک رات نمبردار نے اپنے ڈیرے سے''اوملاً'' کی ہانک مارنے کی بجائے بلاوا بھجوایا۔ بلانے والے نے زبان کی طنابیں تالو میں کھینچ ہونٹ سیاہ چھال سی اوک میں چھپا کر سرگوشی کی۔

''مُلّاً جی! ڈیڑے پر حاضری آئی ہے۔مولوی جانتا تھا ایسے خفیہ بلاؤں کا مطلب غیر شرعی وارداتوں پر مذہب کا ٹھپہ لگوانا ہوتا ہے لیکن نمبردار کے بلاوے کو ٹھکرانا مسجد کی سیپ کو ٹھکرانا تھا۔

مولوی کو دور سے دیکھتے ہی نمبردار نے دُھائی مچائی۔

بڑا پاپ مُلّاً جی مہا پاپ۔''لیکن دین اسلام میں پردہ پوشی کا حکم آیا ہے۔اس گندی بھتی پر نکاح کی چادر ڈالو۔عیب کبیب جو کچھ بھی ہے اس کا جلد چھپ جانا ضروری ہے۔

مولوی نے چارخانہ صافہ سَر سے اُتار کر زور سے جھٹکا جیسے اس پر اُڑ کر پڑ جانے والی گندگی جھاڑ رہا ہو۔سامنے کیکر سے بندھی بھینس کے اِردگرد کھلا سانڈ گھوم رہا تھا۔گاؤں بھر کے بچے اور نوجوان دائرہ بنائے سانڈ کو ہلاشیری دے رہے تھے۔

نمبردار نے پکار کر پوچھا۔

''اوئے! مُلّاً ئی ہوئی کہ نا۔''

''نمبردار جی! ابھی کام ٹھنڈا ہے۔''

''پر ادھر تو کام گرم ہے۔''

نمبردار نے رانوں پر ہاتھ مارے۔

''اگر بدبخت حمل گراتی ہے تو یہ قتل ہے ایک معصوم جان کا ناحق خون، اس کی سزا پوری بستی پر آئے گی۔مولوی جی! قتل بڑا جرم ہے کہ گناہ کا چھپا لینا۔''

مولوی کے جواب سے پہلے پنچائیت نے دھائی مچائی۔

بناشک ''قتل'' مُلّاً جی! مٹی پاؤ دو بول پڑھاؤ۔''

بچوں نے اِشتعال انگیز تالیاں بجائیں نوجوانوں نے سانڈ کی مردانگی پر لذیذ نعرے بلند کیے بھینس لگ گئی تھی۔

''مولوی جی! دِن رات کھیت کھلیان میں اندھیرے اُجالے میں بیچاریوں کو بھورے (مشقت) کرنا پڑتے ہیں ہر طرف سانڈ دمیں سونگھتے پھرتے ہیں ہماری آپ کی بہو بیٹیوں کی طرح غریب پردے میں تھوڑی بیٹھ سکتی ہیں، جب موقعے بہت ہوں تو پھر بندہ بھولن ہار غلطی تو اماں حوا سے بھی ہو گئی تھی۔مُلّاً جی اللہ ستار ہے غفار ہے، نبی بھی لج پال ہے پھر ہم آپ نشر کرنے والے کون ہوتے ہیں۔۔۔''

بھینس کا مالک ملائی کی مبارکبادیں وصول کرتا بھینس کو تھپتھپاتا باڑے کو لے جا رہا تھا۔مجمع ٹوٹ کر اب مولوی کے گرد جمع ہو گیا تھا۔

مولوی ابوالحسن نے قفس کی آخری پھڑ پھڑاہٹ لی۔

''حاملہ عورت کا نکاح غیر شرعی ہے۔نمبردار جی بستی پر قہر خداوندی نازل ہو جائے گا۔۔۔''

''مولوی جی پھر کوئی رستہ نکالو آپ دِین اسلام کے عالم ہو قرآن کے حافظ ہو نماز روزے کے محافظ ہو آپ جو کہو گے وہی شرع ہو جائے گی۔آسمانوں سے انکار تھوڑی نازل ہو گا۔چلیں پوچھ لیں اپنے رب سے آپ کی تو گل بات رہتی ہی ہو گی نا۔۔۔''

نمبردار دین اسلام میں پردہ پوشی کی اَن گنت مثالیں گنواتے ہوئے پوروں پر پٹاخ پٹاخ بوسے دیتا رہا اور پنچائیت اُس کی پیروی میں سبحان اللہ، سبحان اللہ کے نعرے بلند کرتی رہی۔

''آخر آٹھ ماہ کی حاملہ سے عقد کرنے کو کون تیار ہو گا۔''

مولوی کے اس احمقانہ استفسار پر پوری پنچائیت کے گدگدی ہوئی۔نمبردار نے لمبا کش لے کر تضحیک آمیز آنکھ دبائی۔

''مولوی جی! یہ آپ کی پریشانی نہیں بندوبست ہے ہمارے پاس۔''

غلاما اپنے بڑے بڑے جبڑوں کے اندر مسکرا رہا تھا۔تارکول سی سیاہ چمکتی رنگت میں سے چکنا چکنا روغن چھٹتا تھا۔لال سرخ مسوڑھوں کے اندر زرد دانت سچے سونے کی طرح چمکتے تھے اور وہ کندھے پر گردن ڈھلکا شرماتا جیسے کہتا ہو۔

''مولوی جی! میں آپ کی جماعت نہیں پوری کرواتا کیا؟ آپ کے روزے نہیں رکھتا؟ آپ میرا نکاح نہیں پڑھوائیں گے؟''

آٹھ ماہ کی حاملہ لال تلّے دار دوپٹے میں چھپنے سے زیادہ اُمڈتی چھلکتی پڑ رہی تھی۔

''مولوی جی! بسم اللہ پڑھو پردہ ڈالو اس حال میں پنچائیت میں بیٹھی کیا یہ گدھی اچھی لگتی ہے۔''

نمبردار نے ابوالحسن کے کمزور حوصلوں کو آخری دھکا لگایا۔

''غلاما غریب بنا سحری کھائے روزہ رکھتا اور نمک چاٹ کر کھولتا ہے۔چلیں روٹی پکانے والی مل جائے گی جھگی بس جائے گی اس کی مُلّاً جی۔تیرے میرے بوہے پر رولتا ہے غریب۔''

پوری فضا میں اسپرے کی زہریلی بو رَچ بس گئی تھی۔تنوروں میں ہانڈیوں بھرولوں میں لسّی کے مٹکوں میں کسانوں کے جسموں میں سانسوں میں گھاس چارے جڑی بوٹیوں میں جیسے پوری دھرتی و آسمان زہر میں گندھے ہوں کپاس کے پودے ابھی زمین سے سر نکال کر خود کو سیدھا نہ کر پائے تھے کہ

بیماریوں نے آن پکڑا، زرد ٹہنیوں پر کملائے سکڑے ہوئے پتے جیسے رُوٹھے
ہوئے بچے منہ بسورتے روتے ہوئے کسان دِن بھر اسپرے والی مشینیں کمر سے
باندھے متعفن سانس چھوڑتی فصلوں پر زہر چھڑکتے کئی ایک کو زہریلے اسپرے
چڑھ جاتے کھٹا پلانے سے زیادہ بچ جاتے کئی مر جاتے، جانور زہریلا چارہ کھا
مرنے لگے۔ بھینسیں دودھ گھٹا گئیں۔ نہروں میں بندیاں آ گئیں۔ ڈیزل سونے
کے بھاؤ بکنے لگا۔ کھاد نایاب ہو گئے۔

مولوی ابوالحسن جدھر سے گزرتا ہوکا راپڑتا۔

''مُلاّ جی! کوئی دم درود کوئی تعویذ دھاگہ۔ رب کو عرض گزارو بندوں
پر رحم کرے۔''

مولوی ابوالحسن نے تنہا مسجد میں جمعے کا خطبہ دیا۔

''اے لوگو! خدا کے احکامات اور نبی کی شرع سے مذاق مت کرو۔
بستی پر قہر خداوندی نازل ہو جائے گا۔''

''اے ہے قہر خدا کا۔۔۔ مُلاّ بھی بادشاہ بندہ ہے۔''

وہ کھال کے پینڈے میں متعفن پانی اوک بھر پیتے کھالے بنے
کھودتے حلق میں بھری دھول میں قہقہے بلیتے۔

''مُلاّ! چہار پہر کھیتوں کے بیلن میں نچڑتے ہیں۔ کہاں ہیں پاک
کپڑے کہ نمازیں پڑھیں، تُو تو مُلاّ چٹا بانا کر کے میت کے حجرے میں ویلا
جمعراتوں کے حلوے کھاتا ہے۔ رب بھی اُنھی کا پیٹ بھرتا ہے جن کا پہلے پھولا
ہوا ہے۔ جب بھی مار آئی ہم غریبوں پر ہی آئی۔ سوکھا پڑا تو سب سڑ گیا مینہ برسا تو
سب بہالے گیا۔ ارے مولوی تو میت کے گنبد میں بیٹھا ویلیاں کھاتا ہے۔ رب
سوہنے کو ہماری پریشانیوں سے آگاہ کیوں نہیں کرتا۔

مولوی ابوالحسن کانوں کی لویں چھو کر توبہ استغفار پڑھتا۔ وہ اس
موقع پرست جہالت کے خلاف فتویٰ کیسے دیتا کہ اگر ان کی فصل ہو گی تو اسے بھی
فصلانہ ملے گا۔ عورتیں کتاب کھلوانے کو جوتے سمیت جوڑے لائیں گی اور
جمعراتیں بھیجیں گی اور ہر مشکل میں حلوے پکا کتاب کھلوانے آئیں گی۔

''مُلاّ جی! ذرا کتاب کھول کر بتاؤ میرا مندری چھلاّ کس نے چرایا،
میرے شوہر پر تعویذ کس نے ڈالے۔''

مولوی کے بولنے سے پہلے ہی نشانیاں وہ خود ہی بتاتی چلی جاتیں۔

''مولوی جی! کیری آنکھ والی ہے نا پیر میں .... ہے نا، گال
پر مسہ ہے نا۔''

پھر ماتھا پیٹ کر کامیابی بھری چیخ مارتیں۔

''بوجھ لیا وہی کالے کی رن پہلے ہی پک تھا۔''

مولوی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ کتاب کی گواہی اُٹھا کر کالے کی
رن کے توپے اُدھیڑنے چل پڑتی۔ لیکن حلوے کی رکابی چھوڑ جاتی تو دوسری گڑ کی
تھالی بھرے آن بیٹھتی۔

مُلاّ جی! کتاب پھرولو بھینس کا دودھ کس نے باندھا چولہے کی راکھ
میں تعویذ کس نے دبائے۔ رضائیوں میں سوئیاں کس نے پروئیں۔ لسّی پر مکھن کم
کیوں چڑھنے لگا ہے۔ گویا غیب کے یہ سارے علم گڑ حلوے کی پلیٹوں کے رُوبرو
بولنے لگے ہوں۔۔۔

مہینے بھر بعد غلاما بیٹے کا باپ بن گیا جس کا نام اُس کی ماں نے نوید
رکھا گاؤں کے لڑکے غلامے کو ابو نوید کے نام سے چھیڑتے تو وہ خچر جیسے مضبوط
بدن کے اندر پھول سا کھلتا اور بچے سا کھکھلاتا، دولتیاں جھاڑتا اور لمبی لمبی ہچکو ہچکو
کرتا۔

اس نکاح کے بعد مولوی ابوالحسن کی کوشش ہوتی کہ غلامے کے
پہنچنے سے پہلے پہلے وہ نماز کی نیت باندھ لے لیکن وہ بڑے بڑے جبڑوں کے
اندر دخانی انجن سا ہونکتا کیچڑ گوبر سے لتھڑے عمر بھر جوتوں کی قید سے آزاد کھروں
پر بھاگتا ہوا آن پہنچتا اور مولوی کو نہ چاہتے ہوئے بھی جماعت کروانی پڑتی۔ اُس
شخص کی خاطر جو شرع کی صریحاً خلاف ورزی کروانے کا مرتکب ٹھہرا تھا۔ بعد میں
وہ اپنے لڑکے کو سناتا۔

''نہ کلمہ آئے نہ اللہ رسول ﷺ کا پتہ شریعت کو مذاق بنانے والے
آ جاتے ہیں جماعت کروانے۔''

جس روز مرادو دو مہینے کا بچہ غلامے کے پہلو میں سوتا چھوڑ کر کسی
اور کے ساتھ نکل گئی۔ غلاما اپنے سیاہ بدن پر اُداسی کے سارے رنگ اوڑھے پھٹے
پھٹے بنا پلکوں والے ڈیلوں میں سے میلا میلا پانی بہاتا رہا۔ بھوکا بچہ تانت کی
طرح اکڑتا اور پھر گچھا مچھا ہو کر روتا تو لگتا تنی ہوئی رگوں وریدوں میں سے پھٹ
کر قطرہ قطرہ بہنے لگے گا۔ لیکن جب وہ بوتل کے منہ پر لگے نپل سے دودھ پینے
لگا تو غلاما اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو کا وِرد مسلسل کرنے لگا۔ غلاما جو گونگا بہرا تو نہ تھا لیکن
یتیمی کی چپ اور بھیڑ بکریوں کی صحبت میں وہ جملے نہ سیکھ سکا تھا۔ ٹانواں ٹانوں
لفظ بول لیتا لیکن آج اِک سوگوار ردھم کے ساتھ لفظوں کا تسلسل اُس کے منہ سے
اُمڈا چلا آ رہا تھا۔ اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو اڑوس پڑوس کی عورتیں حیرت کی انگشت
شہادت ناک کی پھنک پر جمائے جمع ہو گئیں۔ کچھ روئیں کچھ ہنسیں۔ کیوں روتا
ہے جھلاّ جیسے اسی کا ہوا و کملا گلاما! پتہ نہیں کس راہی کی سٹ تھی پھینک کر چلی گئی
تیرا کیا لگتا ہے کیوں لوریاں سناتا ہے اُسے۔۔۔''

غلاما عمر میں پہلی بار رونے اور بولنے کے تجربے سے دوچار ہوا تھا
جی بھر کے رویا سر لگا لگا لوریاں سنائیں۔ اللہ ہو اللہ ہو اللہ۔

چوکیدار کے رجسٹر میں جب بچے کی ولدیت کے خانے میں غلام
محمد عرف گلا، لکھا گیا تو وہ بچے کی جھولی جھلاتا مزید اُونچے اور آزادانہ سُروں
میں لوری گانے لگا، جس کے لفظوں میں خود بخود تبدیلی ہو گئی تھی۔

اللہ ہو اللہ ہو گلے دا توں

اللہ ہو اللہ ہوں۔۔۔ گلے دا توں

سننے والے پھیپھڑوں کے اندر ہی اندر مخصوص گم دیہاتی ہنسی ہنستے۔

''اوئے گلے دانیں بیگی دا آ کھ (کیہ)''

دیہات کی روایت کے مطابق بچوں کے نام لینے کی بجائے اُن کے باپ کے حوالے سے پکارا جاتا ہے، مثلاً

وریامے دا، اللہ دِتے دا، گلامے دا

غلاما جب لوری کا وِرد کرتا تو لوگ پکار کر پوچھتے

او کیہڑے دااے۔ (یہ کس کا ہے؟)

وہ سیاہ چمک دار روغن جیسے چہرے میں شرماتا۔

''جی گلے دا''

اوئے خچراے تے بیگی دااے۔ (یہ تو بیگی کا ہے)

گاؤں میں کئی اور بچے بھی بیگی کے کہلاتے تھے یعنی جس کسی کے باپ کے بارے میں شک ہوتا وہ بیگی کے کھاتے میں ڈال دیا جاتا۔

غلاما بیلوں جیسی چتکبری بتیسی پوری کھول دیتا۔

''نہیں اللہ دا گلے دا بندے دا۔ اللہ ہو اللہ ہو۔

اُس روز مولوی ابوالحسن جماعت نہ کرواسکا، وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو پہلو بہ پہلو کھڑا کر کے نماز سے فارغ ہوا تو درود شریف کا وِرد کرتے ہوئے اس گاؤں سے نکل جانے کی تدبیریں پوری سنجیدگی سے سوچنے لگا۔ آج پتہ نہیں غلامے کو باؤلا کتا کاٹ لے گیا تھا جو نہ پہنچ پایا تھا کہ جماعت ہی ہو جاتی تبھی '' اللہ ہو اللہ ہو گلے دا توں'' کا ہیجان خیز وِرد مسجد کے باہر سے اندر ٹپکا اور مسجد کا دروازہ پٹاخ سے کھلا، وہ سیاہ خچر ٹیڑھے میڑھے کھر ڈغ ڈغ مسجد کے پختہ فرش پر بجاتا ہاتھوں میں حرامی بچے کو اُٹھائے مولوی کے قدموں میں جھکتا چلا گیا۔

مولوی ابوالحسن کا ایک بار تو جی چاہا کہ اس گناہ کی پوٹ کو ٹھوکر مار کر مسجد کے حوض میں اُچھال دے لیکن یوں تو وضو والا پانی ناپاک ہو جائے گا پھر اُسے غلامے پر بے تحاشا غصہ آیا۔ اس گندگی کو مسجد جیسی پاک جگہ پر یہ کیوں اُٹھا لایا ہے۔ اُس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''اوئے اے بیگی دا''

وہ اُونٹ جیسے جبڑے کے اندر زرد بتیسی پر گہری سیاہ اُداسی لپیٹے کپاس کی چھڑی جیسی سیاہ موٹی شہادت کی اُنگلی آسمانوں کی طرف اُٹھائے وِرد کرنے لگا۔

اللہ دا گلامے دا بندے دا اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو۔

بچے کے بدن سے چھٹتی حرارت مولوی ابوالحسن کے قدموں پر بھٹی سی دہکی مولوی نے بچے کو چار اُنگلیوں کے پنجے میں یوں پکڑا جیسے مردہ چوہے کو دست پناہ سے پکڑ کر کوڑے کے ڈھیر میں پھینکنا ہو۔ یہ بیگی دا یہ ناپاک حرامی بچہ مرتے ہوئے کس قدر معصوم اور بے گناہ لگ رہا تھا۔ مولوی ابوالحسن کو اُس پر ترس آ گیا۔ مسجد کے حوض میں دو چار ڈوبے دیئے اور پھر حجرے کے ٹھنڈے فرش پر لٹا دیا۔

بخار کی شدت سے بے ہوش بچہ مسجد کے ٹھنڈے فرش پر بے سدھ پڑا تھا۔ سیاہ ہونٹ تپ کر لال بوٹی ہو گئے تھے۔

سیاہ کڑ کتے کاغذ جیسے نتھنے بھنبھیری کی طرح پھڑ کتے تو مولوی کے چہرے پر گرم راکھ سی جھڑتی، جیسے دانے بھونتی دائی کے چھاننے سے گرم ریت اُڑتی ہو۔

غلاما مسجد کے صحن میں کڑکتی دھوپ کے بھرے حوض میں ایک ٹانگ پر کھڑا تھا۔ سیاہ ننگے بدن سے چھٹتا پسینہ پکے فرش کو بھگو رہا تھا۔ سیاہ دیو، کالا خچر مشکی گھوڑا فاتر العقل غلاما لنگوٹ کسے جیسے کوئی بھکشو جیسے چلہ کاٹتا کوئی صوفی منش جیسے برگد کے پیڑ تلے گیان دھیان میں لکڑی بنا بدھا۔ جیسے یوگ لیے آلتی پالتی مارے کوئی سادھو۔

مولوی ابوالحسن کی توجہ بچے کی طرف تھی۔ درود شریف کے وِرد کے ساتھ پانی کے چھڑکاؤ سے اُس کی بجتی ہوئی نسیں اور دھکتی ہوئی سانسیں معتدل ہو رہی تھیں اور وہ دودھ کے لیے منہ کھول رہا تھا۔

سامنے ایک ٹانگ پر کھڑا ہوا غلاما سیاہ موٹی گردن کی تنی ہوئی نسیں جیسے کھولتا ہوا لہو دھڑ دھڑ پورے وجود کا دورہ کرتا ہو، جس کے سیال میں سے تین جملے بہتے تھے۔

اللہ دا، گلے دا بندے دا، اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو

گلا دا توں اللہ ہو اللہ ہو۔

دخترِ مشرق کا اعزاز

ملکہ برطانیہ کی جانب سے نئے سال میں اعزاز پانے والوں میں برمنگھم کی شبین بیگم بھی شامل ہیں جنہیں ایم۔بی۔ای کا اعزاز دیا گیا ہے۔ وہ معروف شاعر محمد اقبال بھٹی کی صاحبزادی ہیں اور ماں جی ٹرسٹ کی بنیادی محرک بھی ہیں۔ ان کا آبائی تعلق پاکستان کے ضلع راولپنڈی سے ہے جہاں سے وہ پانچ سال کی عمر میں برطانیہ آ گئیں۔ انہوں نے ہیمبر سائیڈ یونیورسٹی سے سائیکالوجی میں ڈگری حاصل کی۔ وہ ان دنوں سکاٹش اینڈ نیڈنٹ ایڈوکیسی الائنس میں بطور ڈائریکٹر خدمات انجام دے رہی ہیں۔ شبین بیگم نے ایم۔بی۔ای کا اعزاز ملنے کے بعد کہا کہ یہ سب ان کی محنت اور والدین کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے پاکستانی کمیونٹی پر زور دیا کہ وہ نہ صرف اس ملک کی ترقی کے لیے خلوصِ نیت سے کوششیں کریں بلکہ پاکستان کی ترقی میں بھی اپنا حصہ ڈالیں۔

قربان گاہ تاج پر

نجیب عمر
(کراچی)

اصفہان جسے نصف جہان بھی کہتے ہیں اس کے ایک دورافتادہ گاؤں میں سلجوق نامی ایک عمارت کار رہتا تھا۔ یہ اس کا آبائی گاؤں تھا لیکن اسے مزدوری کے لیے اکثر ایران کے بڑے شہروں میں جانا پڑتا۔ دراصل سنگ سازی اس کا آبائی پیشہ تھا۔خصوصاً سنگ مرمر، سنگ زبرجد اور سنگِ سرخ کا وہ ماہر سمجھا جاتا تھا۔ وہ ان پتھروں کو اپنی مرضی کی شکل میں ڈھال کر عمارت کاری میں استعمال کرتا تھا۔ چونکہ امراء اس قسم کا کام کرواتے لہٰذا وہ اکثر گھر سے باہر مختلف پروجیکٹ پر کام کر رہا ہوتا۔

آج کل وہ فراغت میں اپنے گاؤں میں تھا جہاں وہ اپنے دو بیٹوں اور بیوی کے ساتھ رہتا تھا۔ اسے خبر ملی کہ اس کا ایک ہم پیشہ دوست آج کل ہندوستان سے اپنی بیمار بیگم کی دیکھ بھال اور علاج کے لیے آیا ہوا ہے اور دوبارہ اس نے واپس جانا ہے۔ اس نے اپنے دوست کو کھانے پر مدعو کیا جہاں اس کا چھوٹا بیٹا شیراز مہمان کی خاطرداری میں اپنے والد کا ہاتھ بٹا رہا ہے۔ اس کا دوست اسے بتاتا ہے کہ شہنشاہِ ہند ابوالمظفر شاہجہاں ان دنوں آگرہ میں اپنی مرحوم بیوی کا مقبرہ تیار کروا رہا ہے۔ وہ ایسا مقبرہ بنوانا چاہتا ہے جو اس سے پہلے بنوائی نہ گئی ہو۔ اس کے لیے اس نے خزانے کے منہ کھول دیئے ہیں۔ ہزاروں کاریگر اور فنکار آج کل آگرہ میں ڈیرہ ڈالے ہوئے ہیں۔ تعمیری کام زور و شور سے جاری ہے۔ اسمٰعیل آفندی جس کا نگران ہے جو خود اعلیٰ پائے کا منتظم و عمارت کار ہے خود شاہجہاں فنِ تعمیر میں دسترس رکھتا ہے۔ وہ مقبرے کی عمارت ایسی چاہتا ہے جو اس کے خیال کے مطابق ہو یہ ایک خواب وخیال ہے جسے حقیقت کی دنیا میں لایا جا رہا ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ تم میرے ساتھ ہندوستان چلو۔ تمہارے جیسے سنگ ساز کی وہاں بڑی قدر ہوگی۔ عمارت کا ڈھانچہ مکمل ہونے کو ہے اب اعلیٰ قسم کے سنگِ مرمر سے اس کی تزئین کا کام شروع ہونے والا ہے اور مجھے یقین ہے کہ تم وہاں ہاتھوں ہاتھ لیے جاؤ گے۔ شیراز بڑے غور سے مہمان کی باتیں سنتا رہا۔ جب اس نے والد کو ہندوستان کا قصد کرنے پر آمادہ دیکھا تو خود بھی ہمراہی کی خواہش کا اظہار کرنے لگا۔ سلجوق بیٹے کو سمجھاتا ہے کہ دوردراز کا سفر ہے۔ ایک نیا ملک اور نئی جگہ۔ کارواں کے ساتھ جانا ہوگا۔ تم سفر کی صعوبتیں برداشت نہیں کرسکو گے۔ لیکن شیراز والد کی ہر شرط کو مانتے ہوئے انہیں اپنی شمولیت پر راضی کرلیتا ہے۔

کچھ دنوں بعد سلجوق اپنے دوست کے ساتھ شیراز کی معیت میں کاروان کے ساتھ دلی کا رخ کرتا ہے۔ ایک ماہ کے طویل سفر کے بعد وہ دلی پہنچتے ہیں اور وہاں سے آگرہ۔ سلجوق جب ماہرین کے سامنے پیش ہوتا ہے تو اہلِ ہنر ایک دوسرے ہنرمند کو شناخت کرنے میں کوئی غلطی نہیں کرتے۔ اور اسے فوراً تعمیراتی فورس میں شامل کرلیا جاتا ہے اور جلد ہی اس کے مشورے اور تنقید سے اُس کی حیثیت مقبول ہوجاتی ہے اور سلجوق بھی اس خواب کی تعمیر میں لگ جاتا ہے جہاں ایک دلگیر بادشاہ اپنی مرحوم اور چہیتی بیوی ممتاز محل کے لیے ایک خواب کو حقیقت میں بدلنے جا رہا ہے۔

اس مقبرے کی تعمیر میں معیار سے کہیں بھی سمجھوتا نہیں کیا جاتا۔ اعلیٰ سے اعلیٰ تعمیری سامان کا ڈھیر لگ رہا ہے۔ تقریباً ایک ہزار ہاتھی دن رات وزنی سامان دور دراز علاقے سے موقع پر پہنچاتے ہیں۔ کوئی بیس ہزار سے زائد کاریگر، فن کار اور مزدور اس خواب کو حقیقت میں بدلنے پر لگے ہوئے ہیں۔ دس سال کا عرصہ گزر چکا ہے اور لگتا ہے ابھی آدھے سے زیادہ کام باقی ہے۔

سلجوق ایک ماہر عمارت کار تھا لیکن یہاں کے انتظامات اس کے لیے بھی حیرت کا باعث تھے۔ اتنے بڑے پیمانے پر تعمیراتی کاوش اس نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ اسے اس بات پر بھی حیرت تھی کہ مقبرے کے لیے شہنشاہ نے دریائے جمنا کا جو کنارہ منتخب کیا تھا وہ کسی بڑی عمارت کے لیے ہرگز مناسب نہیں تھا۔ جب اس بات کا ذکر اس نے ایک مقامی کاریگر سے کیا تو اس نے ہنستے ہوئے بتایا کہ ہمارے یہاں مقولہ مشہور ہے کہ معاشرے کے تین قسم کے افراد اپنی ضد سے ہرگز پیچھے نہیں ہٹتے۔ ان میں ایک (بال ہٹ) بچے کی ضد، ایک (تریا ہٹ) عورت کی ضد، اور (راج ہٹ) شاہ کی ضد۔ اب یہاں شاہ نہیں شہنشاہ ابوالمظفر شاہجہاں جیسا۔ ایسے عظیم اور دھن کے پکے بادشاہ دنیا میں کم ہی دیکھے ہوں گے۔ جس نے اپنی مملکت کے تمام وسائل اس تعمیر میں جھونک دیے۔ وہ کیا بنانا چاہتا ہے یا تو اسمٰعیل آفندی جانتا ہے یا پھر شاہجہاں۔ ہم تو اپنے حصے کا کام کیے جا رہے ہیں۔ شاہ کے حکم سے اس علاقے کو پاٹ کر اتنا مضبوط کیا گیا کہ اس پر مجوزہ عمارت سے دگنا وزن بھی رکھا جائے تو اب یہ زمین اس کا بوجھ بڑی آسانی سے سنبھال سکتی ہے۔ یہ تمہارے آنے سے قبل ہوچکا ہے اس کے بعد ہی تعمیر کا آغاز ہوا تھا۔

دس سال گزرنے کے بعد سلجوق کے قویٰ مضمحل ہونے لگے۔ لیکن اس سے پہلے اس نے اپنا سارا ہنر اپنے بیٹے شیراز میں منتقل کر دیا تھا اور ایک دن رخصت لے کر اصفہان لوٹ گیا۔ لیکن اس کی خواہش تھی کہ وہ اس مقبرے کو مکمل ہونے کے بعد ضرور دیکھے۔ اسے یقین تھا کہ یہ ایک انتہائی شاندار اور عجوبۂ روزگار عمارت ہوگی۔ ساری دنیا میں اس کا چرچا ہوگا۔ اسے اس بنا پر فخر تھا کہ وہ اور اس کا بیٹا اس فقیدالمثال عمارت کی تعمیر میں حصہ دار ہیں۔

شیراز کو ہندوستان آئے پندرہ سال ہوگئے۔ اس نے یہاں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ اس کی شادی ہوچکی تھی۔ اس کا ایک بیٹا بھی تھا۔ اس دوران

باقی صفحہ ۷۵ پر ملاحظہ کیجیے

''کارِرفو''

سید مشکور حسین یاد
(لاہور)

بس ایک حرفِ ہُو سے تلاطم بپا کرو
آواز کے وضو سے تلاطم بپا کرو

نقش و نگینِ وقت میں بھر دو یقینِ بخت
لاریب کے لہو سے تلاطم بپا کرو

خُو باؤ ہاں خزاں کے خزانوں کی خوبیاں
یہ کیا کہ رنگ و بو سے تلاطم بپا کرو

قطرہ پہ رقص کرتا ہے دریا کا سارا زور
قطرہ کی قُطب خُو سے تلاطم بپا کرو

کھوئے ہوؤں کو ڈھونڈ کے لاؤ حضور میں
مت نام سے نمو سے تلاطم بپا کرو

پانی پہ رحم کھاؤ روانی پہ رحم کھاؤ
جادو کی آب جو سے تلاطم بپا کرو

ہے یادؔ موج موج توجہ کی منتظر
کارِ رفو رفو سے تلاطم بپا کرو
○

جمیل یوسف
(مری)

محیطِ موجِ نوائے سروش میں آؤں
تری نگاہ سے جی اُٹھوں، ہوش میں آؤں

مری تلاش کسی اور آئینے میں کر
میں وہ نہیں جو ترے چشم و گوش میں آؤں

شب فراق کی تنہائیوں میں عکس مرا
سکوتِ شام کے بحرِ خموش میں آؤں

کبھی میں کالی گھٹاؤں سے سائبان مانگوں
کبھی میں ابر کی صورت خروش میں آؤں

مجھے تو لمحہ موجود سے نہیں فرصت
میں کسی طرح غم فرداودوش میں آؤں

میں سُن رہا ہوں جو کہتے ہیں مجھ سے اہلِ خرد
وہ چاہتے ہیں کبھی میں نہ ہوش میں آؤں

میں جانتا ہوں جو کچھ آپ سننا چاہتے ہیں
میں کیسے گوش نصیحت ہوش میں آؤں

میں پی رہا ہوں تری نسیم وا نگاہوں سے
بہت محال ہے دنیائے ہوش میں آؤں

میں چکھ چکا ہوں کوئی اور ہی طرح کی شراب
میں کیسے حیلۂ بادہ فروش میں آؤں

کرشن کمار طُور

(دھرم شالہ بھارت)

یہ اور بات ہوئی زیست رائگاں ورنہ
رہے ہیں ہم بھی بہت زیب داستاں ورنہ

بس ایک ہم ہیں ستاروں سے جو چمکتے ہیں
یہ کائنات تھی خود میں دھواں دھواں ورنہ

اک اس کے قرب نے جھولی بھری جواہر سے
مرا سفر بھی یہاں رہتا رائگاں ورنہ

اگر یہ ہے تو ہے کاریگری محبت کی
وہ شخص میرے مقدر میں تھا کہاں ورنہ

یہ اور بات کہ سب خام کار نکلے ہیں
میں اس پہ رکھتا ہوں یوں تو کئی گماں ورنہ

ترے سلوک نے طرز خوشی سے آنکھ بھری
تھی غم وجود یہ میری نواح جاں ورنہ

ہمیں ہوئے ہیں گرفتار جان بوجھ کے طُورؔ
تھا اس کے عشق میں اندازۂ زیاں ورنہ

○

امین راحت چغتائی

(راولپنڈی)

بے خبری بھی جرم ہے جاناں اتنی بات بتائے کون
دل زخموں سے چُور رہے لیکن دل کے زخم دکھائے کون

اوس کے قطرے خشک ہوئے ہیں بادِ صبا کے جھونکے بند
خواب میں بھی اب کلیاں سوچیں، دیکھیں ہمیں جگائے کون

رات کے اندھیرے میں اپنی بستی جانا کیا مشکل
لیکن تیز ہوا کے رُخ پر دیکھیں دیا جلائے کون

ہم گیانی بن بیٹھے جب سے سوچ میں ڈوبے رہتے ہیں
گیان کی آگ جلا تو بیٹھے، گیان کی آگ بجھائے کون

ہر رہ گیر کے ہاتھ میں پتھر، آنکھوں میں بیدار ہوس
سوچ کے آنگن میں اب دیکھیں پھل کا پیڑ لگائے کون

سب کے ہاتھوں پر دھبے ہیں مجبوری، لاچاری کے
سر کو جھکائے سوچ رہے ہیں کس کے ہاتھ دھلائے کون

اندر حبس کا عالم لیکن ہم سب ننگے بیٹھے ہیں
ایسی حالت میں تم سوچو راحتؔ باہر آئے کون

○

ملک زادہ منظور احمد

(لکھنؤ، بھارت)

صبح کی تیز دھوپ میں اس کے سوا بہت ہوا
دل کی کلی نہ کھل سکی رقصِ صبا بہت ہوا

پہنی زرہ ہوس کی پھر سوچ کے میں نے آخرش
مقتلِ راہِ شوق میں کارِ وفا بہت ہوا

ہوگی ہر اِک دعا قبول قبلہ بدل کے دیکھ لو
کعبۂ شہریار میں سجدہ ادا بہت ہوا

پھرتی رہی برہنہ سر بانوئے شہرِ حُریت
کوئی مگر نہ لا سکا ذکرِ رِدا بہت ہوا

اُس کے بدن کی چاندنی فکر میں میرے ڈھل گئی
نازشِ فن کے واسطے رنگِ قبا بہت ہوا

یہ بھی خدا کی شان ہے رزم گہہِ حیات میں
زخم تو مجھ کو کم لگے حشر بپا بہت ہوا

○

خالد حمید شیدؔا

(یو۔ایس۔اے)

اے چاندرات جب تُو لبِ بام آ گیا
دردِ فراق کم ہوا ، آرام آ گیا

روشن ہوئے چراغِ دلِ سوگوار میں
تُو خم بدوش جب بھی سرِ شام آ گیا

عشاق تیری بزم میں سب مست ہو گئے
چھلکا تا آنکھ کا تُو اگر جام آ گیا

عاشق کو قید کچھ تری ایسی ہے دلفزا
اپنے پہ خود لگا کے وہ الزا م آ گیا

دلکش شکنجِ زلف ہے ایسا کہ دیکھ کر
خو د ہی شکار تیرا تہِ دام آ گیا

بدنام ہو کے نام جو اک تیرا کر گیا
کیسا یہ کام عاشقِ ناکام آ گیا

شیدؔا دلِ فگار کو کچھ مل گیا سکوں
جب بھی خیالِ یارِ دل آرام آ گیا

○

آصف ثاقب

(ایبٹ آباد)

کس حوالے سے ملیں ہم نے یہ پوچھا بھی نہیں
اک محبت کے سوا آپ سے رشتہ بھی نہیں

صبر کے پیڑ پہ افتاد پڑی ہے کیسی
پھل کا مذکور ہی کیا اس پہ تو پتا بھی نہیں

ہم مصوّر ہیں تصوّر سے محبت چاہیں
جس کی تصویر بنائیں اسے دیکھا بھی نہیں

جانے کس سمت گئے جاں سے گزرنے والے
وسعتِ دشت میں ایک وارثِ خیمہ بھی نہیں

کیسے لفظوں کو تکلّم کے اجالے بخشیں
اب خیالوں میں کوئی چاند سا چہرہ بھی نہیں

ایک الجھن میں پڑی ہے یہ جدائی کی گھڑی
جانے والا جسے جانا ہے وہ جاتا بھی نہیں

تم تو گھبرا کے ہمیں چھوڑ گئے ہو ثاقبؔ
غم کے میلے میں یہاں اتنا جھمیلا بھی نہیں

○

یوگیندر بہل تشنہ

(دہلی بھارت)

یہ کس دہانے پہ لایا ہے مجھکو مقدّر
دُور تا حدِّ نگاہ راستہ نہیں ہے۔

یہاں کی ہر شے اجنبی لگنے لگی ہے
کیا میرا اب جہاں سے رشتہ نہیں ہے۔

اتفاقاً آ گیا تھا شہرِ دل میں کوئی
داغ داغ کر کے جگر، وہ لوٹا نہیں ہے۔

نا شناسی کے دور میں کسنے ہے صدا دی
کوئی ہے ابھی، جو مطلبی بندہ نہیں ہے۔

کون مانگے روز و شب کا حساب مجھ سے
اُسکی صورت کوئی دلمیں جھانکا نہیں ہے۔

فکرِ امروز وخیال دیں وفردا
اب تو کچھ بھی جاں پہ اثر کرتا نہیں ہے۔

کس لئے ٹوٹ کر چاہتا ہے وہ ہر کس وناکس
ہر کوئی تو وفا آشنا ہوتا نہیں ہے۔

کہتے ہیں وہ اکثر، کہ تم ہو میرے اپنے
اور بے حسّوں سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے۔

کہئے کہئے اے طوطا چشمی، مصلحت کیسی!
تشنہؔ سے اب میرا کوئی واسطہ نہیں ہے۔

وقت کے ساتھ اُڑ رہے ہو، آوارہ، آوارہ
اور یہ کیا کہ تو کمر بستہ نہیں ہے۔

اپنی چُپ کا ڈھونڈتا ہے سبب تشنہؔ
اوراس کھنڈر میں کچھ بھی تو ملتا نہیں ہے۔

○

ڈاکٹر صابر آفاقی
(مظفر آباد)

فون پر بھی میرے یاروں نے عیادت نہیں کی
چند لمحوں کی بھی افسوس کہ فرصت نہیں کی

دل کے فرماں کے سوا ہم نے اطاعت نہیں کی
جان دے دی کسی فرعون کی بیعت نہیں کی

تم جوانوں کے مسائل سے نہیں ہو واقف
تم نے شاید کہ جوانی میں محبت نہیں کی

رنگ کی کوئی حقیقت مرے نزدیک نہیں
ایسی چیزوں کی مری آنکھ نے رغبت نہیں کی

کوئی دیوار گری ہے نہ عمارت ٹوٹی!
اب کے دھرتی نے کوئی ایسی شرارت نہیں کی

ہم بھی دستار کی تقدیس کے قائل ہیں مگر
کون ہے جس نے کبھی کوئی سماجت نہیں کی

دوست آئے گا تو احوال کہیں گے اس سے
دشمنوں سے تو کبھی ہم نے شکایت نہیں کی

ہم پذیرائی کریں خون جگر سے ان کی
آبِ چشمہ سے کبھی ہم نے سخاوت نہیں کی

ہم پہ ماحول ہے اس واسطے ناخوش صابرؔ
دوستی کی ہے کبھی ہم نے عداوت نہیں کی

رانا گنوری
(روہنی، دلی بھارت)

زخمِ دِل میں دِکھاتے دِکھاتے تھکا
درد اپنا سناتے سناتے تھکا

دی توجہ کسی نے نہ میری طرف
میں توجّہ دلاتے دلاتے تھکا

زخم بھرنے میں آیا نہیں آج تک
وقت مرہم لگاتے لگاتے تھکا

آپ آئے نہ آنے کا وعدہ کیا
آپ کو میں بُلاتے بُلاتے تھکا

تیز جھونکے ہوا کے بجھاتے گئے
میں تو شمعیں جلاتے جلاتے تھکا

اب مرا بوجھ اُتارو الٰہی! کہ میں
بارِ ہستی اُٹھاتے اُٹھاتے تھکا

تُو بنائے تو راناؔ بنے بات کچھ
ورنہ میں تو بناتے بناتے تھکا

○

تشنہ بریلوی
(کراچی)

اے کوچۂ ظلمت کے یارو کچھ تم کو خبر ہے یا کہ نہیں
قسمت میں تمہاری دوبارہ اب کوئی سحر ہے یا کہ نہیں؟

یہ دہشت و وحشت قہر وغضب یہ جبروتشدّد ظلم کی شب
اے اہلِ جہاں یہ قصّے بھی سُننے کا جگر ہے یا کہ نہیں

بغداد جو علم ودانش کا گہوارہ رہا تھا صدیوں تک
اس نام کا یارو دُنیا میں اب کوئی نگر ہے یا کہ نہیں

سب کھیل تماشے جاری ہیں سب دھندے جاری وساری ہیں
بغداد کے غم میں دیکھو تو اک آنکھ بھی تر ہے یا کہ نہیں

سفّاک ہلاکو ششدر ہے انگشت بدنداں ہٹلر ہے
تاریخ! ترے دامن میں بتا ایسا بھی کھنڈر ہے یا کہ نہیں؟

جب چل ہی پڑی ہو رسمِ جنوں پھر آتش وخوں پر حیرت کیوں
ہر پھول دہکتا انگارہ ہر غنچہ شرر ہے یا کہ نہیں؟

جس شوخ کی خاطر دنیا میں دل والے ذلیل وخوار ہوئے
کچھ اپنی ادا پر نادم بھی وہ رشکِ قمر ہے یا کہ نہیں

یہ کوچۂ قاتل ہے یارو اپنی یہی منزل ہے یارو
کیوں راہنما سے پوچھتے ہو آگے بھی سفر ہے یا کہ نہیں

○

غلام مرتضیٰ راہی
(فتح پور،بھارت)

جو خار زارِ اَنا راہ سے ہٹاتے بنے
تو ایک دوسرے کے پاس آتے جاتے بنے

اک ایسا حَلف بھی مجھ سے کبھی اُٹھاتے بنے
کہ زبان پہ سچ کے سِوا نہ لاتے بنے

اگر کسی سے مرے راستے میں آتے بنے
تو اس طرح کہ مجھے رہنما بناتے بنے

حصار کھینچ لیا اپنے آپ پر میں نے
کہ مجھ سے بے سروسامانیاں چھُپاتے بنے

جواب دے مری پرواز اُس بلندی پر
جہاں ستاروں کی مانند جگمگاتے بنے

کہاں سے ہو مری اک مُشتِ خاک سے تعمیر
بہت ہے اس سے جو دیوار بھی اُٹھاتے بنے

تمہیں جو چُننا ہو ان میں سے ایک کو راہی
تو سر کو جانے دو دستار اگر بچاتے بنے

○

ڈاکٹر شباب للت
(شملہ بھارت)

آ گیا وہ دن میاں بھگتو گے خمیازے بہت
ہم فقیروں پر کسے تم نے بھی آوازے بہت

جن کو اپنی کامیابی کا بڑا پندار تھا
ہم نے دیکھے ہیں بکھرتے اُن کے شیرازے بہت

تم نے جو قصّے کیئے منسوب میری ذات سے
تھی حقیقت اُن میں تھوڑی اور اندازے بہت

گھُٹ نہ جائے دم کہیں نفرت کے اس ماحول میں
کر لئے ہم نے مقفل دل کے دروازے بہت

بس وہی ہوگا رضا کو تیری جو منظور ہے
کام آئیں گے نہ کمپیوٹر کے اندازے بہت

شہر کے میلے میں یوں تو مہ وشوں کی بھیڑ تھی
ان میں چہرے تھے مگر کم اور تھے غازے بہت

ہم نے ٹھکرائے نجانے کتنی آنکھوں کے پیام
گُل رخوں نے ہم پہ کھولے دِل کے دروازے بہت

دیکھ لینا ہم یہ پنجرہ توڑکر اُڑ جائیں گے
بچ نکلنے کا تہیّہ ہو تو دروازے بہت

ہم شریف انساں شبابؔ اس گھر میں نامحفوظ ہیں
اس میں دیواریں تو کم ہیں چور دروازے بہت

ضیاء شبنمی
(ملتان)

کم ظریفوں کا جال سا پھیلا ہے شہر شہر
انسان اپنی ذات میں تنہا ہے شہر شہر

ذرّات آئینہ بکف آنے پر اب نظر
دو رخ مزاج دھوپ کا صحرا ہے شہر شہر

چہرے پہ گردِ شام کی سی جھریاں لئے
ویران حسرتوں کا جزیرا ہے شہر شہر

شمعِ شعور ۔۔ اور سرِ بادِ تُند خُو
لیکن میں کیا کروں کے اندھیرا ہے شہر شہر

لکھے تھے کس نے کوچہ و بازار میں یہ حرف
عاشق بقدرِ ظرف تماشا ہے شہر شہر

یہ کون ایسی سوچ کا قیدی ہے ان دنوں
یہ کون رات رات کو پھرتا ہے شہر شہر

احساس جیسے ڈولتی کشتی ہواؤں میں
تہذیب۔ جیسے قبر کا کتبہ ہے شہر شہر

جمہور زاد خوف میں محصور ہیں ضیاؔ
جمہوریت کا ویسے تو چرچا ہے شہر شہر

○

پروین کمار اشک
(پٹیالہ بھارت)

مَیں سے جب تُو ہو جاؤں!!
گُل سے خوشبو ہو جاؤں!!

صرف خدا کو دیکھوں گا!
کاش! میں یک سُو ہو جاؤں!!

پھول بنوں جوڑے کا ترے!
پاؤں کا گھنگھرو ہو جاؤں!!

گر تُو حق کی جنگ لڑے!
تیرا بازُو ہو جاؤں!!

بُلّھے شاہ کا روپ بھروں
حضرت باہُوؒ ہو جاؤں

اُسکو دیکھوں سرحد پار!
اَور بے قابُو ہو جاؤں!!

تُو بھی سراپا زخم بنے!
میں بھی آنسو ہو جاؤں!!

عورت ذات سے دور رہُوں!
پھر سے سادُھو ہو جاؤں!!

مجھکو ڈرائے جب بھی ہوا!
تیرا گیسُو ہو جاؤں!!

اُسکی کماں میں تیر ہو اشکؔ!
اَور میں آہُو ہو جاؤں!!

صابر عظیم آبادی
(کراچی)

صورت میں شکل میں وہ اچھا نہیں تو کیا ہے
ہم جیسا چاہتے ہیں ویسا نہیں تو کیا ہے

یادوں کی خوشبوؤں سے دل ہے مرا معطّر
غنچہ ترے بدن کا مہکا نہیں تو کیا ہے

جگنو ہے کہکشاں ہے عزمِ سفر ہے محکم
منزل پہ میں ابھی تک پہنچا نہیں تو کیا ہے

زلفوں کے پیچ وخم تو سلجھا دیئے ہیں ہم نے
یہ زیست کا معمّہ سلجھا نہیں تو کیا ہے

طاعت میں کٹ رہی ہے یہ زندگی ہماری
اپنے خدا کو ہم نے دیکھا نہیں تو کیا ہے

باغوں کے سب پرندے ہیں ہم نوا ہمارے
اک طائرِ محبت چہکا نہیں تو کیا ہے

شبنم ہی سے بجھالیں ہم تشنگی کو اپنی
منزل کے راستے میں دریا نہیں تو کیا ہے

افسانۂ محبت تھا درد ناک لیکن
سینے میں دل کسی کے دھڑکا نہیں تو کیا ہے

حسنِ جہاں پہ تکیہ کیوں کر رہے ہو صابرؔ
یہ زندگی کی رونق دھوکا نہیں تو کیا ہے

قطرہ قطرہ احساس

مشتاق اعظمی

(آسنول، ویسٹ بنگال)

''تم نے میرے اندر کی عمارت کو کہاں دیکھا ہے۔؟''

''دیکھ لیا ہے۔''

''پھر تمہارے جسم کے کپڑے گیلے کیوں ہو گئے ہیں۔''

''باہر ہوا اُمس بھری ہے۔''

''تم باہر آ کر دیکھنے کی کوشش میں ہو جہاں چیل ڈینے پھیلائے آکاش میں اُڑ رہی ہے۔ اوپر۔۔۔۔ بہت اوپر۔۔۔۔ شاید ایک ہی پنکھ دکھائی دے رہا ہے۔''

''نہیں دونوں پنکھ سامنے ہیں۔ کالے بادل کی وجہ سے ایسا لگ رہا ہے۔''

''لیکن یہ بادل کالے کیوں ہیں؟ بارش نہیں ہو رہی ہے۔ فصلیں نہیں اُگ رہی ہیں۔ پینے کے پانی کی قلت ہے۔''

''مہنگائی بھی آسمان چھو رہی ہے۔''

''اندر شاید ہلچل اسی وجہ سے مچی ہوئی ہے۔ زندگی ایک انوکھے موڑ پر ہے۔''

''جینے کی اُمنگ کی چاہت کا سفر اتنا مختصر کیوں ہوتا جا رہا ہے؟''

''روح کے مظاہر مادیت سے ٹکرا رہے ہیں۔''

''اور پاش پاش ہو رہے ہیں۔''

''وقت کی فطرت میں ٹھہرنا نہیں ہے۔ آگے بڑھتے جانا ہے۔''

''پھر کوئی کسی کی سنگت سے آسودہ کیوں نہیں ہے''

''وجود میں گہری پھانس کی وجہ سے ناآسودگی ہے۔''

''خیالات کی جھلمل پرتیں آنکھوں کے پپوٹوں کو سیاہی نما بنا رہی ہیں۔''

سارا قصور ان آنکھوں کا ہی تھا۔ بولتی آنکھوں والی الماس نے میرے دل کو مٹھی میں بھینچ رکھا تھا۔ رفتہ رفتہ خون نچڑتا گیا۔ اس کی آنکھوں سے الفاظ نکل کر کبھی گدگدی بن جاتے تھے اور اکثر چبھن کی شکل اختیار کر لیتے تھے۔ بعد میں میری آنکھوں میں یہ اداسی بن گئے۔ جادوئی تتلیاں نہ جانے کہاں چلی گئیں۔ مجھے طوفانی گھیرے کی مسکراہٹ آج بھی یاد ہے۔ بھولنے کے دن تب بھی نہیں تھے۔ آج بھی نہیں ہیں کہ زندگی کی ڈگر بدل گئی ہے، دیکھ کر، ہاتھ پھیر کر، سونگھ کر، سمجھ کر، چوم کر اور بھوگ کر جس نے چند برسوں میں مجھے جھکا دیا ہے، آنکھیں نیچی کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ کالے اور طوفانی میگھوں کی روحیں میرے اندر داخل ہو کر خراشیں پیدا کر رہی ہیں۔ ہر وقت خون کے دباؤ سے نسیں سنسناتی رہتی ہیں اور کان کسی آشنا آواز کے لیے کھڑے رہتے ہیں۔ دماغ میں جنگل کی خوشبو گشت لگاتی رہتی ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ چہرے کی کاغذی پرت پر فکر، تکان اور اداسی ہے، جس کے نیچے کسی پہاڑ کی طرح ڈھ رہا ہوں۔ کمزور، تھرتھراتی اور دائیں بائیں آواز کرتی ہڈیوں کے اوپر اور اندر سے بھی الماس کو ہی دیکھتا رہتا ہوں۔ جو نہیں ملا ہے اسے پاس رکھنے کی خواہش بڑھ جاتی ہے۔ اکثر اس احساس سے گذرتا رہتا ہوں کہ کوئی روشنی ریڑھ سے ہو کر دماغ میں داخل ہو رہی ہے اور وہاں سے آنکھوں کے راستے گھر آنگن میں پھیل گئی ہے۔ فرار کی صورت یہ نظر آتی ہے کہ گم سم رہنے لگا ہوں۔ وہ روشنی دوڑتی پھدکتی الماس پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ آگ کی مدھم لپیٹ کو میں کسی اجنبی کی کسمساہٹ کی طرح محسوس کرتا رہتا ہوں۔ رات میں نیند اڑ جاتی ہے۔ جاگتے ہوئے مجھے بھیانک سپنے آتے ہیں۔ لگتا ہے دھرتی، آکاش، چاند، پیڑ اور مکان میرے چاروں طرف تیزی سے گھوم رہے ہیں اور میں کسی طرح اپنے پاؤں جمانے کی کوشش میں کسی کھائی میں گرا جا رہا ہوں۔ یہ بھی لگتا ہے کہ فلاور پلانٹ کے پھول کانپ رہے ہیں اور دھیرے دھیرے مٹ میلے پانی میں ڈوب رہے ہیں۔ باہر روشن دان سے چیل کی کریہہ چیخیں سنائی دے رہی ہیں اور فرش پر کسی چیز کے گرنے کی آواز ہوتی ہے۔ میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ گھبرا کر اُٹھ بیٹھتا ہوں۔ پسینے میں تربتر۔

میری بیوی کو میری اس کیفیت کا ذرا بھی اندازہ نہیں ہے۔ الماس تو خیر اتنی دور ہے کہ وہ بند آنکھوں سے بھی کچھ نہیں دیکھ سکتی۔ اعتبار اپنی ذات پر ہوتا ہے اور بس! باخبر بھی آدمی اپنے آپ ہی سے ہوتا ہے۔ نقش ونگار میں تاثر وہ آپ ہی بھرتا ہے اور جب جذباتی ہوتا ہے تو ذہن کی سطح کی چمک سے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے۔ مگر یہاں تو دل نڈھال ہو چکا ہے۔ اضطراب دوچند ہے اور انتظار کی زنبیل سے گھبراہٹ ہونے لگتی ہے۔ چاہت کی شدت نے مجھے اس منزل پر لا کھڑا کیا ہے۔ یہ میری سوچ ہے جبکہ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ گیس پلانٹ میں کام کرنے کی وجہ سے ایسا ہے۔

میں بہت صاف اور کھرا انسان ہوں۔ اپنے کردار سے میں خود مطمئن ہوں۔ لیکن محبت کی شدتیں!؟

صرف ایک تصویر میری نگاہ میں ہے۔ مختلف پوز میں! انہیں دل کے نہاں خانے سے نکالنا میرے بس میں نہیں ہے۔ یہاں میرا کردار متزلزل رہا ہے۔ آج ہوا نمی کا احساس لیے سرد محسوس ہو رہی ہے۔ چاند کی موجودگی میں تارے خوشی کا اظہار کر رہے ہیں۔ میں چاندنی سے اپنے حصے کی روشنی اپنی بصارتوں میں اتارنا چاہتا ہوں۔ لیکن وقت منجمد ہو چکا ہے۔ اپنے فلیٹ کے ٹیرس پر مخصوص گوشے میں بیٹھا میں سرد خوشبو کی چاپ سن رہا ہوں۔

پڑاؤ آنے سے پہلے، شام ڈھلنے کی فکر میں جو آگے نکل گئے ہیں،

باقی صفحہ ۸۰ پر ملاحظہ فرمایئے

''مجھے کیا بُرا تھا مرنا''

ڈاکٹر رینو بہل
(چنڈی گڑھ بھارت)

شام پانچ بجے وہ سج سنور کر پون کے لوٹنے کا انتظار کرنے لگی۔ اُس نے خاص پون کی پسند کی نیلے آسمانی رنگ کی سِلک کی ساڑھی پہنی تھی۔ حالانکہ اُسے ساڑھی اچھے سے باندھنی بھی نہیں آتی تھی پھر بھی اُس نے اپنی نند کی مدد سے اُسے سلیقے سے پہنا تھا۔ بال سنوار کر بنائے تھے۔ میک اپ کی اُسے ضرورت ہی نہیں تھی۔ نکھری ہوئی سفید رنگت، بھرے بھرے گلابی رخسار، لال گلاب کی پنکھڑی جیسے نازک ہونٹ، کالی بڑی بڑی آنکھیں اور اُس پر کاجل کی لکیر، ماتھے پر سجی گول بندیا اور دونوں کلائیوں میں میچنگ نیلے آسمانی رنگ کی کانچ کی چوڑیاں۔

رما اپنی بھابھی کی خوبصورتی اور سادگی دیکھ کر دل ہی دل میں نہال ہو رہی تھی۔ کمی تھی تو بس ایک چیز کی۔ اس کے چہرے سے جذبات کے رنگ کبھی نظر نہیں آئے۔ چہرہ ہمیشہ سپاٹ ہوتا کورے کاغذ کی طرح۔ دو موٹی موٹی کالی دلکش آنکھیں بولتی نہ تھیں صرف اِدھر اُدھر سب نہارتی تھیں۔ کبھی کبھی ان آنکھوں میں خوف کی جھلک نظر آتی یا پھر شاید یہ احساسِ کمتری تھا۔

صبح کام پر جاتے وقت پون نے اُس سے کہا تھا ''شام کو تیار رہنا فلم دیکھنے چلیں گے''۔

اور وہ شام ہونے سے پہلے ہی گھر کے سب کام نبٹا کر تیار ہوگئی۔ انتظار کی گھڑیاں کاٹے سے نہیں کٹ رہی تھیں۔ کبھی وہ کمرے میں آ کر ٹی وی کے آگے بیٹھ جاتی تو کبھی ساس کے پاس جا بیٹھتی۔ شام کے سائے پھیل کر رات کے اندھیرے میں سمٹ گئے۔ آسمان پر چاند چمکنے لگا اور ستاروں کی محفل روشن ہوگئی مگر اس کا چاند نہ جانے کس بدلی میں چھپا تھا کہ آنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ فلم شروع کیا اب تو ختم ہونے کا وقت آ گیا۔ ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ اُٹھ کر کپڑے بدل لے کہ ساس نے اپنے کمرے سے آواز لگائی:

''بہو اگر کھانا تیار ہو گیا ہو تو ہمارا کھانا لگا دے''۔

''جی امّاں جی''۔

اتنا کہہ کر وہ اٹھی۔ آئینے کے سامنے جا کر کھڑی ہوگئی۔ اپنے عکس کو سراپا نہارا اور سوچنے لگی ''کتنی بدل گئی ہوں میں۔ کیا فائدہ اتنا سجنے سنورنے کا جس کے لئے اتنا ہار سنگھار کیا اُسی نے ہی نہ دیکھا''۔

بے قرار دل میں اُمڈتے سیلاب کو اُس نے رہا کر دیا اور آنکھوں کے ذریعے گلابی رخساروں کو بھگوتے ہوئے شبنم کے قطروں نے گنگا جمنا کا روپ لے لیا۔ سیلاب گزر گیا اور اُسے پُرسکون کر گیا۔ دل میں چھپی ہوئی ٹیس نے سر اُٹھا کر سرگوشی کی ''اگر تجھے اس روپ میں دھیرج دیکھتا تو پہچان ہی نہ پاتا''۔ دوسرے ہی پل اُس نے ان خیالوں کو جھٹکا جس رشتے نے وجود میں آنے سے پہلے ہی دم توڑ دیا ہو، اُس کے بارے میں کیا سوچنا۔ وہ اٹھی کپڑے بدلے نیلی آسمانی چوڑیاں اتار کر رکھ دیں اور کام میں لگ گئی۔ جب تک پون گھر لوٹا وہ گھر کے سبھی کام نبٹا چکی تھی۔

گھر میں گھستے ہی پون نے میرا کا چہرہ پڑھنا چاہا تو پریشان ہو گیا۔ بیوی کے چہرے پر نہ کوئی گلہ نہ شکوہ نہ شکایت، نہ مایوسی نہ غصّہ۔ چہرہ پُرسکون جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اُس کی جگہ کوئی دوسری عورت ہوتی تو شوہر کی اچھی خبر لیتی مگر وہ بالکل خاموش معمول کی طرح اس کے لیے پانی لے کر آئی اور آتے ہی پوچھا۔

''آج کام زیادہ تھا کیا؟''

''نہیں چھٹی تو وقت پر ہی ہوگئی مگر راستے میں چند پرانے دوست مل گئے اور بس کافی ہاؤس میں جا بیٹھے۔ گپ شپ میں ایسے مست ہوئے کہ وقت کا پتا ہی نہ چلا''۔ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا اب تو یہ سُن کر وہ بھڑک اٹھے گی، غصّے میں لال پیلی ہو جائے گی مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا اُس کے چہرے کے تاثرات جیسے پرسکون تھے ویسے ہی رہے اور وہ دل مسوس کر رہ گیا۔ میرا چاہ کر بھی شوہر سے کوئی گلہ نہ کر سکی۔

''کھانا لگا دوں''

''تم نے کھا لیا؟''

''ابھی نہیں''

''تو تم کھالو۔ میں کھا کر آیا ہوں''۔ اُس نے اپنی طرف سے ایک اور نشتر چھوڑا مگر وہ ''اچھا'' کہہ کر وہاں سے چلی گئی اور پون پیر پٹکتا ہوا کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

وہ چاہتا تھا کہ اس کی بیوی بھی اُس پر اپنا حق جمائے۔ اُس سے شکایت کرے، گلہ کرے، لڑائی کرے، جھگڑا کرے۔ وہ جان بوجھ کر اسے اُکساتا ایسی ایسی حرکتیں کرتا کہ اُسے غصہ آ جائے اور جذبات کا ہر رنگ اُن کی زندگی میں گھل جائے تاکہ رشتہ اور مضبوط ہو سکے مگر وہ نہ جانے کس مٹی کی بنی تھی کہ اس پر اگر اثر ہوتا بھی ہوگا تو بھی وہ ظاہر نہیں کرتی تھی بس خاموش رہتی اور پون اُس کے چہرے پر سپاٹ کورا پن دیکھ کر اُکتا جاتا، ٹپٹانے لگتا۔ جیسے کسی نے اس کی انا کو چوٹ پہنچائی ہو، وار کیا ہو، زخمی کر دیا ہو۔

چھ مہینے پہلے شادی کے بعد جب وہ چار روز کے لئے نینی تال گھومنے گئے تو پون نے ہچکچاتے ہوئے نئی نویلی دُلہن سے پوچھا:

''اگر تم اجازت دو تو میں دو پیگ لگالوں۔موسم بھی سہانا ہے اور پھر تم بھی ساتھ ہو تو شام اور رنگین ہوجائے گی۔''

''اس میں اجازت کی کیا بات ہے۔اگر آپ کا دل کر رہا ہے تو ضرور لے لو۔میرے بابا تو روز شام کو پیتے تھے۔''

اس نے سوچا تھا کہ اُس کی بیوی اُسے جھٹ سے منع کر دے گی اور کہے گی:

''آپ شراب کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤ گے۔میں آپ کے ساتھ ہوں تو موسم کا مزہ لے لیتے ہیں کسی نشے کی کیا ضرورت ہے؟''

یہ پہلا موقع تھا جب اُسے حیرت ہوئی تھی۔اُس نے بھی ضد میں پہلا دوسرا، تیسرا اور پھر چوتھا پیگ پی ڈالا۔وہ اطمینان سے اس کے پاس بیٹھی رہی نہ روکا نہ ٹوکا۔اُس نے سگریٹ سلگائی اور دھواں اُس کے چہرے پر چھوڑ دیا وہ پھر بھی خاموش رہی۔آرام سے بیٹھ کر اپنے گاؤں کی باتیں سناتی رہی اسے یہ بھی محسوس نہیں ہوا کہ اُس کی باتیں پون سُن ہی نہیں رہا تھا وہ اکیلے ہی بولے جا رہی تھی۔

گھوم پھر کر جب وہ گھر لوٹے تو اُس نے ماں سے ملتے ہی اکیلے میں گلہ کر دیا۔

''میں نے اپنی زندگی کا ہر فیصلہ تم پر چھوڑا تھا ماں''۔

''میں نے کیا کوئی غلط فیصلہ کیا ہے؟''ماں نے حیرت سے پوچھا۔

''اس بار غلط ہے''۔

''کیا مطلب؟''

''آپ کی میرا ویسی نہیں جیسی مجھے چاہیے تھی''۔

''لڑکی خوبصورت ہے، سمجھدار ہے، بڑوں کی عزت کرتی ہے چھوٹوں سے پیار کرتی ہے۔اور کیا چاہیے تجھے؟''

''سب ٹھیک ہے مگر مجھے جیتی جاگتی جذبات اور احساسات سے پُر عورت چاہیے کوئی موم کی گڑیا نہیں''۔

اتنا کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا اور ماں اُس کی بات سمجھنے میں اُلجھ گئی۔

وہ ہمت نہیں ہارا۔شاید نئی نویلی دلہن شرماتی ہوگی، گھبراتی ہوگی۔شاید وقت کے ساتھ سب ٹھیک ہوجائے۔ہوسکتا ہے وہ ایک الگ ماحول سے آئی ہے اسی لئے ہر بات کا فرق ہے۔اسے شہر کی لڑکیوں کی طرح، اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے اور بات کرنے کا سلیقہ بھی نہیں آتا تھا۔وہ ایک جنگلی پھول کی مانند تھی جو قدرت کے صاف شفاف ماحول اور حسین وادیوں میں پروان چڑھی اور اپنی مہک سے اپنے اردگرد کو متاثر کیا۔اس پھول کو ایک گلدان میں لگا کر سجا دیا تو پھول کا کیا قصور۔دھیرے دھیرے وہ پھول شہر کی آلودہ فضا میں مُرجھانے لگا اور اپنی مہک کھونے لگا۔

پون نے کئی پینترے آزمائے کہ وہ اُس کی کسوٹی پر کھری اُترے مگر ہر بار نا کام ہی رہا۔سال بھر میں وہ جان گیا کہ اُس کی بیوی ایک خوبصورت گڑیا سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔چہرہ خوبصورت دل صاف مگر بے سلیقہ۔وہ اسے اپنے ساتھ دعوتوں، محفلوں ہوٹلوں میں لے جانے سے کترانے لگا اور میرا نے بھی گھر کی چار دیواری قبول کر لی۔ساس اور نند کی جی توڑ محنت کا اثر اتنا ہوا کہ بظاہر تو اس میں تبدیلی آ گئی ڈھنگ کے کپڑے پہننے کا سلیقہ آ گیا مگر شہر کی ماڈرن لڑکیوں کے طور طریقے نہ سیکھ سکی۔گھر گرہستی کا سارا بوجھ اس نے اپنے ذمہ لے لیا۔گھر کے ہر فرد کی ضرورتوں کا خیال رکھتی۔ساس کو زمین پر پیر نہیں رکھنے دیتی تھی۔کبھی اُس نے زبان نہیں چلائی، ماتھے پر کسی نے شکن نہیں دیکھی پھر اسی بہو سے کوئی خوش نہ ہوتا مگر جب بھی ماں بہو کی تعریف کرتی تو وہ جل کر رہ جاتا اور کڑواہٹ بھرے لہجے میں کچھ نہ کچھ تو کہہ ڈالتا:

''آپ کو اچھی بہو ملی آپ خوش رہو۔مجھے تو بیوی چاہیے تھی خادمہ نہیں۔نصیب اپنا اپنا''۔

بیٹے کی باتوں میں چھپی مایوسی اور طنز ماں کو بے چین اور پریشان کر دیتا۔کچھ لوگ وقت اور ماحول کے ساتھ خود بخود بدل جاتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو لاکھ کوششوں کے باوجود ویسے کے ویسے ہی رہتے ہیں۔میرا بھی اُن میں سے ایک تھی۔گھر پر سب کو خوش رکھنے کے فراق میں اُس نے اپنی ہستی کو ہی بھلا دیا۔جس شوہر کو دن کے اجالے میں اس میں سینکڑوں عیب نظر آتے تھے وہی رات کی تنہائی میں سب دُوریاں مٹا کر اپنی پیاس بجھانے اُسی کنویں پر جاتا۔مگر کنویں نے کبھی حقارت کا جواب نفرت سے نہیں دیا۔پیاس مٹتے ہی اُسے چھپے ہوئے عیب پھر نظر آنے لگتے۔سب کی نظروں میں وہ بے چاری بن کر رہ گئی۔شوہر کی اتنی خدمت کے باوجود اُس کی محبت حاصل نہ ہوسکی۔

بے چاری کا خطاب اُسے شادی کے بعد ملا تھا۔ماں تو اُسے پیار سے نصیبو کہا کرتی تھی۔پہاڑوں میں پیچھے ایک چھوٹے سے گاؤں چوپال میں اس کا جنم ہوا۔باپ کے سیب اور چیری کے باغ تھے۔میرا کے پیدا ہوتے ہی ایک عرصے سے لٹکا زمین کا جھگڑا سلجھ گیا اور کھوئی ہوئی زمین حاصل کرنے میں وہ کامیاب ہو گیا۔وہ اُسے پیار سے لکشمی بھی کہتا تھا اُس کا ماننا تھا کہ بیٹی کے قدم پڑتے ہی گھر میں خوشحالی آ گئی۔پھر جب اس کے بعد ایک کے بعد ایک دو لڑکوں نے جنم لیا تو ماں نے اُسے نصیب والی کا خطاب دے دیا۔جب اُسے بیٹی پر زیادہ لاڈ آتا تو اُسے ''نصیبو'' کہہ کر پکارتی۔جس سال سیب اور چیری کی فصل اچھی ہوتی گھر میں لہر بہر ہو جاتی اور جس سال موسم کا یا قدرت کا قہر برپا ہوتا، ماں گھر گرہستی کا خرچ سوچ سمجھ کر بڑے سلیقے سے کرتی۔اُس کی کوشش ہوتی کہ کہیں بھی بچوں کو کسی چیز کی کمی نہ ہو پھر بھی تنگ دستی کی حالت خود بخود عیاں ہو

جاتی۔ باپ کے چہرے کی رونق اُن کے جاندار قہقہے، ان کی بھری جیب کا اعلان کر دیتے اور اگر شام ڈھلے وہ شراب کے نشے میں چُور لڑکھڑاتے قدموں سے گھر میں قدم رکھتے اور ماں کے کوسنے شروع ہوجاتے تو اسے خبر ہوجاتی کہ باپ کی جیب خالی ہے۔ ماں کو اُن کے شراب پینے پر اعتراض نہیں تھا یہ تو گاؤں کے مردوں کا ایک اہم شغل تھا۔ شام ڈھلے کبھی تیکھی سردی سے بچنے کو کبھی میٹھی سردی کا مزہ لینے کے لئے اس کا سہارا لیتے۔ ماں کہتی شراب پینی ہے تو حساب کی پیئو اور گھر بیٹھ کر پیئو تا کہ رات کے اندھیرے میں سڑکوں اور کھائی میں گرنے اور آوارہ کتوں سے منہ چٹوانے سے تو بہتر ہے۔ ماں لڑتی جھگڑتی رہی مگر اُس کا باپ اپنی من مانی کرتا رہا۔

پون نے یہ عادت بنالی تھی کہ دفتر سے وہ دوستوں کے ساتھ گھوم پھر کر رات کو ہی لوٹتا اور اکثر شراب کے نشے میں چُور۔ شادی سے پہلے تو وہ صرف خاص موقعے پر ہی شراب کو ہاتھ لگا تا تھا۔ شادی کے بعد دھیرے دھیرے یہ اُس کی عادت بن گئی۔ بیوہ ماں نے اُسے جب بھی سمجھانا چاہا تو بیٹے نے ماں کے سر ہی الزام دھر مارا۔ اُس نے کون سا اپنے بیٹے یا اپنے خاندان کا بُرا چاہا تھا وہ تو اپنے کسی رشتے دار کی شادی میں شامل ہونے گئی تو اُس کی نظر اس تازہ کھلی کلی پر ٹھہر گئی جو بھیڑ میں سب سے الگ لگ رہی تھی۔ اُس لڑکی کی سادگی، اس کا ٹھہراؤ اُس کی خوبصورتی اُسے پسند آئی۔ وہ جتنے دن وہاں رہی اُس کی نظر میں اُس لڑکی کو تولتی اور ٹٹولتی رہی۔ پھر اُس نے اُس ہیرے کو اپنی تجوری میں رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ بیٹے نے سب فیصلہ ماں پر چھوڑ دیا تھا اور جب اُس نے میرا کے ماں باپ سے اُس کا ہاتھ مانگا تو وہ چونک اُٹھے۔ باپ اتنی دُور بیٹی بیاہنا نہیں چاہتا تھا۔ ماں کو ڈر تھا کہ بیٹی شہر کے طور طریقے اور بڑے گھروں کے رہن سہن سے ناواقف ہے۔ جب اُس نے اپنے دل میں اُٹھنے والے اندیشے ظاہر کئے تو پون کی ماں نے بات ہنس کے ٹال دی۔

''یہ کون سی بڑی بات ہے۔ لڑکی پڑھی لکھی ہے خود کو بدل لے گی۔ ہم کون سا اس شہر میں پیدا ہوئے ہیں۔ میں بھی تو چھوٹی جگہ سے آئی ہوں مگر حالات کے ساتھ خود کو بدلا ہے۔ آپ اس کی فکر نہ کریں۔ یہ سب آپ بے فکر ہو کر مجھ پر چھوڑ دیں۔ آپ کی بیٹی راج کرے گی راج''۔

کسی نے میرا سے اُس کی مرضی نہیں پوچھی اور چار دنوں میں وہ شادی کے بندھن میں بندھ گئی۔ اب بے چاری کیسے بتائے ماں باپ کو کہ وہ گھر کی رانی تو ہے گھر کا ہر کام اُس کی مرضی سے ہوتا ہے مگر اس کا راجا اُس سے دور دور رہتا ہے۔ صرف قریب اپنی ضرورت پوری کرنے ہی آتا ہے۔

جب میرا بہو، بیوی سے ماں بنی تو اُس کے دل میں ایک اُمید نے جنم لیا کہ شاید یہ کڑی اُن دونوں کے بیچ کی دُوریاں مٹادے۔ رشتے تو مضبوط نہ ہوسکے پر اتنا ضرور ہوا کہ پون کو یہ بندھن توڑنے کا ارادہ ترک کر دینا پڑا۔ اس نے بھی حالات سے سمجھوتہ کرلیا اور اس رشتے کو اپنی لاڈلی کی خاطر قبول کرلیا۔

میرا نے بچی کو جنم دینے کا سکھ تو حاصل کرلیا پر بیٹی کے نام سے لے کر اُس کی پرورش کے ہر اہم فیصلے پر اُس کا کوئی حق نہ تھا۔ پون نے اُس کا نام نینا رکھا اور اُس نے یہ طے کرلیا کہ اب وہ اپنا سارا وقت نینا کو ہی دیگا۔ ہر بچہ گھر سے اور خاص طور سے اپنی ماں سے زندگی کے طور طریقے سیکھتا ہے۔ کہیں بیٹی بھی ماں جیسی ہی نہ بن جائے، اس ڈر سے اُس نے یہ فیصلہ کیا۔ زمانے کے طور طریقے سکھانے کے لئے اُس نے شہر کے سب سے اچھے سکول میں نینا کا داخلہ کروایا۔ اُس وقت اُسے یہ احساس نہیں ہوا کہ ماں بیٹی کے بیچ فاصلہ بڑھ جائے گا۔ جس گھر میں عورت کی عزت اُس کا مرد نہیں کرتا وہاں اس کی عزت اُس کی اولاد بھی نہیں کرتی۔ نینا نے جب ہوش سنبھالا تو اُسے اپنی دوستوں کی پڑھی لکھی ماڈرن ماؤں سے مل کر بہت مایوسی ہوئی۔ مایوسی سے زیادہ کمتری کا احساس اتنا بڑھ گیا کہ اُسے اپنی سہیلیوں کو اپنے گھر بلانے میں شرم محسوس ہونے لگی۔ ماں اگر کبھی اُسے کسی بات پر ڈانٹ دیتی تو باپ بیٹی کے سامنے ہی میرا کو ڈپٹ دیتا۔ اور اگر وہ خود نہ ڈانٹ کر پون کو بیٹی کی گستاخیوں سے آگاہ کرانا چاہتی تو اُسے الٹے چار باتیں سُننا پڑتیں۔ اُن دونوں کے لیے اس کا وجود صرف اس قدر محدود تھا کہ وہ ان کے ہر کام آرام سے کر کے دیتی تھی۔

ساس کے گزر جانے اور نند کی شادی کے بعد وہ اپنے ہی گھر میں بالکل تنہا ہوگئی۔

اتنے سالوں میں وہ صرف دو بار ہی میکے گئی ایک شادی کے بعد اور دوسرے جب نینا چار سال کی تھی۔ ہر سال گرمیوں کی چھٹیوں میں وہ سوچتی میکے جائے گی مگر نینا جانے کو تیار ہی نہ ہوتی۔

''اتنی بور جگہ ہے مجھے اپنی چھٹیاں خراب نہیں کرنی۔ آپ اکیلے چلے جاؤ میں پاپا کے پاس رہ لوں گی''۔

بچی کو اکیلے چھوڑ کر وہ کیسے جاتی۔ دھیرے دھیرے میکے والوں سے صرف فون ہی رابطے کا ذریعہ رہ گیا۔

گھر کی چار دیواری اور اُس کے اندر پھیلتا سُنا پن اُسے دیمک کی طرح چاٹنے لگا اور وہ ڈپریشن کا شکار ہوتی چلی گئی۔ ایک روز وہ اس قدر ٹوٹی کہ بستر ہی پکڑ لیا۔ شادی کے سولہ سال وہ اپنے شوہر اور اس گھر کی خدمت میں اتنی مصروف رہی کہ اُس نے انہیں ہی اپنی دنیا بنالیا اور آج جب وہ خود بستر پر لگ گئی تو باپ بیٹی کے ہاتھ پیر پھولنے لگے۔ ان دونوں نے تو کبھی خود کے لئے بھی پانی کا گلاس نہ اُٹھایا تھا تو وہ اس کی تیمارداری کیسے کرتے مجبوراً اُس کے میکے والوں کو فون کیا گیا اور وہ سنتے ہی بیٹی کو اپنے ساتھ لے گئے۔ ڈاکٹروں کا بھی مشورہ تھا کہ آب وہوا کا بدلاؤ اُس کے لیے ضروری ہے پھر چوپال سے بہتر کون سی جگہ ہو سکتی تھی۔

ایک مدّت بعد وہ اپنے گھر لوٹی تھی۔ وہی اونچے اونچے پہاڑ، وہی چیل اور دیودار کے درخت، وہی دوپہر کی میٹھی میٹھی دھوپ، وہی شام کی

چلچلاتی ٹھنڈی ہوا، وہی تازہ فضا وہی کھلا آسمان اور وہی سیدھے سادے لوگ۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا مگر وہ اس زمین سے کیا بچھڑی، وہ تو خود سے بھی جدا ہوگئی۔ پُرانے سنگھی ساتھی کچھ تو وہی تھے اور باقی اس کی طرح بہترین زندگی کی خواہش میں اپنی جڑوں سے بہت دُور نکل گئے تھے۔ اس نے کبھی پلٹ کر نہیں دیکھا پھر اُسے کون یاد رکھتا۔ ایک ساتھی باقی بچی تھی۔ وہ جب بھی آتی ماضی کے جھرنکوں کی کھڑکی کا پٹ دھڑ سے کھول دیتی۔

بچپن اور جوانی کی کھٹی میٹھی باتیں تنہائی میں چپکے سے آ کر اُسے اُداس کر جاتی تھیں، جس نے قسم کھائی تھی کہ میرا کے کبھی روبرو نہ ہوگا اگر اتفاقاً کہیں مل بھی جائے تو اجنبی بن کر راستہ بدل لے گا، وہ بھی اس کی بیماری کی خبر سُن کر سب گلے شکوے بھول کر اُس سے ملنے چلا آیا۔ دھیرج وہی سرکاری سکول میں پڑھاتا تھا۔ بچپن سے ہی میرا کو چاہتا تھا دونوں نے ایک ساتھ کھیل کُود کر لڑ جھگڑ کر ہنستے روتے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تھا۔ اس نے کبھی اپنے جذبات کو لفظوں میں ظاہر کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی اور میرا ان کہی خواہشوں کو سمجھ نہ سکی۔ میرا کی چٹ منگنی اور پٹ بیاہ نے اُسے توڑ دیا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اتنی جلدی اُن کا ساتھ چھوٹ جائے گا۔ دل کی دل میں ہی دب کر رہ گئی۔ سب سے اپنا پیار چھپا کر وہ زندگی میں بڑھتا گیا۔ ماں باپ کی لاکھ کوششوں کے باوجود ان کی شادی کی تجویز ٹالتا رہا۔ بڑی پُرسکون زندگی بسر کر رہا تھا کہ میرا کی آمد اور اُس کی ناساز طبیعت نے ایک بار پھر سوئے ہوئے خوابوں کی ٹیس سے آشنا کر دیا۔ وہ یہ سوچ کر گیا تھا کہ اُسے دیکھ کر اُس سے مل کر وہ کِھل اُٹھے گی، خوشی سے اُچھل پڑے گی۔ پھر وہ دونوں مل کر گزرے دنوں کی باتیں یاد کر کے بچپن میں لوٹ جائیں گے۔ مگر اُسے دیکھ کر اُسے بڑی مایوسی ہوئی۔ میرا کے زرد چہرے پر نہ ہی مسکراہٹ آئی اور نہ ہی ویران اداس آنکھوں میں خوشی کی چمک نظر آئی۔ اُس کے روم روم سے یاس، نااُمیدی، ٹیس، ٹوٹے خوابوں کی کسک اور زخمی ہوئے جذبات چھپائے سے بھی نہیں چھپ رہے تھے۔ رسمی گفتگوں کے بعد وہ جلد ہی دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے بوجھل من سے وہاں سے چلا آیا۔ اس کی حالت دیکھ کر خود کو کوستا رہا کہ وہ اتنے سال دل میں رنجش کیوں پال کر بیٹھا تھا۔ وہ بے چاری تو خود سے لڑائی لڑتے بکھر گئی تھی، ٹوٹ گئی تھی۔

دھیرج کا بس چلتا تو میرا کے پاس سے ہی نہ اُٹھتا مگر لوک لاج کے مارے دوسرے تیسرے دن میرا کو ملنے آ جاتا۔ اس کی کوشش ہوتی کہ وہ اُسے باتوں میں ایسے بہلائے کہ وہ اپنے دل پر پڑے غبار کو اُتار پھینکے۔ ماں باپ، دونوں بھائی اُس کے آگے پیچھے گھومتے مگر اکیلے پن کا احساس اُس کے اندر سے کم نہیں ہو رہا تھا۔ سب کے ہوتے وہ خود کو تنہا سمجھتی۔ دھیرج کو اپنے لئے پریشان دیکھتی تو ان دیکھے خواب چپکے سے اُس کی آنکھوں میں لوٹ آتے اور بیتے دنوں کو ڈھونڈنے لگتے۔ دل ہی دل میں اُسے یہ بات کھائے جا رہی تھی کہ جن کے لئے خود کو بھلا دیا وہ میرے اپنے ہیں اور وہ ہی اپنے اُسے بھلائے بیٹھے ہیں۔ اُن کے لئے وہ رات رات بھر جاگی تھی۔ ہمیشہ ان کی سلامتی کی دُعائیں مانگی اُنھیں دیکھ کر وہ جیتی رہی اور اُنہیں اپنوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ تیمار داری تو دُور کبھی خبر تک نہ لی۔ اُس کا حال جاننے کی زحمت تک نہ کی۔ ہر صبح وہ ایک آس لئے اُٹھتی کہ شاید آج فون آ جائے۔ شاید بیٹی کو اُس کی یاد آ جائے یا شاید پون بھولے سے اُسے یاد کر لے اور دن ڈھلتے ہی مایوسی کا اندھیرا اور گہرا ہو جاتا اور دھیرے دھیرے وہ ان اندھیروں میں ڈوبتی چلی گئی۔ زبان نے چُپ اختیار کر لی اور لبوں سے ہنسی چُرا لی۔ مسکراہٹ نہ جانے کن خلاؤں میں گُم ہوگئی اور کڑواہٹ نے وجود کو جلانا شروع کر دیا۔ بھوک ختم ہوگئی تو جسم بے جان تھکا تھکا نڈھال سا رہنے لگا۔ اپنوں کے بے رُخی، بے قدری، بے نیازی کا گھن لگ گیا جو اُسے اندر ہی اندر دن بہ دن کھوکھلا کئے جا رہا تھا۔ ڈاکٹروں کی ہر کوشش ناکام ہو رہی تھی اُن کا کہنا تھا کہ:

''ہم علاج کر سکتے ہیں مگر مریض کے اندر جینے کی خواہش کو زندہ نہیں کر سکتے۔ یہ سب تو آپ لوگ ہی کر سکتے ہیں''۔

بیٹی کی بگڑتی حالت دیکھ کر ماں باپ کا کلیجہ منہ کو آ جاتا۔ بیٹی سے چھپ چھپ کر آنسو بہاتے اور کوشش کرتے کہ اُس کے اردگرد کا ماحول خوشگوار ہو۔ پون کو اُس کی گرتی حالت سے آگاہ کرنا چاہا تو میرا نے اپنی قسم دے کر منع کر دیا:

''بابا میں دیکھنا چاہتی ہوں کب تک اُن کو میری یاد نہیں آتی۔ یاد نہ بھی آئے کیا میری کبھی ضرورت بھی نہ پڑے گی؟''

''بیٹی یہ آزمائش چھوڑ دے۔ کبھی کبھی ان آزمائشوں میں رشتے کھو جاتے ہیں''۔

''بچا ہی کیا ہے بابا۔ دیکھنا چاہتی ہوں میں نے اتنے سالوں میں کیا کمایا''۔

''یہ ضد چھوڑ دے بیٹی۔ اپنی قسم واپس لے لے''۔

''یہ ضد نہیں ہے بابا۔ ایک چھوٹی سی خواہش ہے۔ بس اور کچھ بھی نہیں''۔

اُنھیں مجبوراً اُس کی خواہش کا احترام کرنا پڑا۔

ادھر کچھ دن تو پون خوشی خوشی گھر کی دیکھ بھال کی ذمہ داری نبھاتا رہا۔ صبح سے شام تک گھر سنبھالنے والی، کھانا پکانے والی آرام سے مل گئی اور خود وہ آزاد پرندے کی طرح بے فکر ہوگیا۔ گھر پر موجود جوان ہوتی بیٹی کو بھی جب آزادی راس آنے لگی تو اُسے یہ آزادی کھٹکنے لگی۔ نوکرانی کے ہاتھ کے بنے کھانے میں وہ ذائقہ نہ تھا جو میرا کے کھانے میں ملتا تھا۔ بیٹی کی ذمہ داری کا بوجھ بڑھنے لگا تو اُسے میرا کی غیر موجودگی کھلنے لگی۔ میرا کے ہوتے ہوئے کسی چیز کی فکر نہ تھی۔ اُس کی زندگی کی ہر فکر ہر ذمہ داری ہر غم میرا نے اپنے سر لے رکھے تھے۔ پھر بھی کبھی اُس نے اُف تک نہ کی۔ نہ کبھی اس نے روکھے برتاؤ کا شکوہ کیا

نہ محرومیوں کا کوئی گلہ کیا، نہ کبھی کوئی فرمائش کی نہ کسی بات کی شکایت۔ وہ سوچتا تھا روٹی کپڑا دے کر وہ اس کی سبھی ضرورتیں پوری کر دیتا ہے۔

اب اُسے احساس ہوا کہ وہ بھی کچھ خواہشیں، کچھ ارمان کچھ تمنائیں، آرزوئیں کچھ خواب لے کر اس گھر میں آئی ہوگی۔ اُس نے بھی اپنے جیون ساتھی کو لے کر کچھ سپنے سجائے ہونگے۔ وہ بھی تو ریزہ ریزہ بکھر گئے ہونگے۔ وہ پھر بھی اس کی ضرورتوں کو پورا کرتی رہی چاہے وہ ذاتی ہو، گھریلو ہوں یا پھر جسمانی۔ وہ تو صرف اپنے ٹوٹے ارمانوں کو لے کر روتا رہا۔ اپنے سے باہر ہی نہیں نکلا اور نہ میرا کی قربانی، اُس کا پیار، اس کی سچائی کو سمجھ سکا۔ اس نے تو ماں بیٹی کے رشتے کو بھی پنپنے نہیں دیا۔ نہ خود اس کی عزت کی اور نہ ہی بیٹی کو ماں کے وجود کو نظر انداز کرنے کے لئے ڈانٹا بلکہ وہ اسے ہوا دیتا رہا۔ اپنی ہی نظروں میں وہ مجرم بن گیا اور جیسے جیسے احساسِ گناہ بڑھتا گیا میرا سے ملنے کی تڑپ بھی بڑھتی گئی۔ ان تین مہینوں میں اس نے ایک بار بھی اپنی بیوی سے بات نہیں کی تھی بس رسماً گھر والوں سے ایک دو مرتبہ حال دریافت کر لیا۔ اب وہ اس کے پاس جائے تو کس منہ سے جائے۔ اُداسی کے بادل بڑھنے لگے تو دل میں مایوسی چھانے لگی۔ مزاج میں چڑچڑا پن آ گیا۔ دل تو چاہتا تھا کہ اس کیفیت سے نجات پا لے مگر انا بیچ میں آ جاتی۔ راستہ سامنے تھا منزل دکھائی دے رہی تھی پر قدم اس قدر بوجھل ہو گئے کہ اُٹھائے سے بھی نہیں اُٹھ رہے تھے۔ نینا کو لے کر بھی وہ پریشان تھا۔ اب اسے لگتا تھا کہ اس نے بیٹی کو کچھ زیادہ ہی آزادی دے رکھی ہے یہ عمر تو ناسمجھ ہے اس عمر میں اکثر پیر لڑکھڑا جاتے ہیں۔ آج تک وہ میرا کی باتیں ان سنی کرتا رہا مگر اب وقت آ گیا ہے کہ وہ تھوڑی سختی برتے اور اسے زندگی کی اونچ نیچ سے آگاہ کرے۔ یہ کام تو ماں کا ہے اور ماں کے ہوتے ہوئے بھی یہ فرض باپ کو نبھانا پڑے کتنے افسوس کی بات ہے۔ ایسی ہی الجھنوں میں وہ مبتلا رہنے لگا۔ اُس کی یہ کیفیت دیکھ کر یار دوستوں کے لئے وہ رحم کا مرکز بن گیا۔ دفتر کے فرائض بھی وہ اچھے سے نہیں نبھا پا رہا تھا۔ ایک روز طبیعت کچھ ناسازسی محسوس ہوئی تو وہ جلدی چھٹی کر کے گھر آ گیا۔ گاڑی ابھی پارک ہی کی تھی کہ کانوں میں زور زور سے music کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ آوازیں اُسی کے گھر سے آ رہی تھیں۔ اس نے قدم اندر رکھا تو دیکھ کر حیران رہ گیا کہ نینا اپنے چند دوستوں کے ساتھ جن میں لڑکیاں بھی تھیں اور لڑکے بھی رقص کرنے میں اتنے مشغول تھے کہ اُنھیں اپنے بکھرتے جسموں کا بھی ہوش نہ تھا۔ اُنھیں اُس کی آمد کا احساس بھی نہ ہوا۔ وہ خاموش کھڑا پہلے دیکھتا رہا پھر غصّے سے بڑھ کر music بند کر دیا۔ سب کے تھرکتے جسم یکدم رُک گئے۔ نینا نے دیکھا اور لپک کر اُس کی طرف بڑھی۔

''پاپا آپ جلدی آ گئے؟ آیئے میں آپ کو اپنے دوستوں سے ملواتی ہوں''

اُن کے چہرے کے تاثرات اور غصّے کو نظر انداز کئے وہ اُن سب سے ملانے لگی۔

''نینا تم سب کو دروازے تک چھوڑ کر ابھی اسی وقت میرے کمرے میں آ ؤ ضروری کام ہے۔''

''مگر پاپا۔۔۔''

بِنا کچھ کہنے سُنے وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس سے پہلے نینا نے اپنے پاپا کو اس طرح پریشان اور غصّے میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ بھی جلد ہی سب کو رخصت کر کے اس کے پاس چلی آئی۔

''تم اپنا بیگ پیک کر لو کل صبح ہم نکل رہے ہیں''

''کہاں کے لئے؟''

''چوپال تمہاری ماں کو لینے جانا ہے۔ ابھی وقت زیادہ ہو چکا ہے سفر لمبا ہے اس لئے صبح سویرے ہی نکلنا ہے''۔

اس سے زیادہ کچھ پوچھنے کی اس کی ہمت ہی نہ ہوئی۔

پشمانی کے باعث اُسے کسی پہلو چین و قرار نصیب نہیں ہو رہا تھا۔ صبح کے انتظار میں وہ کروٹیں بدلتا رہا اور ماضی کے اوراق آنکھوں میں پلٹتے رہے۔ نہ جانے رات کے کس پہر آنکھ لگی تھی کہ دروازے پر زور زور کی دستک سے وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ دروازہ کھولا تو سامنے میرا کھڑی تھی۔

''تم اس وقت؟ ساتھ کون آیا ہے؟'' اس نے باہر جھانک کر دیکھا تو سڑک بالکل ویران سُنسان تھی۔ سردی کی وجہ سے باہر دُھند بھی چھائی ہوئی تھی اور گلی کے کُتّے بھی کہیں دُبکے ہوئے تھے۔

''آپ تو بھول ہی گئے مجھے؟'' گلہ کرتے ہوئے وہ گھر میں داخل ہو گئی۔

''تمہاری طبیعت تو ابھی بھی ٹھیک نہیں لگ رہی''۔ اس نے میرا کا چہرہ غور سے دیکھتے ہوئے محسوس کیا کہ وہ ابھی بھی زرد ہے۔ آنکھیں تھکی تھکی اُداس۔

''تم آئی کیسے ہو۔ ساتھ کوئی نہیں آیا؟'' اُس نے پھر حیرت سے پوچھا۔

''کمال کرتے ہو اپنے گھر آئی ہوں۔ کسی کے ساتھ کی کیا ضرورت۔'' وہ آرام سے صوفے پر بیٹھ گئی اور پون بھی اس کے پہلو میں جا بیٹھا۔ اُس کا ہاتھ ہاتھوں میں تھام لیا۔

''کتنے ٹھنڈے ہو رہے ہیں''۔ وہ اُس کے ہاتھ رگڑ رگڑ کر گرمی پہنچانے کی کوشش کرنے لگا۔

''رہنے دو ٹھیک ہو جائیں گے۔ کیسے ہو آپ؟''

''سوچا نہ تھا کہ تمہارے بنا زندگی عذاب بن جائے گی اچھا کیا جو تم لوٹ آئیں۔ اب اپنا گھر سنبھالو''۔

''تم نے تو کبھی بھولے سے بھی یاد نہ کیا''۔ پہلی بار اُس نے گلہ

کیا۔

''میری شرمندگی مجھے تمہارے پاس آنے سے روکتی رہی۔یقین مانو کل صبح ہی چلنے والے تھے تمہیں لینے۔دیکھو سامان تیار پڑا ہے''۔اس نے سامان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ دھیرے سے مسکرادی۔

''نینا کیسی ہے؟ سورہی ہے کیا؟''

''بہت ضرورت ہے اُسے تمہاری۔نادان ہے۔اب تم آ گئی ہو تو مجھے فکر کوئی نہیں''۔

''بہت تھک گئی ہوں۔نینا کے پاس جا کر آرام کرنا چاہتی ہوں''۔ یہ کہہ کر وہ اُٹھی اور نینا کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

''نینا کو اٹھالو''۔

''نہیں نہیں سونے دو اُسے۔ میں بھی اس کے ساتھ سو جاتی ہوں''۔وہ بھی اُس کے ساتھ نینا کے کمرے میں آ گیا۔نینا آرام سے سورہی تھی۔میرانے پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔جُھک کر اُس کا ماتھا چوما اور اس کے ساتھ اُس کی رضائی میں ہی گُھس گئی۔

پون نے ''گڈ نائیٹ'' کہتے ہوئے بتی بجھادی۔اور اپنے کمرے کی طرف طرف چلا گیا۔

بستر پر لیٹ کر اُس نے چین کی سانس لی۔

میرا کے لوٹ آنے سے دل پر پڑے بوجھ سے راحت ملی تھی۔

ابھی نیند کا جھونکا آیا بھی نہ تھا کہ فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔اُس نے بتی جلا کر دیکھا رات کے تین بج رہے تھے۔

''ہیلو''

''پون بیٹا میں بابا بول رہا ہوں''۔

''کیسے ہیں آپ؟''

''اگر ہو سکے تو صبح یہاں چلے آؤ۔اس بدنصیب کو کاندھا دینے''۔

ڈوبی ہوئی آواز اُس کے کانوں میں پڑی۔

''کس کی بات کررہے ہیں آپ؟''

''آدھا گھنٹا پہلے وہ ہم سب کو چھوڑ گئی۔بہت انتظار کیا اُس نے تمہارا''۔

یہ سنتے ہی فون اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا اور چہرہ پسینے سے شرابور ہوگیا۔وہ نینا کے کمرے کی طرف لپکا۔نینا اکیلی بستر پر معصوم بچے کی طرح نیند میں مسکرارہی تھی جیسے ابھی ابھی ماں نے پیار سے سہلا کر لوری دے کر سلایا ہو۔

چادر کی سلوٹیں بتارہی تھی کہ ابھی ابھی کوئی وہاں سے اٹھا ہے۔

☆

- بقیہ -

قربان گاہ تاج پر

مقبرہ ممتاز محل مکمل ہوا۔شاہجہاں کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔اس نے اپنی محبوب ملکہ سے کیا ہوا عہد ایفا کر دیا تھا۔مملکت میں جشن کا سماں تھا۔دور دراز ملکوں سے ملوک، اکابرین مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے تشریف لائے۔ ہر شخص عمارت کی شان اور تمکنت کو دیکھتا رہ گیا۔کاریگروں، فنکاروں اور مزدوروں کو انعام و اکرام سے نوازا گیا۔شیراز نے بھی اپنا حصہ وصول کیا۔اب وہ بھی ایک تجربہ کار عمارت کار تھا۔

اس نے اپنے بیٹے کو دادا سے ملوانے اصفہان کا قصد کیا۔ باپ کی آنکھیں بیٹے اور پوتے کو دیکھ کر ٹھنڈی ہوئیں۔سلجوق بار بار شیراز سے دریافت کرتا کہ مقبرہ کیسا تیار ہوا۔وہ دیکھنے میں کیسا ہے۔اس کے حسن کی چکا چوندھ سے آنکھیں خیرہ ہوتی ہوں گی۔ اس نے شیراز سے اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ وہ ہندوستان جا کر عمارت کو دیکھنا چاہتا ہے جس کی تعمیر میں برسوں اس کا خون پسینہ بھی شامل رہا ہے۔شیراز والد کی صحت کی طرف سے فکر مند تھا وہ اتنا طویل سفر کیسے کریں گے لیکن باپ کی خواہش سے مجبور ہو کر وہ ان کے ساتھ ہندوستان لوٹا۔

اس کا قافلہ رات کے وقت دلی پہنچا۔چند روز آرام کرنے کے بعد وہ والد کو لے کر آگرہ آیا۔سلجوق کا اشتیاق اور تڑپ دیدنی تھی۔نقاہت اور کمزوری کے باوجود وہ ہوا کے دوش پر سوار لپکتے ہوئے مقبرے کے روبرو ایک فاصلے پر رک گیا۔سفید براق عمارت اس کے سامنے بائیں جانب سنگ سرخ سے بنی مسجد اور دائیں جانب نوبت خانہ۔مقبرے کے چار مینار جیسے پاسبان اور حسن کا مرقع مرکزی گنبد۔مکمل عمارت کو آنکھ بھر کر دیکھنے کے بعد وہ بیٹے کا سہارا لیتے ہوئے زمین پر آ رہا۔شیراز والد کی طرف متوجہ ہوا لیکن سلجوق کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ایسا لگتا ہے اس کی سانس کی ڈور اس لمحہ اتصال کے لیے ابھی تک برقرار تھی اس کے بعد وہ مقبرے کا عکس اپنی آنکھوں میں سجائے دارِفانی سے کوچ کر گیا۔

بھڑکتے حسن کی لو کب سہار سکتا تھا
چیخ کے ٹوٹ گیا شمع دان پتھر کا

دروازہ کھُلا رکھنا

گلزار جاوید

(راولپنڈی)

عالم ایسوسی ایٹ کے مالک دلشاد عالم خان کی ہدایت پر' ملازم اپنی جگہ سے ٹس سے مَس نہ ہوا تو انہوں نے حیران ہو کر ملازم سے دریافت کیا؟

''کیوں بھئی' سنا نہیں میں نے کیا کہا!''

''صاحب! سنا تو ہے' ٹھیک سے سمجھ نہیں آیا۔''

''بھئی! میں نے سادہ سے لفظوں میں تم سے کہا ہے' ایک ڈبی سگریٹ اچھے برانڈ والی اور دو خوشبو والے پان لے آؤ اور واپسی پر چائے کا آرڈر بھی دیتے آؤ' چائے سپر یٹ اور اسٹرانگ ہونا چاہیئے۔''

''جی صاحب! چائے' سگریٹ' پان سمجھ گیا بالکل سمجھ گیا۔'' محمد اقبال نے ہاتھوں کی انگلیوں پر تینوں اشیا کے نام دوہراتے ہوئے اپنے باس سے دھیمے لہجے میں دریافت کیا۔

''کوئی مہمان آ رہے ہیں صاحب؟''

''کیوں! یہ سب چیزیں میرے لئے شجرِ ممنوعہ ہیں؟ وہ راشد آ رہے ہیں' تھوڑی ہی دیر میں پہنچنے والے ہیں جلدی جاؤ اور جلدی آؤ''

جی صاحب جی! راشد جمال صاحب آ رہے ہیں' پھر تو میں چٹکی بجاتے گیا اور چٹکی بجاتے آیا''

''ہیلو! ابے گدھے تم ابھی تک وہیں پر ٹنگے ہوئے ہو اور یہاں میں تمہاری مدارات کا بندوبست کئے بیٹھا ہوں ....ٹھیک ہے' ٹھیک ہے دس منٹ سے اوپر جتنے بھی منٹ تاخیر سے پہنچو گے فی منٹ وہی جُرمانہ ادا کرنا ہو گا جو تم لوگ کالج لائف میں مجھ سے وصولتے رہے ہو۔''

آ جایئے! دروازے کے (Knock) پر دلشاد عالم خان نے ناک کرنے والے کو اندر آنے کی اجازت دی۔

''سر! میں بہت پریشان ہوں۔'' دلشاد عالم خان کی پرسنل سیکریٹری مِس افشین نے ماتھے پر گرے بالوں کو اُلٹے ہاتھ سے سر کی جانب سمیٹتے اور دائیں ہاتھ میں پکڑی ڈھیر ساری فائلوں کو میز پر رکھتے ہوئے لمبا سانس لیا۔

''آج آپ کچھ زیادہ پریشان لگ رہی ہیں۔''

''سر! مسئلہ ہی کچھ ایسا ہے۔ دلگیر انڈسٹری والے فون پر فون کئے جا رہے ہیں۔ فاران ایکسپریس والے بھی جلدی میں ہیں۔ شکور مِل والے تو کئی بار خود آ چکے ہیں اور' اور مجھے نام یاد نہیں آ رہے آپ یہ فائلیں دیکھئے' بہت سارا کام Pending ہے۔''

''ہیلو! میں آ گیا ہوں۔ صرف دو منٹ کی تاخیر کے ساتھ۔''

راشد جمال نے دروازے کی اوٹ سے جھانکتے ہوئے اندر آنے کی اجازت چاہی۔

''آ جاؤ یار آ جاؤ کسی فارمیلٹی کی ضرورت نہیں۔''

''ہاں تو مِس افشین! آپ کچھ پریشانی کی باتیں کر رہی تھیں۔''

''سر! کام کی اتنی زیادتی ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔''

''آپ بالکل زحمت نہ کریں اور نہ کسی پریشانی میں خود کو گرفتار کریں میں جیسے ہی فارغ ہوتا ہوں آپ کو کال کرتا ہوں۔ آپ تشریف لے جائیں اور اقبال آ گیا ہو تو اُسے اندر بھیج دیں۔''

''سر! اقبال کو نہ پہلے بُلانے کی ضرورت پڑی ہے اور نہ کبھی پڑے گی۔'' چائے کی ٹرے کے ساتھ اقبال نے اندر داخل ہوتے ہی اپنے باس اور اُن کے دوست راشد جمال کے سامنے کپ رکھ کر چائے انڈیلنا شروع کی۔

''کیوں بھئی اقبال! آج تم نے اپنے صاحب کے سامنے پوچھے بغیر ہی چائے کا کپ کیسے رکھ دیا۔؟''

''No,No it`s alright'' میں نے ہی اسے کہا ہے۔''

اقبال نے جیب سے سگریٹ کی ڈبی' ماچس اور پان کی پوڑیاں میز پر رکھیں تو راشد جمال نے پہلے اقبال کو اور پھر اپنے دوست دلشاد عالم خان کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

''ٹھیک ہے' تم جاؤ''

جی صاحب جی کہہ کر اقبال سعادت مندی سے باہر چلا گیا۔

''سب خیریت ہے نا! تمہاری طبیعت اور دیگر معاملات' سب ٹھیک ہے نا!''

''ہاں' ہاں سب ٹھیک' بالکل ٹھیک ہے۔ تم کیوں اتنے حیران ہو کر پوچھ رہے ہو۔''

''یہ صبح صبح تمہاری طلبی' چائے' پان اور سگریٹ کے علاوہ تمہارا جولی پن بڑا غیر متوقع ہے۔''

''یار! مجھے آج اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہو رہا ہے۔ خواہ مخواہ میں نے سنیاس لیا ہوا ہے اور بھرم چاری بن کر دُنیا کی نعمتوں سے مُنہ موڑا ہوا ہے۔'' ایک پان کھول کر منہ میں رکھتے ہوئے اور دوسرا راشد جمال کی

طرف بڑھاتے ہوئے دلشاد عالم خان نے جملہ مکمل کیا۔
''اس تبدیلی کا سبب؟''
''پتہ ہے! آج صبح کیا ہوا؟'' تم سگریٹ پیو گے نا!'' راشد کی جانب سگریٹ کی ڈبی بڑھا کر اور راشد کے انکار پر' ڈبی میں سے ایک سگریٹ منہ میں لگاتے ہوئے''ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا؟''
''صبح کی بابت کسی واقعے کا ذکر کر رہے تھے۔''
''تم نے کبھی نہاتے ہوئے شیشے میں اپنا چہرہ دیکھا ہے؟''
''میرے خیال میں............نہیں۔''
''دیکھا تو میں نے کئی بار ہے مگر غور آج کیا ہے۔ یقین مانو! جب آدمی اپنے سر پر صابن لگانے کے بعد چہرے پر صابن لگاتا ہے تو وہ بہت خوبصورت اور حسین ہو جاتا ہے۔ پتہ ہے کیوں؟''
''نہیں'' ....بیزاری سے۔
''وہ اس لئے میری جان .... کہ صابن کی جھاگ انسان کے چہرے پر پڑنے والے داغ' دھبے اور ڈینٹ کو چھپا لیتا ہے اور اپنے ہاتھ کی رگڑ سے خون کی گردش تیز ہونے کے باعث انسان کا رنگ کِھل جاتا ہے۔ میں نے آج اپنے صابن لگے چہرے کو غور سے دیکھا تو مجھے اپنے اوپر' خود ہی پیار آنے لگا' بیالیس برس کا ہونے کے باوجود میں کتنا خوبصورت اور سمارٹ ہوں۔ پھر دل نے کہا کہ تُو ظاہری رنگ وروپ یہ کیوں جاتا ہے یہ تو عمر ڈھلنے کے ساتھ دھوپ کی مانند ساتھ چھوڑ جاتا ہے اصل چیز جسمانی قوت ہوا کرتی ہے۔ بے ساختہ! میں نے اپنا ڈنڈ پھلا کر دیکھا تو وہاں کرکٹ کے بال کی مانند ٹھوس اور مضبوط گومڑا موجود تھا۔ میرے لبوں پر جوانی کی موجودگی کے احساس نے مسکراہٹ بکھیر دی۔ اب میں نے دوسرے ہاتھ کو موڑ کر طاقت لگائی اُس کا گومڑا پہلے ہاتھ کے گومڑے کی مانند چھوٹا اور نرم تھا لہٰذا میں نے زور اور بڑھایا اور گومڑے کو اُبھارنے کی کوشش میں میرا پیر پھسلا اور میں منہ کے بل اوندھا گر پڑا۔''
''سٹ لگی ہے۔''
''ہاں'' سر کی جنبش سے۔
''زور دی لگی ہے۔'' دو مرتبہ سر ہلا کر
''آ! فیر میں پٹی بَن دینی آں............''
''بُشراں نے میرے اتنے نزدیک ہو کر اپنی چُنّی سے کپڑا اپھاڑ کر میری کٹی انگلی پر پٹّی باندھی کہ اُس کی گرم گرم سانس میرے رُخساروں پر کٹار بن کر چلنے لگی۔ میں گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹتا اور بُشراں دو قدم آگے بڑھ کر مجھے کھینچنے لگتی۔''
''اُوراں تے مرٗ پٹّی پئی بنی آں' چھی تھوڑا اپانی آں۔''
''یار دلشاد! یہ تم کس طرح کی باتیں کر رہے ہو۔ گرے باتھ روم میں تھے اور پٹی بندھوانے پہنچ گئے بشراں کے پاس۔''
''ہیلو! جی مِس اَفشین' میں' میں نے آپ سے کہا ہے کہ آج میں بالکل فارغ نہیں ہوں بلکہ آپ یوں سمجھیں کہ میں دفتر آیا ہی نہیں............ہاں! یار معاف کرنا' معاملہ کچھ گڈ مڈ ہو گیا۔ اصل میں جو بات بُشراں کے حوالے سے میری زبان سے ادا ہوئی ہے یہ قریب پچیس سال پرانا واقعہ ہے۔ جب میں میٹرک میں فیل ہونے کے بعد دن بھر غلیل لے کر پرندوں کے شکار میں سرگرداں رہا کرتا تھا اور گاؤں کے اکلوتے پرچون فروش کی بیٹی بُشراں' کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھ کر سارا سارا دن میری راہ تکا کرتی تھی۔ ایک دن غلیل کی ربڑ میرے ہاتھ سے چھوٹ کر پہلی انگلی اور انگوٹھے کے درمیان واپس آ کر اس شدت سے لگی (راشد کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے) کہ کھال پھٹ گئی اور بشراں کو میرے قریب آنے کا بہانہ دستیاب ہو گیا۔ دراصل جس وقت میں باتھ روم میں گرا اور میری ٹھوڑی پر چوٹ آئی تو لحہ بھر کو میں اپنے ماضی میں کھو گیا اور مجھے ایسا لگا کہ بشراں میرے سامنے آ کر' مجھ سے میری تکلیف کی بابت دریافت کر رہی ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ میں بے خیالی میں بشراں کے ہر سوال پر اُسی طرح (ہاں) میں سر ہلاتا رہا جس طرح آج سے پچیس برس قبل گاؤں میں ہونے والے واقعے پر ہلایا تھا۔''
''Interesting, very very interesting'' مگر یار! یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ہم جیسے بے تکلف اور پُرانے دوست' اس قصّے سے بے خبر رہیں؟''
''بشراں نے مجھے اس لائق ہی نہ چھوڑا کہ میں اس کہانی کو دوہرا سکوں یا پلٹ کر کبھی پیچھے دیکھ سکوں۔''
''اچھا! یہ بشراں کیا لفظ ہوا' بشریٰ تو سنا تھا مگر............''
''دراصل ....مگر نہیں' مجھے اس دفتری ماحول میں گھٹن ہونے لگی ہے۔ کہیں باہر چل کر مناسب ماحول میں گفتگو کریں گے۔''
''یار! میں صرف ایک گھنٹے کا کہہ کر گھر سے چلا تھا اور اب بارہ سے اوپر کا ٹائم ہو رہا ہے۔ پہلے گھر اور پھر دفتر فون کر دوں وگرنہ شام کو تمہاری بھابھی کے آگے میری صفائی کون پیش کرے گا؟''
''میں تو چکن کارن سوپ لوں گا۔ تم کیا لینا پسند کرو گے؟''
''ایک ہی ہلّے میں ساری حدیں پار کرنے کا ارادہ ہے جناب!''
مینو بند کرتے ہوئے راشد جمال نے بات جاری رکھی۔''آج کا دن تمہارا ہے اور میں تمہارے ساتھ ہوں۔ جو تم لو گے میں بھی وہی لے لوں گا۔''
''جو بھی؟''
''ہاں' ہاں بھئی............جو بھی''
''ہاں تو تمہارا سوال یہ تھا کہ بشراں کو میں بشریٰ کہہ کر کیوں

مخاطب نہیں کر رہا!............ جب بھی میں نے اُسے نون کے بغیر بشریٰ کہہ کر بلایا تو اس نے فوراً تصیح کر کے مجھے یاد دلایا کہ اُس کا درست نام لیا کروں۔ تمہیں شائد! تجربہ نہیں کہ دیہاتوں میں تعلیم نہ ہونے کے باعث ناموں کا تلفظ اکثر بگاڑ دیا جاتا ہے اور خواتین کے نام بالعموم نذیراں' نصیراں' چھاتاں' اور کریماں جیسے اسٹائل میں رکھے جاتے ہیں۔ گاؤں کے سادہ لوح لوگ اسی کو درست تلفظ خیال کرتے اور صحیح تلفظ ادا کرنے والے کو غلط گردانتے ہیں۔''

''چھوڑو! اتنی تفصیل میں جانے کی کیا ضرورت تھی۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ بشراں کون ہے اور اس سے تمہارا کیا تعلق ہے اور اس تعلق کو اب تک پوشیدہ رکھنے کی وجہ کیا ہے؟''

''نہیں راشد! ابھی تم نے کہا تھا کہ آج کا دن میرا ہے لہذا بل بھی میں ہی ادا کروں گا۔'' دلشاد عالم خان نے کوٹ کی جیب سے پرس نکالا اور بل پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے چند نوٹ نکال کر پلیٹ میں رکھے اور راشد کا ہاتھ پکڑ کر باہر کی جانب قدم بڑھا دیئے۔

''کب تک آوارہ گردی کا ارادہ ہے؟''

''اُس وقت تک جب تک میرے سینے کا بوجھ ہلکا نہ ہو جائے یا میرے دل کو قرار نہ آ جائے۔''

''آج کل بشراں کہاں ہے اور آخری بار تم اُس سے کب ملے تھے؟''

''ہاں' آں ....'' آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے۔ ''بشراں سے میری ملاقات کی ابتداء اُس وقت ہوئی! جب دلشاد عالم خان کے بجائے میں شادا ہوا کرتا تھا اور جانگیہ بنیان میں گاؤں کے کھیتوں' کھلیانوں اور گلیوں میں زندگی کے غم سے بے پرواہ' کھیل کود میں مگن رہا کرتا تھا۔ وہ اتنی گندی اور غلیظ ہوا کرتی تھی کہ اُسے دیکھتے ہی میرا دل خراب ہونے لگتا اور میں اُس کی لاکھ کوشش کے باوجود نہ اُس کے ساتھ چینجو میں شامل ہوتا اور نہ لُکن مٹّی (چھپن چھپائی) میں شامل کرتا۔ ہمارا گھرانہ زمینداری اور جائیداد کے باعث گاؤں کا باعزت گھرانہ تھا۔ کمی کمینوں سے فاصلے پر رہ کر ملنا پسند کرتا تھا۔ یہی احساسِ برتری میرے اندر بھی نمایاں تھا۔ سکول میں داخلے کے بعد میری سوچ اور مشاغل اور طرح کے ہو گئے تھے مگر اُس اللہ کی بندی نے میری تمام کوششوں کے باوجود فاصلہ سمٹنے نہ دیا۔ وہ نہایت باقاعدگی سے میرے سکول جاتے وقت اور واپسی پر اپنے گھر کے سامنے کھڑی ہوتی اور دونوں ہاتھوں سے تالیاں بجا کر میرا استقبال کرتی۔ ''آہا! شادا آ گیا' شادا سکول جا رہا ہے۔ میں بھی سکول جاؤں گی اور شادے کے ساتھ پڑھوں گی۔''

''چل نی! وڈّی آئی پڑھن والی' کدی ساڈے ماں' پیو نے بھی پڑھیا اے جے توں پڑھے گی۔'' ڈانٹ کر اُس کی ماں ہاتھ سے پکڑ کر اُسے اندر کھینچ لیتی اور دو جھانپڑ بھی رسید کرتی۔ مجھے دل ہی دل میں ملال ہوتا کہ بے چاری ناحق میری وجہ سے مار کھا رہی ہے۔''

''برادرِ عزیز! (گھڑی دیکھتے ہوئے) ایک ہوتی ہے کہانی' دوسرا منظر نامہ اور تیسرے نمبر پر ڈائیلاگ اگر تم نے ماضی کو تینوں فارم میں بیان کیا تو یہ سلسلہ ہفتوں پر محیط ہو جائے گا۔''

''یار! میں کیا کروں' میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا' احساسات اور خیالات کو کس طرح گرفت میں لاؤں۔''

''تم نے گاؤں کے سکول میں میٹرک تک تعلیم حاصل کی ہے۔ گفتگو کا سلسلہ اب وہاں سے شروع کرو۔''

''ہوں .... ہاں .... وہ تو میرے آٹھویں جماعت میں پہنچنے تک یکسر بدل چکی تھی۔ رنگ روپ' قد کاٹھ اور اُس کی شرارتیں گاؤں کے ہر گھر کا موضوع بن چکی تھیں۔ بلا کی نڈر' بے باک اور ہوشیار ہو گئی تھی۔ حالانکہ ابھی میری مَسیں بھی ٹھیک سے نہیں بھیگی تھیں مگر اُسے دیکھتے ہی میری کیفیت یکسر بدل جاتی۔ الفاظ زبان پر اٹک اٹک کر آتے اور سانس بے ترتیب ہو جاتی۔ میری خواہش ہوتی کہ وہ مجھے دیکھ کر شرمائے' لجائے اور میری جانب سے محبت کے دو بول سننے کی منتظر رہا کرے مگر وہ تو مجھے دیکھتے ہی بے قابو ہو جاتی اور پل بھر میں ساری حدیں پار کرنے کی ترغیب دینے لگتی۔ جس سے میرے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو جاتے اور میں پسینے میں اس طرح شرابور ہو جاتا جیسے میلوں دوڑ کر آ رہا ہوں۔''

''اصل قصّے کی طرف آؤ' اصل قصّے۔''

''ہاں .... وقت کافی ہو گیا ہے (گھڑی دیکھتے ہوئے) کیا خیال ہے! کہیں بیٹھ کر ایک کپ چائے کا نہ پیا جائے۔ مجھے بڑی طلب ہو رہی ہے۔''

ہاں! یہ تم نے اچھی بات کی مگر گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے۔''

''بس یار .... (چائے کی چُسکی لے کر بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے) میرا میٹرک میں فیل ہونا اُس کی بربادی کا سبب بن گیا۔ گھر والوں بلکہ گاؤں والوں کو بھی ہماری بابت چہ مگوئیاں کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ میرے فیل ہونے کی ذمہ داری بشراں کے سر تھوپی جا رہی تھی۔ ایک رات اچانک والد صاحب اور دونوں چچا مجھے گاڑی میں بٹھا کر شہر لے آئے اور صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا ''اگر ہماری اجازت کے بغیر تم نے گاؤں کا رخ کیا تو ہم اُس نیچ ذات پرچون فروش کی بیٹی کے سینے میں گولی اُتار دیں گے۔ ضرورت پڑی تو ہم اپنی عزت کی خاطر تمہیں بھی مارنے سے دریغ نہیں کریں گے۔''

''واہ بھئی واہ! میں تو تمہیں اور تمہارے خاندان کو بہت مہذب سمجھتا تھا۔''

''ایک ماہ بڑے تذبذب اور بے چینی میں گزرا' اچانک ایک رات میرے کمرے کا دروازہ (Knock) ہوا۔ سامنے کمّو نائی کھڑا تھا۔ جس کا اصلی نام تو کمال الدین تھا۔ گاؤں والوں نے مختصر کر کے کمّو کر دیا تھا۔ وہ ہر ماہ شہر کریم' پاؤڈر خریدنے اور قینچی' اُسترے تیز کرانے آیا کرتا تھا۔ کمّو نے کانپتے ہاتھوں جیب سے ایک مڑا تُڑا رُقعہ نکال کر میری جانب بڑھا دیا۔''

''یہ کیا ہے کمّو؟''

''شادا بھائی آپ خود پڑھ لو۔''

''تمہیں گاؤں سے گئے ہوئے آج پورے اُنتیس دن ہو گئے ہیں اور کل پورا مہینہ ہو جائے گا۔ جس دن سے تم گئے ہو۔ کھانا' پینا' منجی' بسترا' کھیل کود' سکھی' سہیلیاں اور گاؤں کے گلی چوبارے' اجنبی اور بیگانے لگنے لگے ہیں یا تو تم فوراً آ کر مجھے لے جاؤ یا کہو تو میں خود تمہارے پاس آ جاؤں۔ میرے لئے تمہارے بغیر جینا حرام ہے۔ اگر تم نے اپنے آنے یا مجھے بُلانے کی خبر نہیں بھیجی تو یاد رکھنا میں زہر کھا کر جان دے دوں گی۔''

''پاگل ہو گئی ہے .... یہ خط .... یہ خط کس سے لکھوایا ہے۔ بشراں تو چٹی ان پڑھ ہے۔''

''شادا بھائی! یہ اُس نے لطیف سنار کی بیٹی سے لکھوایا ہے۔ بڑی پکی سہیلیاں ہیں دونوں' آٹھ جماعتاں پڑھی ہے لطیف سنار کی بیٹی صغراں۔''

''نہیں' نہیں یہ غلط ہے .... میرا اور بشراں کا کیا تعلق؟ اُس سے کہنا بے وقوفی چھوڑ دے اور اِس طرح کی فلمی باتیں نہ کرے اور نہ آج کے بعد مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش کرے۔''

''کیا واقعی تمہارے دل میں بشراں کے لئے کوئی جگہ نہ تھی؟''

''کم از کم اُس وقت میرا یہی خیال تھا۔''

''اور اب؟''

''بیالیس برس کی عمر تک کنوارہ رہنا ہی میرا جواب ہے۔''

''ارے ہاں! یہ بتاؤ آج کل بشراں کہاں اور کس حال میں ہے؟''

''چھوڑو چلتے ہیں۔ دن غروب ہو گیا۔ کہانی ختم ہو گئی۔''

''یار! یہ تو ظلم ہے' مجھے ساری رات نیند نہیں آئے گی۔ تمہیں بشراں کی بابت بتانا ہو گا وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔''

''وہ وہیں ہے جہاں آج سے پچیس سال پہلے گئی تھی .... یقیناً آرام سے ہو گی۔''

''دلشاد! تیرے چہرے کی سیاہی کا تعلق اُس کی دھمکی سے تو نہیں؟''

''شائد ہاں ....''

''Oh my God'' تُو نے اپنی زندگی کی اتنی بڑی ٹریجڈی ہم سے کیوں چھپائے رکھی۔''

''اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔''

''تُو گیا تھا اُس موقع پر ....؟''

''میں نے تو پچیس سال سے گاؤں کی طرف مُڑ کر بھی نہیں دیکھا اور شائد مرتے دم تک نہ دیکھوں۔''

''تو پھر آج اچانک یہ تبدیلی کیوں ....؟''

''راشد بات یہ ہے کہ میں آج پچیس سال گزرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں' انسان کو کوئی کام' عشق' محبت' نفرت' دشمنی' دوستی' کاروبار ادھورا نہیں کرنا چاہئے لہٰذا میں نے اب خود کو مکمل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔''

''سچ! اگر یہ بات ہے تو میں آج کے دن کو اپنے لئے خوش نصیب دن سے تعبیر کروں گا اور مجھ سے جو بھی بن پڑا ہر صورت کروں گا۔ تمہیں مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہو گا! میں تمہارے لئے جو بہتر سمجھوں گا تم اُس سے انکار نہیں کرو گے۔''

''وعدہ' میرے دوست پکا وعدہ' میں نے آج سے اپنی زندگی کی ڈور تمہیں سونپ دی ہے''

''اگر ایسا ہے تو پھر نیک کام میں دیر کیسی؟ چلو اُٹھو۔''

''جیسے تمہاری مرضی۔''

''ایک منٹ صرف ایک منٹ گاڑی روک کر تم میرا انتظار کرو میں ابھی آیا۔'' پانچ منٹ بعد راشد واپس آیا تو اُس کے ہاتھ میں بڑا' خوبصورت اور خوشنما پھولوں کا ''بوکے'' تھا۔ کچھ دُور گاڑی چلنے کے بعد راشد نے پھر گاڑی رکوائی۔ پھر پانچ منٹ رکنے کا کہا واپسی پر راشد کے ہاتھ میں قیمتی کاغذ میں ملفوف ایک پیکٹ نظر آ رہا تھا جس کے بعد راشد نے دلشاد کو چلنے کا اشارہ کیا اور کچھ فاصلے پر پھر گاڑی روکنے کی ہدایت کی۔ راشد پھر دلشاد سے پانچ منٹ کی اجازت لے کر گیا اور پھر اس کے ہاتھ میں نفیس ریپر میں کوئی پیکٹ نما چیز نمایاں تھی۔ اس کے بعد راشد نے گاڑی میں بیٹھ کر دلشاد سے سگریٹ کی ڈبی طلب کی اور اُس میں سے دو سگریٹ نکال کر ایک ساتھ سلگائے ایک اپنے ہونٹوں میں دبا کر لمبا کش لیا اور دوسرا دلشاد کے ہونٹوں میں دبا کر شہر کی پوش آبادی کی جانب چلنے کا اشارہ کیا۔ قریب بیس منٹ کی مسافت کے بعد ایک سرسبز و شاداب اور جدید ڈیزائن کے گھر کے آگے گاڑی روک کر دلشاد کو زور سے ہارن بجانے کا کہا جس کے جواب میں ایک لمبا تڑنگا مونچھوں والا شخص برآمد ہوا۔ جس سے رسمی علیک سلیک کے بعد راشد نے جیب سے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر اُسے تھما دیا۔ کچھ دیر بعد وہ شخص لوٹا تو اُس کے انداز میں خاصی عاجزی اور انکساری آ گئی تھی اُس نے ادب سے گھر کا گیٹ کھول کر گاڑی کو اندر آنے کا اشارہ کیا اور تیزی سے گیٹ بند کر کے ڈرائنگ روم کی جانب رہنمائی کرنے لگا۔

گھر کی اندرونی سجاوٹ صاحب خانہ کی سلیقہ مندی اور اعلیٰ ذوقی کو نمایاں کر رہی تھی جس سے مرعوب ہوتے ہوئے دلشاد عالم خان نے دھیمی آواز میں صاحب خانہ کی بابت دریافت کرنا چاہا۔ ہاتھ کے اشارے سے راشد جمال نے اپنے دوست کو خاموش رہنے اور انتظار کرنے کی تاکید کی.........انتظار کے چند لمحے دلشاد عالم خان پر کافی گراں گزرے۔ تھوڑی ہی دیر میں یہ گرانی روح وقلب کی تازگی میں تبدیل ہوگئی۔ اچانک کمرے کی روشنی اور دیدہ زیبی دوچند ہوگئی۔

''ان سے ملئے! یہ دلشاد عالم خان اور شہر کے مشہور قانون دان ہیں۔ سب سے اہم بات یہ کہ مجھے ان سے بے تکلف دوستی کا شرف حاصل ہے۔''

''آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی' مس نیلم نے دلشاد عالم خان کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا۔''

''معافی چاہتا ہوں' مس نیلم آپ کو بے وقت زحمت دی مگر اِس وقت آپ کی جتنی ضرورت میرے دوست دلشاد عالم کو ہے اُس کے مقابلے میں کسی چیز کی کوئی اہمیت نہیں۔ یار! اتنی بدذوقی کا مظاہرہ نہ کرو (دلشاد عالم کی طرف رخ پھیرتے ہوئے) شہر کی مشہور ومعروف' عظیم ترین اور حسین ترین ہستی' مس نیلم کا ہاتھ تمہاری جانب بڑھا ہوا ہے اور تم؟۔''

''معاف کیجئے گا (جیب سے رومال نکال کر اُلٹے ہاتھ سے پسینہ پونچھتے ہوئے سیدھا ہاتھ مس نیلم کی جانب بڑھایا) دراصل میں.........؟''

''ارے نہیں' نہیں ایسی کوئی بات نہیں مس نیلم' اعلیٰ ذوق اور رکھ رکھاؤ والی خاتون ہیں۔ یہ تو اِن کی محبت ہے کہ انہوں نے بے وقت آمد پر خوش آمدید کہا وگرنہ شہر کے بڑے بڑے لوگ ان کی قربت کو ترستے ہیں.........آپ اجازت دیں تو میں گاڑی سے کچھ چیزیں لے آؤں۔''

واپسی پر بوکے اور دونوں پیکٹ راشد کے بجائے مس نیلم کا ملازم لے کر آیا۔ جنہیں مس نیلم نے کھول کر دیکھا اور دلشاد عالم خان کے اعلیٰ ذوق کی داد اس طرح دی کہ اُن کے ساتھ بالکل نزدیک ہو کر بیٹھ گئیں۔ دلشاد عالم خان کچھ کہنا چاہتے تھے کہ الفاظ کانٹے بن کر ان کے حلق میں پھنس کر رہ گئے۔ انہوں نے تھوڑا سا کھسک کر جیب سے رومال نکالا اور پسینے سے تر پیشانی کو خشک کرنے لگے۔

''اللہ! آپ کو اتنے پسینے کیوں آ رہے ہیں۔ ٹائی کی ناٹ تو ڈھیلی کیجئے نا! مس نیلم آگے بڑھ کر اپنے نرم وملائم ہاتھوں سے دلشاد عالم خان کی ٹائی ڈھیلی کرنے لگیں جس کے دوران اُن کا آنچل شانے سے ڈھلک گیا اور اُن کے سانسوں کی تپش دلشاد عالم خان کو اپنے رخساروں پر محسوس ہونے لگی۔ یکا یک دلشاد عالم خان صوفے سے اُچھل کر کھڑے ہو گئے اور اپنی گیلی قمیض کے بٹن اور ٹائی کی ناٹ درست کرتے ہوئے بولے'' آپ خفا نہ ہوں تو میں اجازت چاہوں گا'' یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے دلشاد عالم خان نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر پرس نکالا اور مس نیلم کی طرف بڑھاتے ہوئے معذرت خواہانہ نظروں سے اجازت طلب کرنے لگے۔ کچھ دیر کے لئے مس نیلم کے چہرے پر حیرت' پریشانی اور ندامت کے آثار نمودار ہوئے جلد ہی خود پر قابو پاتے ہوئے مس نیلم نے کہا۔

''آپ درست سمجھے خان صاحب! یقیناً اِسی پیسے کے لئے ہم نے یہ عالیشان دکان سجائی ہوئی ہے' افسوس.........! یہاں خوبصورت چہرے تو دستیاب ہیں اُن کی روحیں مُردہ ہو چکی ہیں.........آپ کے لائے ہوئے تحفے زندہ انسانوں اور زندہ روحوں کے لئے ہیں.........آپ کا عنایت کردہ پرس میں رکھے لیتی ہوں.........برائے مہربانی اپنے لائے ہوئے پھول' خوشبو اور کتاب لے جایئے اور کسی زندہ ضمیر کی نظر کر دیجئے.................''

کچھ دیر کے لئے دلشاد عالم خان گومگو اور سکتے کے عالم میں رہے ....خاموشی سے باہر آ کر اپنے لائے ہوئے پھول' خوشبو اور کتاب ساتھ گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر رکھے اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر اطمینان سے گاڑی کو اسٹارٹ کیا.........ذرا توقف کے بعد گاڑی کو ریورس کر کے مین روڈ پر لے آئے جہاں سے کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد دلشاد عالم خان کی گاڑی ایک ناہموار سڑک پر مُڑ کر فراٹے بھرنے لگی.................!!!

☆

- بقیہ -

قطرہ قطرہ احساس

کیا بتاؤں ان کو گزرتی برسات کی نیم بے ہوش یادوں کے ساتھ کیسا لگتا ہے۔ شاید کڑی دھوپ کا سفر۔ اس میں پیاس ہے۔
من کا توازن بنائے رکھنے کے لیے مجھے کس چیز کی ضرورت ہے؟ کیا الماس بھی اسی شدت سے میرے بارے میں سوچتی ہے؟ ہر گز نہیں!
ہتھیلی کی لکیروں میں زندگی مر گئی ہے۔
وجود کے اندر دیمک کلبلاتی رہتی ہے میں علاج کی حد سے نکل چکا ہوں۔
ڈاکٹر نے ابھی کچھ دیر پہلے بتایا ہے کہ بلڈ کینسر کی آخری سٹیج پر کھڑا ہوں۔

☆

''جگمگائے زندگی''

پنہاں
(یو۔ایس۔اے)

مسکرائے گنگنائے جگمگائے زندگی
کیوں ستائے جی جلائے آزمائے زندگی
خیر دل کی ہو حقیقت آشنا ہونے کو ہے
لے چلی خوابِ حسیں کے سائے سائے زندگی
زخم کچھ مہکے ہوئے کچھ داغ لو دیتے ہوئے
یونہی اکثر بزم یادوں کی سجائے زندگی
تھوڑی باتیں تھوڑے شکوے تھوڑے وعدے اور بس
ساتھ اس کے شام کی اچھی سی چائے زندگی
شاعری پنہاں برائے شاعری ہے اصل فن
وہ غزل ہی کیا جو ہو برائے زندگی

○

عرش صہبائی
(جموں کشمیر)

کونسا وہ زخمِ دل تھا جو تروتازہ نہ تھا
زندگی میں اتنے غم تھے جن کا اندازہ نہ تھا
ہم نکل سکتے بھی تو کیونکر حصارِ ذات سے
صرف دیواریں ہی دیواریں تھیں دروازہ نہ تھا
اُس کی آنکھوں سے نمایاں تھی محبت کی چمک
اُس کے چہرے پر نئی تہذیب کا غازہ نہ تھا
اتنی شدت سے کہیں آیا نہ تھا اُس کا خیال
اس سے پہلے زخمِ دل اتنا تروتازہ نہ تھا
دُور کر دے گا زمانے سے مجھے میرا خلوص
مجھ کو اپنی اس صلاحیت کا اندازہ نہ تھا
اس کی ہر سوچ میں ہے ایک مسلسل انتشار
اس طرح بکھرا ہوا اس دل کا شیرازہ نہ تھا
عرشؔ اُن کی جھیل سی آنکھوں کا اس میں کیا قصور
ڈوبنے والوں کو گہرائی کا اندازہ نہ تھا

○

خورشید انور رضوی
(اسلام آباد)

زباں کا طور لہجے کی صداقت دیکھ لیتا ہوں
فقط دو چار باتوں میں طبیعت دیکھ لیتا ہوں
مجھے چہروں کو پڑھنے کا کسی نے فن سکھایا ہے
چھپی ہو جو بھی اندر اک حقیقت دیکھ لیتا ہوں
ہر انساں سے تخاطب کا الگ اسلوب ہوتا ہے
کسی سے کس سخن کی ہے ضرورت دیکھ لیتا ہوں
ہر اک جذبے کی ہوتی ہے کوئی پہچان اک اپنی
عداوت بول اُٹھتی ہے، محبت دیکھ لیتا ہوں
کسی کو ہمسفر کرنا بڑا ہی کارِ مشکل ہے
کہاں تک ساتھ دے گی یہ رفاقت دیکھ لیتا ہوں

○

پروفیسر صدیق شاہد

(شیخوپورہ)

خانۂ دل میں کسی شوخ کے گھر کرنا ہے
اب یہ سوچا ہے کہ دیوار کو در کرنا ہے

دیکھ لیں تجھ کو ذرا' اخذِ مسرت کر لیں
ہم نے کیا اس کے سوا اے گلِ تر کرنا ہے

ایک منزل کو جو پالوں تو نئی ہو درپیش
میری تخلیق میں لکھا ہی سفر کرنا ہے

جو مسرت مرے حصے کی مجھے دیتا نہیں'
مجھے اس موسمِ بے مہر کو سر کرنا ہے

وہ بھی کیا خواب جو بننا ہے نئے موسم میں
اور تعبیر سے خود آپ حذر کرنا ہے

ڈھونڈ کر کارگہِ غم خوشی کے پہلو
وقفِ فرحت تجھے اے دیدۂ تر کرنا ہے

صبرِ سادات میسر ہو کہ شاہد میں نے
تنِ نازک کو مظالم کی سپر کرنا ہے

○

سیفی سرونجی

(سرونج' بھارت)

کوئی پیمبر نہ پیر ہوں میں
محبتوں کا سفیر ہوں میں

یہ میرا لہجہ زبان میری
فراق غالب نہ میر ہوں میں

کوئی نہ جھانکے اب اس کے اندر
غریب ادنیٰ فقیر ہوں میں

لٹا رہا ہوں دل کی دولت
مگر وہ سمجھے امیر ہوں میں

صدائے حق جو نکل رہی ہے
تمہارا اپنا ضمیر ہوں میں

○

شگفتہ نازلی

(لاہور)

کہی اور اَن کہی کے مابین کہتے کہتے
میری بات رہ گئی ہے تیری بات سنتے سنتے،

جو مکاں تھا اَجنبی سا لیا تھا کرائے پہ جب
وہ لگے ہے اب تو گھر سا مہ وسال رہتے رہتے،

کوئی احتجاج کا دَر ہے کہیں پہ کھلنے والا
صبح و شام بے سروپا بے تکی سی سہتے سہتے'

لگے جیسے پیچھے پیچھے کوئی چاپ ہے شناسا
اس واسطے رُکے ہیں یہ قدم جو چلتے چلتے،

جلے دیپ راستوں کے' رہے سوچتے تھے کیا کیا
یہ اُداس کر گئی ہے یونہی شام ڈھلتے ڈھلتے،

ہُوا کیا جو بالاتر ہے اُبھی تک سمجھ سے' آخر
کہ عمر گزر گئی ہے' وہی بات کہتے کہتے،

وہ بے نام غم سے کب تک رہے گی بچشم نم سی
یہاں سُو کھتے رہے ہیں' دریا بھی بہتے بہتے،

○

''چہارسُو''

پروفیسر زہیر کنجاہی

(راولپنڈی)

محوِ حیرت ہوں جہاں کو کیا ہُوا
مفت میں لوگوں نے مُجھ کو دھر لیا

اِبتدا ہی کی تھی اچھے کام کی
میرے یاروں نے ''غلط'' مجھ کو کہا

بعد میں لوگوں نے جھٹلایا مُجھے
نیکیوں کا یہ سلسلہ مُجھ کو مِلا

مَیں رہا حق کی طرف ثابت قدم
حرفِ حق میں نے کہا، مُجرم بنا

چور کو سارا جہاں کہتا ہے چور
چور کہہ کر تو مَیں خود پکڑا گیا

اوج بخشا میری محنت نے مجھے
پر زمانے کو نہ یہ اچھا لگا

اب تمنّا ہے مدینے میں بسوں
اے خدا، میرے محمدؐ کے خدا

تہمتیں تھوپی گئیں مجھ پر زہیرؔ
پھر بھی میں اپنوں کو دیتا ہوں دُعا

نعیم الدین نظرؔ

(میر پور خاص)

چند آنسو سجا کے پلکوں پر
پھول ڈالے ہیں اس نے قبروں پر

کیسے جائیں گے شہرِ جاناں کو
سخت پہرا لگا ہے رستوں پر

بخت جاگے ہیں سب درختوں کے
آشیاں بن گئے ہیں شاخوں پر

آج بھی برگِ ریز موسم میں
پھول کھلتے نہیں درختوں پر

عمر بھر اعتبار آیا نہیں
مجھ کو الفت کے چند لفظوں پر

کیسی کاری گری ہے قدرت کی
نقش سارے الگ ہیں پتوں پر

میرے بچّے کی کچھ خبر ہے نظرؔ
دن گذارا ہے اس نے فاقوں پر

احمد ظہورؔ

(اسلام آباد)

فکرِ فردا غم امروز جدا رکھتا ہوں
اک دریچہ سوئے ماضی بھی کھُلا رکھتا ہوں

یاد آتا ہے بہت دوڑ کے چڑھنا چھت پر
زینۂ عمر پہ جب آج عصا رکھتا ہوں

اپنی خوش فہم طبیعت کے طفیل آج بھی میں
بے وفاؤں سے بھی اُمیدِ وفا رکھتا ہوں

شوقِ خوشبوئے حنا تازہ میں اب برگ حِنا
ہاتھ میں دستِ حِنائی کی جگہ رکھتا ہوں

آندھیوں سے نہ ڈرا اے شبِ تاریک مجھے
ہاتھ کی اُوٹ میں لے کر میں دیا رکھتا ہوں

زندگی زد میں حوادث کے لیے ہر لحظہ ظہورؔ
لے کے ہر درد کی پہلے سے دوا رکھتا ہوں

○

سریواستورند

(نوئیڈا،بھارت)

جانے کیا اب مری اَنا چاہے
قربتوں میں بھی فاصلہ چاہے

زندگی اور مجھ سے کیا چاہے
آگ، پانی، کھُلی ہَوا چاہے

غم کی بیساکھیوں کا سنّاٹا
اپنی شرطوں پہ دوڑنا چاہے

ساعتوں کے نئے تناظر میں
دل تماشا بھی دیکھنا چاہے

سرکشی مضطرب سے لمحوں کی
میری پگڑی اُچھالنا چاہے

راستے، پاؤں، زندگی، منزل
ہرکوئی ساتھ چھوڑنا چاہے

گمشدہ سی کسک کے بدلے میں
درد اپنا الگ مزا چاہے

رنؔد کڑوے دھوئیں کا سایہ بھی
حال موسم کا پوچھنا چاہے

○

قمرالدین خورشید

(اسلام آباد)

مرے سر پہ ہے کھلا آسماں میں تو برف برف ہوا میں ہوں
نہ دبیز میرا لباس ہے نہ میں لپٹا اونی قبا میں ہوں

میں بھٹک رہا ہوں کبھی اِدھر مَیں بھٹک رہا ہوں کبھی اُدھر
مَیں ہوں ایک پتّا جھڑا ہوا میں تو اُس سادست ہوا میں ہوں

وہی دشت کی سی نوردگی، وہی دشت کی سی فسردگی
میں ہوں گھر میں پھر بھی لگے مجھے میں کسی دشت کی سی فضا میں ہوں

مرے غم میں کوئی شریک ہو مرے غم میں کوئی رفیق ہو
مرے رگرد کوئی حصار ہو کہ میں دست بُرد ہوا میں ہوں

کوئی میرا ہاتھ بٹائے کیوں کوئی میرا ساتھ نبھائے کیوں
کوئی مجھ کو اپنا بنائے کیوں، میں تو شہر اہل جفا میں ہوں

○

احسان احمد شیخ

(راولپنڈی)

خواب دیکھا تھا ایک لمحے کو
زندگی چاہیئے سنبھلنے کو

ایک ساحل پہ ہی بھروسہ تھا
وہ بھی تیار ہے مچلنے کو

روکتا کیسے وار یاروں کے
وقت ہی نہ ملا سمجھنے کو

مجھ کو تنہائیاں مبارک ہوں
عذر اک چاہیئے تڑپنے کو

اس جگر کی تپش کا نہ پوچھو
میں بھی تیار ہوں جھلنے کو

ایک لمحے کو لڑکھڑائے تھے
پھر ترستے رہے سنبھلنے کو

اُس کی صورت کو شیخؔ کیا کہیئے
چاند بے تاب ہے لپٹنے کو

○

افضال فردوس

(امریکہ)

بارش سے کوئی دشت بھی جل تھل نہیں ہوا
بنجر زمیں کا مسئلہ پھر حل نہیں ہوا

دل تیری دوستی سے بیزار ہوگیا
ہم سے کوئی بھی کام مسلسل نہیں ہوا

تارا سا تیری یاد کا ٹوٹا تھا نیند میں
بس اُس کے بعد خواب مکمل نہیں ہوا

اے چاند تیرے ساتھ بھٹکنا تھا رات بھر
وہ تو خدا کا شکر میں بادل نہیں ہوا

پگڈنڈیاں کہیں سے کہیں لے گئیں ہمیں
رستہ مگر نگاہ سے اوجھل نہیں ہوا

اچھا ہوا کہ تیرے مرے درمیاں کبھی
حائل غمِ جہان کا جنگل نہیں ہوا

زخمی ہوئے ہیں پاؤں تو افضالؔ غم نہ کر
صحرائے زندگی کبھی مخمل نہیں ہوا

○

تصور اقبال

(اٹک)

جو شہر مٹ چکے تھے پھر آباد ہو گئے
بچھڑے تھے جن کے پیارے وہ برباد ہو گئے

کچھ غمزدہ ہوئے تو کئی شاد ہو گئے
جو آسماں پہ تھے وہ زمیں زاد ہو گئے

اُس نے کیا ہے مجھ کو فراموش اس طرح
بھُولے ہوئے تھے جتنے سبق یاد ہو گئے

پہلے تو ہم نے پیار کو سمجھا تھا دل لگی
پوچھو نہ پھر کہ کس طرح برباد ہو گئے

برسوں سے ایک جال میں جو تھے پھنسے ہوئے
سارے پرندے آخرش آزاد ہو گئے

دیکھی ہے رقص کرتی ہوئی موت شہر میں
ہم اس قدر جو دوستو ناشاد ہو گئے

پہلے تصوؔر ہم تھے کسی قوم کی طرح
جب سے ہوئے ہیں منتشر ''افراد'' ہو گئے

○

حامد علی سیّد

(اسلام آباد)

تم ہی تو بس یقیں تھے مرا اعتبار تھے
اک دوسرے کے واسطے ہم بیقرار تھے

خوشبو مرے نفس میں تمہارے بدن کی تھی
تم صورتِ گلاب کہیں مشک بار تھے

جب تک تمہارا ساتھ تھا دنیا حسین تھی
نظروں میں خارزار بھی اِک لالہ زار تھے

اب کس لئے قیام کریں قافلے یہاں
جب تک شجر ہرا تھا مسافر ہزار تھے

حامدؔ نہ جانے کون لُٹا ہے سفر میں آج
مسلے ہوئے گلاب سرِ رہ گزار تھے

○

ہوا کے دوش پر

(ایک عام آدمی کی داستان حیات)

فیروز عالم

(کیلی فورنیا' امریکہ)

قسط......۵

دارالنسواں اور ریلوے اسکول

۱۹۵۰ تک میر پور خاص سے ہمارے خاندان کے، معدود چند گھرانوں کے سوا، سارے دوسرے گھرانے کراچی چلے گئے تھے۔اب یہاں باقی رہنے والے کنبوں میں میرے جواں مرگ ماموں فضل محمد کی بیوہ سروری ممانی، میری والدہ کے سب سے بڑے بھائی ظفر محمد (جو ایک زمانے میں فوج سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے اور تعلیمی اور سماجی طور پر پسماندہ رہ گئے تھے) اور میرے ابّا کی بہن حسن پھپّی کا کنبہ رہ گیا تھا۔حسن پھپّی کے شوہر ریلوے کے افسر تھے۔انکا بنگلہ بہت خوبصورت تھا اور اسے بڑی نفاست سے سجایا گیا تھا مگر یہ اپنی مخصوص طبیعت کی وجہ سے باقی لوگوں سے زیادہ گھلی ملی نہیں رہتی تھیں۔

میرے کنبے کو اب سب سے بڑی تشویش اس بات کی تھی کہ بچوں کی تعلیم کا کیا ہو؟ میر پور خاص میں لڑکوں کا ہائی اسکول تو تھا مگر لڑکیوں کے ایک پرائمری اسکول کے علاوہ کوئی اور تعلیمی سہولت نہیں تھی۔میری بڑی بہن سلطانہ آپا جودھپور کے ہائی اسکول میں پڑھ رہی تھیں اور اب انہیں اپنا میٹرک مکمل کرنے کے لئے ہائی اسکول کی ضرورت تھی۔اس سبب کچھ عرصے کے لئے انہیں مظہر ماموں جان کے یہاں جو ماؤلی سے کراچی منتقل ہو گئے تھے اور برنس روڈ کے پاس ایک فلیٹ میں رہ رہے تھے بھیج دیا گیا۔انہوں نے وہاں ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا اور اپنی پڑھائی شروع کی۔

میر پور خاص جس کے متعلق میں آئندہ ابواب میں بہت تفصیل سے لکھونگا ایک ایسا شہر ہے جسکی خوشگوار یادیں ہر اس فرد کے ذہن سے نہیں مٹ سکیں گی جس نے وہاں کچھ بھی عرصہ گذارا ہے اور اسکے شہریوں میں ایسے درجنوں لوگ شامل ہیں جنہوں نے اس کی ثقافتی اور تعلیمی زندگی پر ان مٹ نقوش چھوڑے ہیں۔یہاں اس زمانے میں متحدہ ہندوستان کی ''آئی سی ایس'' سروس کے نامور رکن انور عادل ڈپٹی کلکٹر تھے۔انکی بیگم اپوا کی صدر نشین تھیں انہوں نے شہر کے دوسرے ممتاز ارکان جن میں خان بہادر چوہدری رفیق پیش پیش تھے اور حیدر آباد دکن سے ہجرت کر کے آنے والی ماہر تعلیم خورشید بیگم شامل تھیں کے ساتھ مل کر شہر میں لڑکیوں کے لئے چند ہی ماہ میں ایک ہائی اسکول ''دارالنسواں'' قائم کیا۔یہ اسکول میر پور خاص کے شاہی بازار کے بالکل آخیر میں ہجرت کر جانے والے ایک متمول ہندو تاجر کی شاندار حویلی، جو اپنے رنگ کی مناسبت سے ہری حویلی کہی جاتی تھی میں، قائم کیا گیا۔اسلامی معاشرے کی قدروں کا خیال کرتے ہوئے یہ بہت مناسب عمارت تھی اس لئے کہ اسکی فصیلیں اونچی اونچی تھیں اور اسمیں لڑکیوں کو آزادی سے گھومنے کی سہولت تھی اور کسی قسم کی بے پردگی کا کوئی امکان نہیں تھا۔

اس سکول کا قیام میر پور خاص کی تاریخ کا ایک بڑا سنگ میل ہے اور آج ستاون سال گذرنے کے بعد ایسی کئی خواتین کے نام لئے جا سکتے ہیں جو اس اسکول سے بہرہ ور ہو کر تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں اور انسانی خدمات انجام دے رہی ہیں۔اس سکول کے قیام سے ہمارے گھر کی زندگی میں سب سے بڑا فرق یہ پڑا کہ سلطانہ آپا خوشی خوشی میر پور خاص واپس آ گئیں اور انہوں نے بھی دارالنسواں میں داخلہ لے لیا۔اب روز صبح ہمارے یہاں ایک تانگہ آتا تھا جس میں دو لڑکیاں پہلے ہی بیٹھی ہوتی تھیں اسی میں سلطانہ آپا بھی سوار ہو کر اسکول جاتی تھیں اور دو پہر تقریباً تین بجے یہی تانگہ انہیں واپس ہمارے گھر چھوڑ جاتا تھا۔

یہاں سب سے مزے کی بات یہ ہے کہ اسی ہائی اسکول کے احاطے میں ایک چھوٹی سی نچلے درجے کی عمارت بھی تھی جو شاید اس تاجر کے نوکروں کے رہنے کے کوارٹر ہونگے۔چونکہ شہر میں بچیاں زیادہ تھیں اور پرائمری اسکول ایک ہی تھا اس لئے اس عمارت میں ہائی اسکول کے ساتھ ہی بچیوں کے لئے ایک عارضی سا پرائمری اسکول بھی قائم کر دیا گیا۔میں بھی اب چونکہ اس عمر میں تھا کہ میری تعلیم بھی شروع ہو اس لئے مجھے بھی اسی اسکول میں لڑکیوں کے ساتھ داخل کر دیا گیا۔دراصل ایک تو میں اپنی بڑی بہن سے بہت وابستہ تھا اور ان سے جذباتی طور پر بڑا قریب تھا دوسرے میں کسی بھی اسکول جانا ہی نہیں چاہتا تھا اور لڑکوں کے اسکول جہاں پہلی کچی میں میرا داخلہ کروایا گیا تھا جاتے ہوئے بہت زیادہ ہنگامہ اور رونا پیٹنا مچاتا تھا۔اسلئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ اپنی بڑی بہن کے ساتھ میں اسکول جانے میں خود کو زیادہ محفوظ سمجھونگا اور اسکول کے دوران وقفے وقفے سے میری بہن مجھے دیکھتی اور مجھ سے ملتی رہیں گی۔اس زمانے میں لوگوں میں مروت تھی پھر میری والدہ سماجی طور پر فعال طبیعت اور اپوا کی ممبر شپ کی وجہ سے لوگوں میں مقبول تھیں اس لئے اسکول کی منتظم خورشید صاحبہ نے اس کی اجازت دیدی۔مجھے یاد ہے میرے ساتھ ایک اور لڑکا بھی لڑکیوں کے اس اسکول میں تھا یہ بہت گورا بھورے بالوں والا نازک سا لڑکا تھا اور شاید اسکا نام جعفر تھا۔اب مجھے اسکول جانے میں تو کوئی زیادہ دقّت نہیں تھی مگر اسکول میں یہ مسئلہ تھا کہ ہر طرف لڑکیاں ہی لڑکیاں تھیں اور مجھے اتنی چھوٹی عمر میں بھی نہ جانے کیوں ان سے بیحد شرم آتی تھی۔میری تمام صلاحیتیں زنگ آلود ہو رہی تھیں میں بولنے میں ہکلانے لگا تھا اور بس گردن نیچی کئے بیٹھا رہتا تھا۔ادھر لڑکیاں بھی مستقل مجھے چھیڑنے یا پریشان کرنے کے چکر میں لگی رہتی تھیں۔نتیجہ یہ ہوا کہ میں اس سکول سے بھی پریشان ہو گیا اور رو رو کر امّاں کو بھی پریشان کر دیا اور اس طرح یہ اسکول بھی چھوٹ گیا۔میرے ابّا بڑے دکھ سے کہتے

تھے کہ میرا یہ بچہ پڑھ کر نہیں دیگا۔ میں اپنی زندگی کے اس مختصر دور میں (جو میں آج اپنی بے پناہ ذمہ داریوں اور ہر قسم کے اسٹریس کے بوجھ تلے دبی زندگی سے نڈھال ہو کر بڑی حسرت سے لکھ رہا ہوں) جتنا بے فکر اور مزے میں تھا ایسا پھر کبھی نہیں ہوا۔ اسکول جانے کی کوئی فکر نہ تھی۔ کوئی اور ذمہ داری بھی نہیں تھی۔ دن دن بھر گھر کے چکنے فرش پر لوٹیں لگا تا تھا یہ بات اگر چہ میرے گھر کے ہر فرد کو بہت بری لگتی تھی مگر مجھے ٹھنڈا فرش بہت اچھا لگتا تھا۔ گھر کے سامنے لگے نیم پر چڑھ جاتا تھا اور اسکی ہرے بھرے پتوں سے لدی شاخوں اور مضبوط گدوں کو بستر سمجھ کر ان پر لیٹ جاتا تھا اور گھر کے پیچھے درختوں سے ڈھکی ہسپتال روڈ پر تانگوں کے پیچھے چکا چلا تا تھا۔ لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ آزادی امّاں نے مجھے ادھار دی تھی اور یہ طوفان سے پہلے خاموشی کا پیش خیمہ تھی۔ ایک دن امّاں کی کڑکتی آواز کان میں پڑی '' بہت مزے کر لئے اب میں تجھے ریلوے اسکول میں داخل کراؤنگی اور اگر تو نے وہاں جانے میں آنا کانی کی تو پیسے پر رکھ کر تیری بوٹیاں کاٹوں گی ''۔ میری امّاں کسی بچے سے تُو تڑاخ سے بات نہیں کرتی تھیں، ایک تو یہ انداز گفتگو ہی میرے لئے اس بات کی علامت تھا کہ وہ بہت ہی زیادہ ناراض ہیں۔ دوسری بات یہ کہ جیسا میں نے بار بار لکھا ہے کہ ہمارے ابّا تو بہت ہی نرم طبیعت اور درویش فطرت انسان تھے اس لئے ساری ڈانٹ ڈپٹ اور ڈسپلن امّاں ہی کے ہاتھ میں تھا جس میں وہ بہت سخت تھیں اور دو چار چانٹے رسید کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتی تھیں اور پھر یہ جو اصطلاح انہوں نے پیسے پر رکھ کر بوٹیاں کاٹنے کی استعمال کی اس نے تو میرے ہوش اڑا دئے۔ دوسرے دن وہ خود ہی مجھے میرا بایاں ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی ریلوے پرائمری اسکول لے گئیں اور پہلی جماعت میں میرا داخلہ کروا دیا۔

پاکستان بننے سے پہلے یہ اسکول ریلوے نے اپنے ملازمین کے بچوں کے لئے قائم کیا تھا۔ اسکی بلڈنگ سرخ اینٹوں کی اور کشادہ تھی۔ برآمدوں میں محرابیں بنی تھیں اور احاطے میں گھاس کے تختے تھے۔ تقسیم کی بدنظمی اور ہندو اسٹاف کے جانے اور جودھپور ریلوے سے نارتھ ویسٹرن ریلوے کو منتقلی نے اس اسکول کو تباہ کر دیا تھا اور یہ دو سال سے بند پڑا تھا۔

عمارت میں کافی ٹوٹ پھوٹ ہو چکی تھی اور اس کا باغیچہ اجڑ چکا تھا۔ سارا فرنیچر لوٹ مار کی نذر ہو گیا تھا۔ حالات کے معمول پر آنے کے بعد اس کی طرف بھی توجہ دی گئی۔ اس میں ریلوے کے پی ڈبلیو آئی شمشاد صاحب کا بڑا کردار تھا۔ حالانکہ اس میں انکا کوئی ذاتی مفاد نہ تھا کہ انکے بچے بڑے تھے مگر انکے بقول یہ سارے بچے انہی کے بچے تھے۔ انکی سربراہی میں ایک کمیٹی بنی اور اسکی عمارت کو اس قابل کیا گیا کہ اس میں ابتدائی تعلیم شروع ہو سکے۔ جب میں نے اس میں داخلہ لیا تو یہ سکول چوتھی جماعت تک تھا۔ میں پہلی میں تھا۔ اس وقت صرف چوتھی جماعت میں چند ٹوٹی پھوٹی بینچیں تھیں مگر باقی بچے زمین پر بیٹھتے تھے۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر میرے بڑے ماموں ظفر محمد کے داماد عزیز الرحمان تھے جو اس سے پہلے دہلی میں ایک اسکول کے ہیڈ ماسٹر رہ چکے تھے۔ (کیسا طرفہ تماشہ اور جائے عبرت ہے کہ انکی اپنی تمام اولاد ان پڑھ رہ گئی)۔

میرے لئے یہ دور بہت مشکل تھا۔ مجھے نہ صرف اسکول جانے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ میں اسکول سے خوف کھاتا تھا۔ مجھے تو ایسا لگا کہ مجھے قید ہو گئی ہے۔ ہر صبح گھر میں اس قدر ہنگامہ کرتا تھا اور اسکول نہ جانے کی اس قدر مزاحمت کرتا تھا کہ پلنگ کے پایوں سے سختی سے لپٹ جاتا تھا اور میری امّاں مجھے بزور اس سے کھینچتی تھیں۔ کبھی تو اس زمانے کے رواج کے مطابق اسکول سے چار مسٹنڈے لڑکے بھیجے جاتے تھے کہ اسے ڈنگا ڈولی کر کے اسکول لے کر آؤ۔ میں ان کو دیکھ کر خوف سے کپکپانے لگتا تھا اس پورے دور کی آج بھی ایک تلخ یاد میرے ساتھ ہے۔ اب بھی جبکہ میں پختہ عمر کو پہنچ چکا ہوں اور اللہ کے فضل سے دنیا کی چند نامور یونیورسٹیوں سے سند یافتہ ہوں اس بات کی توجیہ نہیں کر سکتا کہ ایسا کیوں تھا؟؟

اسکول علامہ اقبال کی دعا ؂

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

سے شروع ہوتا تھا جب اسمبلی میں جمع تمام لڑکے اسے ایک آواز میں جوش و خروش سے گایا کرتے تھے حالانکہ بعد میں جب مجھے اردو ادب سے دیوانگی کی حد تک عشق ہو گیا اور خود بھی کچھ چھوٹی موٹی چیزیں لکھنے لگا تو علامہ اقبال کی اس دعا سے اتنا متاثر ہوا کہ میں نے اس پر کئی صفحوں کا مضمون لکھا جو شمالی امریکہ کے سب سے باعزت اخبار پاکستان لنک میں شائع ہوا مگر آج مجھے یہ لکھتے ہوئے شرم محسوس ہو رہی ہے کہ اس وقت چونکہ یہ اسکول شروع ہونے اور میری نظر میں بلواسطہ میری قید شروع ہونے کی علامت تھی مجھے اس سے چڑ ہو گئی تھی اور میں اس کو سننا نہیں چاہتا تھا۔ میرے لئے اسکول میں دن کاٹنا مشکل ہو جاتا تھا۔ نہ تو پڑھانے والوں کا طریقہ دلچسپ تھا نہ ہی مجھے کسی چیز میں دلچسپی تھی۔ پھر اتنی چھوٹی عمر کے بچوں کے ساتھ بھی ہاتھ پر ڈنڈے مارنے کا دستور تھا اور میں بھی اس سے مستثنٰی نہیں تھا۔ مجھے یاد ہے کہ دو پہر کو دو بجے چھٹی ہوتی تھی مجھے اس عمر میں ٹائم کا تو بہت زیادہ علم نہیں تھا مگر ہم پہلی جماعت کے بچوں کو اس بات کا پتہ چل گیا تھا کہ جب سہ پہر کے وقت ایک مسافر گاڑی آتی ہے تو اس کے فوراً بعد ہماری چھٹی ہو جاتی ہے۔ یہ گاڑی ہماری کلاس کی کھڑکی سے نظر آتی تھی۔ میں زمین پر بیٹھا اپنی جگہ سے کئی کئی دفعہ اُچک اُچک کر اس طرف دیکھتا تھا کہ گاڑی آتو نہیں رہی!!! اس پر مجھے بڑی مار پڑی ہے۔ اپنی اس اولیں کلاس میں شامل کچھ لڑکوں سے میری آج بھی دوستی ہے اس میں سعید الزماں گارڈ صاحب کا بیٹا مہتاب سعید قابل ذکر ہے جس نے بعد میں سعودی عرب میں تیس سال گذارے، ایک بیحد شاندار ملازمت کی اور اسکے اپنے بیٹے امریکہ کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل ہوئے۔ چند اور نام جو قابل ذکر ہیں ان میں عبدالعزیز اور محمد حبیب خان ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے راستے اسکول کے بعد جدا ہو گئے مگر یہ دونوں بھی مجھے ہمیشہ یاد رہتے ہیں اس لئے کہ یہ ہماری کلاس کے سب سے ہوشیار لڑکے تھے اس کے ساتھ ہی یہ

دونوں بہت ہی حلیم الطبع اور ملنسار تھے۔انہوں نے بوجوہ حالات میٹرک کے بعد تعلیم ترک کر کے محکمہ تعلیم میں ملازمت اختیار کر لی مگر ہم یعنی میرپورخاص کے دوسرے لڑکے جنہوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے پاکستان یا غیر ممالک میں ترقی کے زینے طے کئے جب کبھی جمع ہوتے ہیں تو انکی غیر موجودگی میں انکا بہت ہی اچھے الفاظ میں ضرور تذکرہ کرتے ہیں۔

اسی طرح گرتے پڑتے وقت گذرتا رہا اور میں کسی نہ کسی طرح اگلی جماعتوں میں چڑھتا رہا۔نصابی تعلیم میں تو میں بہت کمزور تھا مگر جنرل نالج سے میں نے اسکول میں اپنی دھاک بٹھا دی تھی۔اسکول کے اساتذہ جو خود جنرل نالج میں صفر تھے مجھ پر حیران ہوتے تھے۔اس کی وجہ،جس کی وضاحت میں آئندہ کرونگا ہمارا گھر کا ماحول تھا۔میں کسی انکساری کے بغیر بلکہ بڑی حد تک فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ تعلیمی،ثقافتی اور سماجی قدروں کے لحاظ سے ہمارا گھر شاید پورے میرپورخاص میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔میری والدہ کو اگر ہزاروں نہیں تو سینکڑوں اشعار زبانی یاد تھے اور وہ یہ شعر برمحل پڑھا کرتی تھیں۔عام طور سے شعر کے ساتھ شاعر کا بھی نام لیتی تھیں۔اس کے ساتھ وہ ہمیشہ اردو کے مشاہیر کے کارنامے اور انکی تصنیفات کا ذکر کیا کرتی تھیں۔مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ ہمارے پورے محلے میں صرف ہمارے یہاں اخبار آتا تھا۔پہلے میرے والدین اخبار''انجام'' کے قاری تھے جس کے مدیر محمد عثمان آزاد تھے۔بہت بعد میں''جنگ'' آنے لگا۔خبار انجام میں دلچسپی کی وجہ ابن حسن نگار کی کہانی بھی تھی۔یہ اخبار شام تین بجے کی گاڑی سے آتا تھا اور ہمارے یہاں اخبار والا اسے چار بجے ڈالتا تھا۔اس وقت ہمارے یہاں شام کی چائے پی جاتی تھی اور میری والدہ تمام بچوں کے ساتھ چائے پیتے ہوئے اخبار پڑھ کر سناتی تھیں خاص طور سے انہیں اور میرے ابا کو محمودہ سلطانہ کا کالم''برق وشرر'' بہت پسند تھا اور ہم سب بچے بھی یہ کالم اور حالات حاضرہ کا تذکرہ بڑے شوق سے سنتے تھے۔اسی وجہ سے جب میں دوسری جماعت میں تھا اور اسکول میں انسپکٹر کی آمد پر اس نے سوال کیا کہ پاکستان کا چیف جسٹس کون ہے اور میں نے کہا''چیف جسٹس کانسٹنٹائین'' ۔ تو لوگوں نے حیرت سے دانتوں میں انگلی دبالی۔اگر چہ آپ یقین کریں کہ اس وقت یہ نام''کانسٹنٹائین'' میرے لئے بہت اجنبی تھا اور بس اماں سے اخبار سُن سُن کر یہ نام مجھے رٹ گیا تھا۔ان حالات کی وجہ سے مجھے اپنی کلاس میں تھوڑی سی اہمیت حاصل ہوگئی تھی۔پھر بھی ڈھائی کا اور پونے چار کا پہاڑا جو اس وقت رٹنا لازمی ہوتا تھا مجھ سے نہیں رٹا جاتا تھا۔

ایسے ہی ایک دفعہ ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب میری کلاس میں آ گئے اور مجھے کھڑا کر کے کہنے لگے کہ پونے تین کا پہاڑا سناؤ۔جیسا میں نے لکھا ہے وہ دور کے ہمارے رشتہ دار بھی تھے لیکن اس سے ان کو کوئی واسطہ نہ تھا۔وہ غصّے کے بہت تیز تھے اور جب بہت غضب میں ہوتے تھے تو کچھ ہکلانے لگتے تھے۔میں بمشکل پہاڑے کی دو یا تین منزلیں طے کر پایا اور اسکے بعد مجھے کچھ یاد نہیں آیا۔آپ اندازہ کر سکتے کہ تیسری جماعت کا بچہ کس قدر دہشت زدہ ہو گیا ہوگا۔وہ بہت زیادہ غضبناک ہو گئے اور پہلے تو انہوں نے ایک زناٹے دار تھپڑ میرے منہ پر رسید کیا پھر کہنے لگے ہاتھ لاؤ۔میں نے کانپتے ہوئے ہاتھ آگے کیا انہوں نے پوری قوت سے ڈنڈا اٹھا کر میرے ہاتھ پر مارنے کے لئے ہاتھ گھمایا۔مگر قدرتی اور غیر ارادی طور پر جیسے کسی نے میرا ہاتھ واپس کھینچ لیا اور انکا وار خالی گیا اس سے انکا غصّہ آسمان پر پہنچ گیا۔انہوں نے پھر بہت غصّے اور بدتمیزی سے کہا کہ ہاتھ بڑھا اور اس دفعہ جو مارا تو میری رفلیکس نے پھر میرا ہاتھ پیچھے کھینچنے کی کوشش کی جس کی وجہ سے انکا ڈنڈا ہتھیلی کی بجائے میرے انگوٹھے کی جڑ پر پڑا۔جب گھر آیا تو سیدھے ہاتھ سے کچھ کیا ہی نہیں جا رہا تھا ہاتھ میں شدید تکلیف تھی اور انگوٹھے کی جڑ میں کافی سوجن تھی۔پھر بھی اپنی چوٹ چھپا رہا تھا۔گھر میں کسی کو کچھ نہیں بتایا۔امّاں کا تو مجھے معلوم تھا کہ مجھے ہی ڈانٹیں کہ تم نے ہی کچھ قصور کیا ہوگا۔مگر میری بہت ہی پیاری بہن جو مجھ سے زندگی کی آخری سانسوں تک بیحد محبت کرتی رہیں اور جنہیں اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے انہوں نے دوسرے دن نوٹ کیا کہ میں اپنے سیدھے ہاتھ سے کچھ کام نہیں کر پا رہا ہوں اور کوشش کر کے اسے چھپا رہا ہوں۔انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا ہوا۔میں نے ڈرتے ڈرتے اُنہیں بتایا اس کے ساتھ ہی میرے آنسو نکل پڑے۔وہ تو تڑپ اٹھیں اور سخت ناراض ہوئیں انہوں نے فوراً عزیزالرحمان صاحب کو گھر بلا لیا۔حالانکہ وہ خود ابھی میٹرک میں بھی نہیں تھیں اور کم سن تھیں مگر انہوں نے عزیز صاحب کی ایسی خبر لی اور انہیں ایسا شرمندہ کیا کہ وہ بھی اسے زندگی بھر نہیں بھولے ہونگے۔اس وقت میری امّاں نے بھی ان کو تنبیہ کر دی کہ آئندہ اگر کسی بھی ماسٹر نے کبھی میرے ساتھ کسی قسم کی مار پیٹ کی تو وہ اس ماسٹر کو پولس کے حوالے کر دینگی۔اس کے بعد مجھے ریلوے اسکول میں کسی نے ہاتھ نہیں لگایا مگر میں زبانی طعنوں کا خوب نشانہ بنتا رہا کہ میں کوئی نواب زادہ ہوں اور مجھے کسی کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں۔اور یہ کہ میرے ماں باپ بعد میں پچھتائیں گے کہ میں ان پڑھ رہ گیا کیوں کہ ماسٹروں کو مجھے مارنے کی اجازت نہیں تھی اور مارے بغیر تو تعلیم دی ہی نہیں جا سکتی۔

گھر کا ماحول

۱۹۵۲ میری زندگی کا ایک اہم سال ہے اس لئے کہ اس سال کے بعد سے مجھے تمام واقعات بہت اچھی طرح یاد ہیں اس سال کی کچھ باتیں ایک خوشگوار یاد کی طرح مجھے اب بھی ایک خاص مسرت عطا کرتی ہیں۔

میں ابھی ریلوے پرائمری اسکول کی دوسری جماعت میں تھا۔اس سکول میں اپنے تجربات میں پہلے ہی رقم کر چکا ہوں۔

ہم کوارٹر نمبر ٹی نائن اے میں رہتے تھے جو ریلوے پلیٹ فارم کے بالکل سامنے تھا اور یہاں رات گئے تک رونق رہتی تھی۔گھر کا ماحول بہت خوشگوار تھا اس لئے کہ سارے بہن بھائی ایک ہی جگہ،ایک ہی چھت کے نیچے تھے اور سلطانہ آپا بھی کراچی سے واپس آچکی تھیں۔اسکے علاوہ ہمارے یہاں ایک ملازمہ بھی کام

کررہی تھی۔ یہ مارواڑی برادری سے تعلق رکھنے والی ایک ادھیڑ عمر کی عورت تھی جو ڈھیلے ڈھالے چھاپے کے سرخ کپڑے، ناک اور کان میں بڑے بڑے بالے اور ہاتھوں میں کہنیوں تک ہاتھی دانت کے کڑے پہنے ہوتی تھی۔ اس قسم کے لوگ میرپورخاص اور ضلع تھرپارکر میں جا بجا تھے اور یہ زیادہ تر ہندو تھے مگر یہ عورت مسلمان تھی اور ہم اسے ادب سے ''بڑی بی'' کہتے تھے۔ کھانا تو میری امّاں ہی پکاتی تھیں مگر گھر کا سارا کام کاج اور بازار کا سودا سلف اسی کی ذمہ داری تھی۔ یہ ملازمہ اس قدر وفادار تھی کہ میرے ڈاکٹر ہو جانے تک یہ ہمارے گھر کی ملازمت میں رہی اور ہمارے کنبے کے کراچی منتقل ہونے کے بعد اس کو سبکدوش کیا گیا۔

شام کو چار بجے انگریزی دستور کے مطابق چائے پی جاتی تھی۔ اس دوران تازہ اخبار پڑھ کر سنایا جاتا تھا اور پھر حالات حاضرہ پر تبصرہ ہوتا تھا۔ میری امّاں کا یہ اصول تھا کہ شام کا کھانا مغرب کے فوراً بعد کھایا جائے۔ کھانے کے بعد خاص طور سے سردیوں میں ہمارے بڑے کمرے میں انگیٹھی میں کوئلے روشن کئے جاتے تھے اور چونکہ اس زمانے میں ٹیلیوژن تھا نہیں اور ہم ریڈیو کے متحمل ہو نہیں سکتے تھے اس لئے ہم سب انگیٹھی کے چاروں طرف بیٹھ جاتے تھے اور سلطانہ آپا یا سلطان بھائجان کی ڈیوٹی تھی کہ وہ اردو کا کوئی اچھا ناول پڑھ کر سنائیں۔ اس زمانے میں میرپورخاص میں کئی لائبریریاں تھیں اور ایک آنے روز پر کتابیں ملتی تھیں۔ جب رات کو کتاب کا ایک باب ختم ہوتا تھا تو دوسری رات کا بے چینی سے انتظار رہتا تھا کہ آگے کیا ہوا اور کب کتاب دوبارہ پڑھنی شروع کی جائیگی۔ یہ روائیت تقریباً ۱۹۵۸ء تک جاری رہی۔ اردو ادب کے تمام مشہور ناول میں نے اسی زمانے میں انگیٹھی کے پاس بیٹھ کر سنے۔ اے آر خاتون، قیسی رامپوری، رئیس احمد جعفری، عادل رشید، عظیم بیگ چغتائی، ایم اسلم، نسیم حجازی، احمد شجاع پاشا اور کتنے ہی دوسرے لکھنے والوں سے میں اسی طرح متعارف ہوا۔ ایسی ہی ایک نشست میں اے حمید کا ناولٹ ''جہاں برف گرتی ہے'' جو شاید نقوش کے کسی نمبر میں شائع ہوا تھا، نے ہمارے سارے کنبے کو بہت متاثر کیا۔
مجھے آج بھی اسکی تلاش ہے مگر باوجود کوشش بسیار کے میں اسکو حاصل نہیں کرسکا۔
پچھلے دنوں جب لاہور کے تمام اشاعتی اداروں سے پوچھنے پر بھی یہ معلوم ہوا کہ کسی کو اس کے متعلق کچھ پتہ نہیں تو مجھے گمان ہوا کہ شاید ایسی کسی تحریر کا وجود ہی نہ ہو اور میں نے اپنے تخیل میں ایسی کسی چیز کو تراش لیا ہو۔ مگر اتفاق سے گذشتہ دنوں میری ملاقات پاکستان کے مشہور دانشور اور سفرنامہ نویس جناب قمر علی عباسی صاحب سے ہوگئی دورانِ گفتگو اس ناولٹ کا بھی ذکر آیا تو انہوں نے میرے خیال کی تصدیق کردی کہ ایسا ناولٹ چھپا تھا اور انہیں بھی اسکا مرکزی خیال یاد ہے بلکہ کراچی ٹیلیوژن سے اس پر مبنی ایک ڈرامہ بھی نشر کیا جاچکا ہے۔ اسی محفل میں پاکستان کے مشہور افسانہ نگار انور خواجہ بھی تشریف فرما تھے انہوں نے بھی نہ صرف اسکی تصدیق کی بلکہ میری معلومات میں اس کا بھی اضافہ کیا کہ اس ناولٹ کا مرکزی خیال انگریزی کے نوبل انعام یافتہ ادیب جان گالزوردی کے ناولٹ ''ایپل ٹری'' (APPLE TREE) سے ماخوذ ہے۔ اردو ناولوں کے علاوہ سلطان بھائجان انگریزی کے بھی مشہور اور کلاسیکل ادب سے چنیدہ چنیدہ ناولوں اور شاعری کے اقتباسات ترجمہ کر کے ہمیں سناتے تھے۔ اگرچہ یہ محفل تفریح طبع اور وقت گذاری کے لئے تھی مگر اسکا زبردست علمی اور ثقافتی فائدہ ہوا۔

میں لکھنا یہ چاہ رہا ہوں کہ اس سے مجھے اردو اور انگریزی ادب کا ایسا چسکا پڑا کہ بعد میں جب سلطانہ آپا کی شادی اور سلطان بھائجان کی نوکری کی ذمہ داری کی وجہ سے یہ محفل اُجڑ گئی تو مجھے خود کتابیں پڑھنے کا ایسا شوق ہوا کہ اس عمر سے آج تک یہی میرا اولیں شوق ہے۔ اسکے علاوہ مجھے اردو اور انگریزی ادب سے بہت ہی کم عمری میں بڑی حد تک اچھی خاصی شناسائی ہوگئی تھی جس نے بعد میں ہائی اسکول اور کالج میں مجھے ایک ممتاز حیثیت حاصل کرنے میں بڑی مدد دی۔ شاعری کو سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کا ذوق مجھے اپنی والدہ سے ورثے میں ملا جو موقع کی مناسبت سے اشعار پڑھتی تھیں اور خاص طور سے مثنوی زہرِعشق تو انکو تقریباً زبانی یاد تھی اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ میں نے اپنی امّاں سے زیادہ برمحل شعر پڑھتے کسی کو نہیں دیکھا۔ اس کے علاوہ ایسے درجنوں اشعار تھے جنکا ایک مصرعہ مشہور تھا مگر مکمل شعر کم ہی لوگوں کو یاد ہو۔ میری والدہ ان اشعار کو مکمل کردیتی تھیں ایسے ہی جب میں چوتھی جماعت میں تھا اور مجھے اس مصرعہ کی تکمیل کی ضرورت ہوئی

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

تو میری والدہ نے کہا کہ یہ امیر مینائی کا شعر ہے اور یوں ہے

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے۔

میں اس سلسلے میں خود کو بہت خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ ان حالات کی وجہ سے میں ادب اور خاص طور سے اردو شاعری کے عظیم خزانے سے لطف اندوز ہونے کے قابل ہوا۔ میں سوچتا ہوں کہ وہ لوگ یقیناً بدقسمت ہیں جو اردو شاعری، اسکے مزاج اور اس میں بیان کئے گئے نازک جذبات سے بہرہ ور نہیں ہوسکتے۔

شادیاں

۱۹۵۲ء ہی میں خاندان میں تین شادیاں ہوئیں جنکا ہمارے کنبے میں کافی شہرہ رہا اس لئے کہ پاکستان بننے کے بعد ہمارے خاندان میں یہ پہلی شادیاں تھیں۔ حالانکہ یوں تو پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد پہلی شادی میری چچی کی بیٹی انیس آپا کی تھی جو ۱۹۴۹ء میں ہوئی تھی مگر ان لوگوں نے خود کو خاندان کے بے تکلف حلقے میں شامل نہیں کیا تھا اس لئے اس میں معدود چند لوگوں ہی کو مدعو کیا گیا تھا اس لئے اسکا بہت زیادہ تذکرہ نہیں ہوا۔

اپنی امّاں کی ملنسار فطرت کی وجہ سے ہمیں تینوں شادیوں میں مدعو کیا گیا تھا اور ہم میرپورخاص سے ان میں شرکت کرنے کراچی آئے۔

اپریل میں سعادت ماموں کے تیسرے صاحبزادے راحت بھائجان کی شادی تھی۔ یہ ایئرفورس میں فلائٹ لیفٹیننٹ تھے اور چند ہی ماہ پہلے

انگلینڈ سے ہوابازی کی اعلیٰ ٹریننگ لیکر واپسی میں پیرس ہوتے ہوئے پاکستان آئے تھے اور سکواڈن لیڈر کے عہدے پر تعینات ہوئے تھے۔ نہ صرف انکا پیشہ بڑا گلیمرس تھا بلکہ یہ خود بھی درازقد اور یورپین اقوام کی طرح گورے چٹّے اور نہایت خوبرو انسان تھے۔ موسیقی سے تو انکو دلچسپی تھی ہی اب یہ انگلینڈ سے اکارڈین بھی ساتھ لے آئے تھے اور گلے میں اکارڈین ڈال کر اس وقت کا مشہور گیت جو راج کپور کی کسی فلم کا تھا

تارا ری تاراری تاراری

تارم پم تارم پم تارم۔۔۔

گاتے پھرتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے پاس پیرس کے نائٹ کلبوں اور لب سڑک قہوہ خانوں کے بہت سے قصّے تھے۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ لوگ ان کو دیکھ کر سحرزدہ ہو جاتے تھے۔ یہاں یہ لکھنا بھی ضروری ہے کہ ہمارے خاندان سے پہلی دفعہ ''ولایت'' جانے کا اعزاز بھی انہی کو ملا تھا۔ انکی شادی جس گھر میں ہوئی وہ پاکستان چوک پر برنس روڈ کے پیچھے تھا اور اس میں بادام کے درخت لگے تھے۔ ہم بچوں نے اس درخت پر لگے کچے بادام جو سرخ رنگ کے تھے اور کھانے میں کھٹے تھے اس وقت تک خوب توڑ توڑ کر کھائے اور برباد کئے جب تک دلہن والوں کی برداشت سے باہر ہو گیا اور ہمیں ڈانٹ کر اس سے منع نہیں کیا گیا۔ اس شرارت میں میرے ساتھ میرا کزن وجاہت اور ذولفقار بھائجان کی بیٹیاں رضوانہ اور وجیہہ اور میری ایک اور کزن پریا شامل تھیں۔ دراصل پریا جسکا اصلی نام پروین تھا اس معاملے میں ہماری رنگ لیڈر تھی۔ بہرحال اسکے بعد ہمارے بزرگوں نے بھی ہمیں خوب ڈانٹ پلائی۔ اب کبھی بچپن کے ان ساتھیوں کے پاس بیٹھ کر اسکا ذکر ہوتا ہے تو لگتا ہے کہ شاید پچھلی صدی کی بات ہو۔ یادیں کبھی نہیں مرتیں!!

دوسری شادی میں ہمارے گھرانے کی شمولیت بہت گہری تھی کیونکہ یہ میرے ماموں مظہر محمد کے سب سے بڑے بیٹے اظہر محمد قریشی کی شادی تھی۔ یہ شاید جولائی کے مہینے میں ہوئی تھی۔ میرپورخاص میں ایک عرصے سے اس شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ مظہر ماموں جان اس وقت برنس روڈ پر ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہائش پذیر تھے اور اس دو کمروں کے فلیٹ میں انکے پانچ بیٹے دو بیٹیاں وہ خود اور انکی بیگم رہتے تھے۔ جگہ کی قلّت تھی مگر دل کشادہ تھے۔ ہم تو ویسے بھی یہاں گرمیوں میں چھٹیاں گزارنے آتے تھے اور کسی نہ کسی طرح رات کو سونے کا بندوبست ہو ہی جاتا تھا۔ مگر اب شادی اس چھوٹے سے گھر میں کیسے ہوتی۔ صفات ماموں جو مظہر ماموں کے کزن تھے انکا پولس کا بڑا بنگلہ تھا۔ یہ بغدادی تھانے کی حدود میں تھا۔ انہوں نے اپنے گھر کی پیشکش کی اور یہ شادی وہیں سے ہوئی۔

میری چھوٹی خالہ جان اور انکے شوہر بے اولاد بھی تھے اور بہت صاحب ثروت بھی۔ سنا ہے انہیں بچپن سے اظہر بھائجان سے بڑی محبت تھی اور انہوں نے انکو اپنا بیٹا بنایا ہوا تھا۔ انہوں نے خوشدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ضد کی کہ ولیمہ کی شاندار دعوت انکی جانب سے ہوگی۔ اس طرح اظہر بھائجان کی شادی میں خاندان کے متحد ہونے اور ایک دوسرے سے تعاون کی ایک اعلیٰ مثال قائم ہوئی۔

شادی سے پہلے اتنے رتجگے ہوئے کہ لوگ نڈھال ہو گئے مگر اس شادی کی ایک تقریب سب کو آج بھی یاد ہے۔ یوں تو ہندو پاکستان کے ہر فرد نے سڑکوں کے کنارے یا گلیوں میں خواجہ سرا دیکھے ہونگے جو بچے کی پیدائش پر گانے گا کر بڑی حد تک ایک قسم کی بھیک مانگتے نظر آتے ہیں مگر یہاں برنس روڈ پر انکا ایک بہت خاص گروپ تھا جو بہت زیادہ رقم لیکر پوری رات رقص وسرود کی محفل سجاتا تھا۔ یہ پورے شہر میں مشہور تھا۔ جب انکے ساتھ ایک شام منانے کی تجویز پیش کی گئی تو لوگ کچھ ناراض اور کچھ حیران ہوئے۔ یہ بھی خیال تھا کہ انکا معیار اس قدر گھٹیا ہوتا ہے کہ ہمارے خاندان کی اعلیٰ قدروں کے لحاظ سے یہ بہت ہی بدذوقی کا مظاہرہ ہوگا۔ بڑی بحث کے بعد آخر کار ایک شام انکو بھی موقع دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ انہوں نے وہ رنگ جمایا کہ سالوں بعد بھی میں نے سنا کہ انکی پرفارمنس انکی تیاری، انکی شان وشوکت اور موسیقی اور کلام کا انتخاب ایسا تھا کہ وہ شام ایک یادگار شام بن گئی۔

اظہر بھائجان کی شادی دہلی کی تاجر برادری کے ایک بہت متمول گھرانے میں ہوئی تھی اور بارات کا انتظام ایک بہت خوبصورت پارک میں کیا گیا تھا۔ یہاں سے بھی بائیس کاروں کے قافلے کی صورت میں بارات گئی تھی۔ بارات کا شاندار استقبال ہوا۔ اور شادی تکمیل کو پہنچی۔

میں اس زمانے میں کالی کھانسی میں مبتلا تھا اور الاماں الحفیظ، جب کھانسی کا دورہ پڑتا تھا تو خیال آتا تھا کہ اب سانس نہیں آئے گا۔ اتنی زور سے سانس کی سیٹیاں بجتی تھیں کہ دور دور سے لوگ پریشان ہو کر بھاگتے آتے تھے کہ کیا ہوا۔ کبھی کبھی تو سانس پر تکلیف کی شدت اور اسکے بعد گہرا سانس کھینچتے ہوئے قے ہو جاتی تھی۔ لوگ مجھ سے بچتے پھرتے تھے کہ انہیں نہ لگ جائے۔ مرتے مرتے بچا اور زیادہ تر وقت سوتے جاگتے گذرا۔

اظہر بھائجان کی شادی کے بعد صفات ماموں نے دستور کے مطابق انکی دعوت کی جس میں سارا خاندان مدعو تھا اور پھر رات بھر کراچی کے مشہور قوال بڑے صالح محمد کی قوالی ہوئی۔

سنا ہے اس نے فجر سے ذرا پہلے جب آخری غزل

شبنم نے بوند بوند گرائی تمام رات

چھیڑی تو لوگ کیف وسُرور میں اس قدر مست ہو چکے تھے کہ فرش پر لوٹنے لگے اور کچھ نے تو بڑھ کر اسکا منہہ چوم لیا۔

شادی کے بعد ہم لوگ واپس میرپورخاص آ گئے مگر ممانی جان نے میری بڑی بہن سلطانہ آپا کو نئی دلہن کا ساتھ دینے کے لئے کچھ دن کے لئے روک لیا۔ وہ کچھ ہفتوں کے بعد واپس آئیں۔

اس شادی کے تذکرے سالوں رہے کہ پھر ایسی پُرکیف اور اعلیٰ پیمانے کی شادی ہمارے خاندان میں نہیں ہوئی۔

''جبینِ نیاز''

(سفرِ پاکستان کی خوش گوار یادیں)

مہندر پرتاپ چاند

(انبالہ،بھارت)

لگ بھگ پندرہ سولہ برس پہلے ملتان کے ماہ نامہ ''سرائیکی ادب'' کے شمارہ نمبر۱۰/جلد۲۳، (۱۹۹۴ء) میں میری پہلی سرائیکی غزل شائع ہوئی تو قریب دو ہفتے کے بعد مجھے لیّہ سے حکیم میاں الٰہی بخش لیکھی سرائی کا ایک کرم نامہ موصول ہوا جس سے منسلکہ متعلقہ صفحہ کی فوٹو نقل بھی تھی۔ میاں جی نے غزل کی تعریف کرتے ہوئے اس خوش گوار حیرت کا اظہار بھی کیا تھا کہ اتنے برس گذر جانے کے باوجود میں نے اپنی ماں بولی (مادری زبان) کو نہ صرف یاد رکھا ہوا ہے بلکہ اس زبان میں اچھا کلام بھی کہتا ہوں۔ موصوف نے مجھ سے مزید استفسار بھی کیا تھا کہ میرا آبائی شہر کون سا ہے؟

یقیناً اپنے ہی علاقے کے ایک اجنبی سے اتنا شفقت آمیز خط پا کر مجھے بے پناہ مسرت کا احساس ہوا تھا اور جب میں نے جواباً اُس کے تئیں اظہار تشکر کرتے ہوئے انھیں یہ بتایا کہ میں بھی ضلع لیّہ ہی کی مٹی سے پیدا ہوا تھا تو اُن کی محبت میں ہزار چند اضافہ ہوگیا۔

میری جائے ولادت کروڑ لعل عیسن ہے جو تقسیم ملک کے وقت ضلع مظفر گڑھ میں تھا۔ کروڑ کے پرائمری سکول میں ہماری جماعت کے کمرے میں ضلع مظفر گڑھ سے متعلق ایک دیوار پر جو چارٹ آویزاں تھا اس پر درج نظم کا یہ پہلا شعر آج بھی مجھے یاد ہے:

چار تحصیلاں وچ ضلعے دے، سن لے میرے بھیّا
علی پور، مظفر گڑھ، کوٹ اڈّو سے لیّہ

قیامِ پاکستان کے بعد لیّہ کو تحصیل سے ضلع بنا دیا گیا اور اب میرا آبائی قصبہ لیہ کروڑ لعل عیسن اسی ضلع میں ہے۔

میاں جی کی عنایات میں اضافہ ہوا تو انہوں نے میرے خطوط اپنے تمام احباب وعزیزان کو دکھانے شروع کر دئے اور پھر اُن سبھی حضرات کے مہربانی نامے مجھے براہ راست آنے شروع ہوگئے۔ دراصل میاں جی ایک نیک نفس بزرگ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک باکمال صاحبِ فن، انجمن ساز بلکہ بذاتِ خود ایک انجمن ہیں۔ انھوں نے ان برسوں میں ہزاروں روپے خرچ کر کے مجھے وہاں کی بے شمار نادر کتابیں بذریعہ ڈاک روانہ کی ہیں۔ اس خوشگوار رابطے کی تحریک سے دلی خواہش پیدا ہوئی کہ وہاں جا کر اس فرشتہ سیرت کرم فرما کا دیدار کروں اور اپنی جنم بھومی کی زیارت بھی۔

۱۹۹۷ء میں میری رفیقۂ حیات اور میں اپنے چھوٹے بیٹے کے پاس امریکا گئے ہوئے تھے اور میرا پکّا ارادہ تھا کہ وہاں سے واپس آ کر اپنی ارضِ ولادت کی زیارت کی اِس آرزو کی تکمیل کروں گا۔ لیکن بدقسمتی سے ۲۷ مئی ۱۹۹۷ء کو ہمارے قیام امریکہ کے دوران ، بھارت میں ہمارے بڑے بیٹے دویک کا ایک سڑک حادثے میں انتقال ہوگیا اور ہمیں فوراً واپس آنا پڑا۔ اس سانحہ جانکاہ کے کافی عرصہ بعد تک میں ذہنی طور پر اس غیر آسودہ خواہش کی تکمیل کے لیے خود کو تیار نہ کر سکا۔ اور اسی طرح مزید کئی برس بیت گئے۔

پھر ۲۰۰۴ء میں ''مجلس اربابِ نسیم لیّہ'' اور ''انٹرنیشنل بزم علم وفن پاکستان لیّہ'' نے از راہِ کرم میری حقیر علمی وادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر مجھے اس برس کے ''نسیم لیّہ ایوارڈ'' سے نوازتے ہوئے ایک توصیفی سند تو ڈاک سے بھیج دی اور ساتھ میں یہ دعوت بھی دی کہ میں لیّہ آؤں تا کہ وہ محبانِ علم وادب میرے اعزاز میں ایک تقریب کا انعقاد کر سکیں اور مجھے اس ایوارڈ سے سرفراز کر سکیں۔ ان دنوں سردار شہاب الدین سہڑ لیّہ کے ضلع ناظم تھے۔ ان کا تعلق بھی کروڑ سے ہے۔ اُنہوں نے اور لیّہ کے دیگر تمام اربابِ ذوق نے بہت کوشش کی کہ مجھے اور میرے کچھ دیگر ادیب دوستوں کو ویزا مل جائے تا کہ ہم لیّہ کی مجوزہ تقریب میں شامل ہو سکیں۔ مگر بوجوہ اس وقت ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ پھر کچھ برسوں تک ہمارے دونوں ملکوں کے درمیان سیاسی تعلقات قدرے کشیدہ رہے اور اس طرح کئی سال اور گذر گئے اور یہ آرزو بَر نہ آ سکی۔

اب ماہ اکتوبر ۲۰۱۰ء کے شروع میں اچانک ایک روز میرے کرم فرما ہمارے صوبہ ہریانہ کے راجیہ کوی، ہندی کے معروف ممتاز ادیب پروفیسر اُودے بھان ہنس کا ٹیلی فون آیا کہ وہ میرے ہمراہ پاکستان جانا چاہتے ہیں۔ اُسی روز ہم نے ویزا کے لیے کاغذات تیار کرنا شروع کر دئے اور دو تین دنوں کے اندر پاکستان ہائی کمیشن (دہلی) کے دفتر میں جمع بھی کروا دئے۔

ہنس جی کا تعلق ضلع مظفر گڑھ کے قصبہ دائرہ دین پناہ سے ہے اور وہ ایک بار پہلے بھی ۲۰۰۶ء میں اپنے وطن کی زیارت کر آئے تھے۔ وہاں اُن کے آبائی مکان میں شروع ہی سے حاجی رانا جمشید علی خاں مقیم ہیں۔ پروفیسر ہنس پہلی بار جب اپنا مکان دیکھنے وہاں گئے تھے تو رانا صاحب نے اُن کا پُرخلوص استقبال کیا تھا اور وہ ملاقات اُن کے درمیان ایک گہری دوستی میں تبدیل ہوگئی تھی۔ اب ۲۴ اکتوبر ۲۰۱۰ء کو جمشید علی خاں صاحب کی بیٹی کی شادی تھی اور انہیں مراسم کی بنا پر ہنس جی اس خوشی کے موقع پر وہاں حاضر ہو کر تمام تقاریب نکاح میں شامل ہونا چاہتے تھے اور مجھے بھی شریک کرنا چاہتے تھے۔

۲۰ اکتوبر تک ویزا کے بارے میں کوئی اطلاع موصول نہیں ہوئی تو ہم قدرے مایوس ہوگئے تھے لیکن ۲۱ اکتوبر قبل دوپہر

کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

ہنس جی کا فون آیا کہ ویزا لگ گیا ہے۔ لہٰذا اُسی رات کو میں یہاں انبالہ سے

بذریعہ بس امرتسر کے لیے روانہ ہوا اور پروفیسر ہنس اپنے ایک عزیز مسٹر ایس کے جین (جو ہندی کے صحافی ہیں) کے ہمراہ حصار (ہریانہ) سے بذریعہ ریل رات کو روانہ ہوئے جو صبح ۹ بجے امرتسر پہنچتی ہے۔ انبالہ سے روانہ ہونے سے پہلے میں نے پاکستان کے اپنے تمام نادیدہ احباب کو بذریعہ ای میل اپنی آمد کی اطلاع دے دی تھی۔

دراصل ۲۰۰۷ء میں میں نے ہریانہ اُردو اکادمی (پنچ کولہ) کے لیے ایک تحقیقی پروجیکٹ پر کام کیا تھا جس کے لیے بھارت کے علاوہ مجھے پاکستان کے بھی اُن تمام شعراء، ادبا اور صحافیوں کے کوائف نیز اُن کی شعری ونثری تحریروں کے نمونے مطلوب تھے جو تقسیم ملک کے وقت ہریانہ سے ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے تھے۔ اس سلسلے میں لاہور میں مقیم میرے کرم فرما جناب اقبال سحر انبالوی (مدیر ماہنامہ رُشحات) اور میرے نادیدہ ہم وطن اور مربّی پروفیسر جعفر بلوچ (جو وہاں گورنمنٹ سائنس کالج لاہور میں اردو کے استاد تھے نیز معروف ادیب، شاعر و محقق تھے) نے خاص طور پر میری بہت معاونت فرمائی تھی۔ انہیں دونوں احباب کی وساطت سے میں حضرت حسن عسکری کاظمی، سرور انبالوی، مشکور حسین یاد اور انوار فیروز وغیرہ کئی معروف ہستیوں سے بھی متعارف ہوا تھا۔ افسوس کہ اب اقبال سحر انبالوی اور پروفیسر جعفر بلوچ دونوں صاحبان واصلِ بحق ہو چکے ہیں۔

۲۲۔ اکتوبر ۲۰۱۰ء:

میری ای میل کے جواب میں پروفیسر جعفر بلوچ کے فرزند ارجمند عزیزی شعیب بلوچ نے لاہور سے مجھے موبائیل پر پیغام بھیجا کہ میں واگھہ بارڈر پر اپنے پہنچنے کا اندازاً وقت اُنھیں بتادوں تاکہ وہ اُس طرف ہمیں لینے کے لیے آسکیں۔ ۲۲۔ اکتوبر کو میں تو صبح چھ بجے کے قریب امرتسر پہنچ گیا تھا اور حصار سے آنے والی ٹرین صبح ساڑھے نو بجے کے آس پاس متوقع تھی۔ لہٰذا میں نے فون پر شعیب کو بتادیا کہ بارہ ساڑھے بارہ بجے کے قریب ہمارے وہاں پہنچنے کا امکان ہے۔ وہ عزیز دوپہر بارہ بجے ہی واگھہ بارڈر کے اُس پار پہنچ گیا اور مجھے وہاں اپنی آمد کی اطلاع بھی دے دی۔ لیکن بدقسمتی سے اِدھر حصار کی گاڑی لیٹ پر لیٹ ہوتی چلی گئی اور سوا بارہ کے آس پاس یہ امرتسر اسٹیشن پر پہنچی۔ مجھے عزیزی شعیب کو اس تاخیر کی اطلاع دیتے ہوئے بہت خفت محسوس ہوئی کہ اب ہم تو وہاں تین، ساڑھے تین بجے سے پہلے نہیں پہنچ پائیں گے۔ لیکن آفرین ہے میری لیّہ کی دھرتی کے سعادت مند بیٹے پر کہ اُس نے اس بات پر ذرا سا ملال کا بھی اظہار نہیں کیا اور مجھ سے کہا "کوئی بات نہیں انکل میں واپس لاہور جا رہا ہوں اور ساڑھے تین بجے دوبارہ آجاؤں گا" عزیز نے مزید یہ بھی کہا کہ "اگر آپ میرے دوبارہ آنے سے پہلے بارڈر پار کر لیتے ہیں تو پاکستان کسٹم آفس میں میرے دوست مسٹر سعید آپ کے استقبال کے لیے موجود ہوں گے۔"

واگھہ بارڈر سے لاہور پچیس تیس کلومیٹر دور ہے۔ عزیزی شعیب کو ہماری خاطر دوبارہ وہاں سے آنا پڑا اس خیال سے مجھے اپنے آپ میں بہت ندامت ہو رہی تھی۔ بہرحال بعد دوپہر دو بجے ہم ٹیکسی لے کر واگھہ بارڈر پہنچے (امرتسر سے بھی واگھہ بارڈر قریب تیس کلومیٹر ہے) اور فوراً اپنی طرف کی کسٹم چیکنگ آفس کے اندر داخل ہو گئے۔ متعلقہ دفتر کے عملہ کے لوگ سبھی بہت خوش اخلاق تھے اور بے حد مُساعد بھی۔

قریب آدھ پون گھنٹے میں ہم وہاں سے فارغ ہوئے تو تھوڑی ہی دُوری پر سامنے پاکستان بارڈر کا گیٹ تھا۔ اُسے پار کیا تو مدتوں بعد اپنی اس سرزمین پر قدم رکھتے ہی ایک بے نام سی انوکھی مسرت کا احساس ہوا جو روح کو سرشار کر گیا۔ پھر وہاں کے کسٹم آفس کے احاطہ میں داخل ہوئے تو سعید صاحب پہلے ہی سے ہمارے منتظر تھے۔ بہت تپاک اور خندہ پیشانی سے اُنھوں نے ہمارا استقبال کیا۔ انھوں نے ہمارا سامان کیمرہ چیکنگ وغیرہ کے لیے متعلقہ سیکشن میں بھجوا دیا۔ ہمیں اپنے ہمراہ اندر لے گئے اور چائے وغیرہ سے ہماری تواضع کی۔

وہاں سے فارغ ہو کر باہر نکلے تو عزیزی شعیب بھی وہاں پہنچے ہوئے تھے۔ ہم سے بغل گیر ہونے کے بعد انھوں نے ہمارا سامان اپنی گاڑی میں رکھوایا اور لاہور پہنچ کر سیدھے اپنے گھر لے گئے جو وہاں وحدت کالونی میں ہے۔ ان کے اہل خانہ نے ہمیں نہایت پُرتکلف کھانا کھلایا اور پھر میرے اصرار پر شعیب نے رات کے قیام کے لیے ہمیں ایک گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرادیا۔ اس دوران عزیزی شعیب نے ہمارے لیے مطلوبہ پاکستانی کرنسی اور موبائل سم اور ریچارج کا انتظام بھی کر دیا تھا۔

تقسیم وطن کے وقت میری عمر صرف بارہ سال کی تھی اور میں نے ہجرت کے وقت ریل کے سفر کے دوران لاہور کا صرف اسٹیشن ہی دیکھا تھا۔ لہٰذا اُس رات مجھے بے حد فخر کا احساس ہوا کہ میں آج اُس شہر میں وارد ہوا ہوں جس کے بارے میں مشہور ہے کہ "جنے لاہور نئیں ویکھیا اوہ جمیا ہی نئیں" (یعنی جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا) لیکن اس حسین شہر کی باقاعدہ سیاحت کرنے کے لیے ابھی ہمیں کچھ دن اور انتظار کرنا تھا کیوں کہ اگلے روز ہمیں شام تک ضرور دائرہ دین پناہ پہنچنا تھا۔ لہٰذا واپسی پر ہی یہ تمنا بر آسکی جب ہم دوبارہ ۳۰۔ اکتوبر کی صبح کو لاہور پہنچے تھے۔

۲۳۔ اکتوبر ۲۰۱۰ء:

یعنی اگلی صبح عزیزی شعیب پھر ہمارے پاس گیسٹ ہاؤس میں پہنچے اور اپنی گاڑی میں ہمیں ڈیوو ایکسپریس (Daewoo Express) کے بس اڈے پر لے گئے جہاں سے ہم نے صبح دس بجے کے قریب ملتان کے لیے روانگی کی اور بعد دوپہر ملتان پہنچ گئے۔ اس ایئرکنڈیشنڈ بس کا سفر بہت آرام دہ اور خوش گوار تھا۔ سفر کے دوران پانی، کولڈ ڈرنکس، بسکٹوں، کیک اور Snacks وغیرہ سے ہماری تواضع کی گئی۔ راستے میں ساہیوال کے مقام پر بس

قریب آدھ گھنٹے کے لیے رُکی جہاں اُتر کر ہم نے چائے، کافی وغیرہ لی۔

ملتان میں ہنس جی کے ایک دیرینہ حبیب ملک عبدالقیوم خاں جتوئی رہتے ہیں جو سابق وزیر اور حال ایم۔پی ہیں۔ جتوئی صاحب نہایت نیک نفس اور باذوق انسان ہیں۔ وہ اُس روز خود تو غالباً اسلام آباد گئے ہوئے تھے لیکن اُن کا ڈرائیور اُن کی گاڑی لے کر ہمارے انتظار میں تھا۔ اسی اثنا میں ملتان کے روزنامہ اخبار اور ٹی وی ''خبریں'' کے نمائندے جناب رازش لیاقت پوری اپنے چند دیگر ساتھیوں کے ہمراہ پھولوں کے ہار لے کر ہمارے استقبال کے لیے وہاں آ پہنچے اور ہماری گل پوشی کے بعد ہمیں اپنے دفتر میں لے گئے جہاں انھوں نے ہمارا مختصر انٹرویو ریکارڈ کیا اور کچھ تصاویر لیں جنہیں اگلے روز انہوں نے اپنے اخبار میں شائع کیا اور رات کو اپنے ٹی۔وی پر ٹیلی کاسٹ بھی کیا۔

آدھ پون گھنٹہ اُن عزیزان کے ساتھ گزار کر ہم جتوئی صاحب کی کار سے مظفر گڑھ سے ہوتے ہوئے دیرشام دائرہ دین پناہ پہنچ گئے جہاں سڑک پر ہی حضرات تنویر شاہد محمد زئی، حنیف سیماب، ارشد نیازی اور صابر عطا فہیم صاحبان اپنے کئی دیگر احباب کے ساتھ ہماری راہ دیکھ رہے تھے۔ وہیں پاس کی ایک بیٹھک میں وہ ہمیں لے گئے جہاں چائے بسکٹ اور پکوڑوں سے ہماری تواضع کی گئی اور پھر ایک مختصر سی شعری نشست کا اہتمام بھی ہو گیا۔ ازاں بعد ہم اپنی منزل مقصود یعنی رانا جمشید علی خاں صاحب کے گھر پہنچے۔ وہ ہم سب سے مل کر بہت خوش ہوئے اور ہمیں اپنے بیٹوں و دیگر رشتہ داروں سے ملوایا۔ کچھ باتیں ہوئیں لیکن دن بھر سفر میں رہنے کی وجہ سے ہم بہت تھکے ہوئے تھے اس لیے کھانا کھا کر جلدی سو گئے۔

۲۴۔اکتوبر ۲۰۱۰ء:

یعنی اگلی صبح ناشتہ کے بعد ہم حضرت دین پناہ المعروف حضرت عبد الوحید (یا عبدالوہاب) بخاری کے مزار پر حاضر ہوئے اور سجدہ شکرانہ ادا کیا۔ حضرت دین پناہ ۱۷ویں صدی کے معروف ولی کامل تھے۔ اُنہیں کے نام سے یہ قصبہ آباد ہے۔ اُردو و سرائیکی کے ممتاز مستند شاعر و صحافی جناب کشفی ملتانی کی ولادت بھی یہیں دائرہ دین پناہ میں ہوئی تھی ان کی قبر حضرت دین پناہ کے مزار کے سامنے موجود ہے۔

دوپہر کو رانا جمشید علی خاں کی دختر نیک اختر کے نکاح کی تقریبات میں ہم شامل ہوئے۔ دولہا کی طرف سے آئے ہوئے مہمانوں کے ساتھ رانا صاحب نے ہمارا تعارف کرایا اور ان کے ساتھ ہماری کچھ تصاویر بھی لی گئیں۔ اسی دوران لیہ سے میاں الٰہی بخش صاحب کے سب سے بڑے بیٹے عزیزی شہباز حسین کا موبائل پر پیغام آیا کہ چونکہ اُسی رات وہ اپنی تعلیمی کارکردگی کے سلسلے میں اسلام آباد جا رہے ہیں اور دس پندرہ دن کے بعد اُن کی واپسی ہو گی لہٰذا وہ اُسی روز مجھ سے ملنے کے لیے دائرہ دین پناہ آ رہے ہیں۔ عزیزی شہباز اسلام آباد کی علامہ اقبال انٹرنیشنل اوپن یونیورسٹی سے تاریخ میں ایم اے کر رہے ہیں اور اسی سلسلے میں کوئی امتحان دینے کے لیے اُن کا وہاں جانا ضروری تھا۔ میں نے انہیں منع بھی کیا کہ وہ اپنے امتحان کی تیاری کریں رات کو انہیں اتنا لمبا سفر کرنا ہے اور دائرہ دین پناہ آنے جانے میں اُن کا بہت وقت برباد ہو گا۔ لیکن وہ نہیں مانے اور قریب ڈیڑھ گھنٹے کے بعد اپنے ایک دوست کے ہمراہ ہمارے پاس پہنچ گئے۔ ہم سب نے مل کر کھانا کھایا اور پھر عزیزی شہباز کو لیہ واپسی کے لیے رخصت کیا۔

اُسی شام کے لیے عزیزان ارشد نیازی، حنیف سیماب اور تنویر شاہد نے ایک ادبی نشست کا اہتمام کر رکھا تھا جہاں ایک مقامی ایم پی بھی تشریف لائے تھے۔ حنیف سیماب نے نظامت کے فرائض انجام دیئے اور ہمارے علاوہ وہاں کے کئی مقامی شعراء نے اپنے اپنے اردو و سرائیکی کلام سے اہلِ محفل کو محظوظ و مسحور کیا۔ لیہ اور اس کے گرد و نواح کا علاقہ اعلیٰ قسم کی کھجوروں کے لیے بہت مشہور ہے۔ ان دنوں تازہ کھجور کا موسم تو نہیں تھا لیکن ان میزبان دوستوں نے ہم تینوں کو سندھی کھجوروں کا ایک ایک پیکٹ پیش کیا اور ساتھ میں ہم سب کو وہاں کی انجمن تاجران کی طرف سے حسن کارکردگی کے خوبصورت ممینٹوز (Mementoes) بھی عطا کیے۔

۲۵۔اکتوبر ۲۰۱۰ء:

(اگلی صبح) ہم نے ایک بار پھر حضرت دین پناہ کے مزار پر حاضری دی۔ مزار کے بالکل قریب ہنس جی کے ایک ہم دم دیرینہ جناب ذوالفقار علی مخدوم سکونت رکھتے ہیں۔ مخدوم صاحب دائرہ دین پناہ کے معروف رئیس اور زمیندار ہیں نہایت پُر خلوص اور دلدار انسان ہیں۔ وہ گذشتہ شب ہی ملتان سے واپس آئے تھے کہ وہاں بھی اُن کا ایک اپنا مکان ہے۔ ہمیں پتہ چلا تو ہم اُن کے ہاں چلے گئے وہ بہت تپاک سے ملے اور پُر تکلف چائے سے ہماری تواضع کی اور پھر وہاں کے سیلاب زدہ علاقوں کی حالت زار دکھانے کے لیے اپنی کار میں ہمیں لے گئے۔ چند ماہ قبل ضلع لیہ و مظفر گڑھ کے کئی علاقوں میں سیلاب کی وجہ سے قہر برپا ہوا تھا اور دائرہ دین پناہ کا قصبہ تو لگ بھگ مکمل طور پر پانی میں ڈوب گیا تھا۔ اُجڑی ہوئی اراضیات، فصلیں اور ٹوٹے ہوئے پُل دیکھ کر جی بھر آیا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ خدا اپنی معصوم اور بے گناہ مخلوق پر اس طرح کی آفتیں کیوں نازل کرتا ہے۔

واپسی پر کھجور کے ایک پیڑ پر دو چار کچّی کھجور کے گچھے لٹکتے نظر آئے تو جین صاحب نے گاڑی رکوا کر اُنہیں دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ مخدوم صاحب نے پاس کھڑے ایک لڑکے کی مدد سے ایک گچھا اُتروایا اور جین صاحب کے حوالے کر دیا۔ جین صاحب کا تعلق اُس علاقے سے نہیں ہے لہٰذا اُن کے لیے یہ ایک نئی سوغات تھی۔ یہ کچی کھجور ہیں جسے سرائیکی میں ہم ''ڈوکے'' کہتے ہیں پیلے، لال اور نیلے رنگ کی ہوتی ہیں۔ بعد میں تو یہ پیڑ پر ہی پک کر نرم ہو جاتی ہے یا پھر انہیں کچا ہی اتار کر کچھ لوگ انہیں گھڑے وغیرہ میں ڈال کر اور پر نمک

چھڑک کرکافی دیرتک ہلاتے تھے اور اگلی صبح خوب نرم ہوجانے پرانہیں بیچنے کے لیے لاتے تھے۔

بعد ازاں مخدوم صاحب ہمیں دائرہ دین پناہ کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں لے گئے جہاں مدّتوں پہلے ہنس جی نے تعلیم حاصل کی تھی۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر ملک توکل حسین صاحب اور اُن کے دیگر سٹاف ممبران سے ملنے کے بعد ہم اسکول کے بچوں سے ملے جو ہیڈ ماسٹر صاحب نے اپنے دفتر کے باہر کمپاؤنڈ میں یکجا کر لیے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے ہم تینوں نے طلبا کو مخاطب کیا اور انھیں فخر کے ساتھ یہ بتایا کہ ہمارا تعلق بھی اسی سرزمین سے ہے۔ اس کے بعد کچھ بچے میرے پاس آ گئے اور کئی سوال پوچھنے لگ گئے۔ ایک بچے نے مجھ سے پوچھا کہ آپ اتنی اچھی اردو اور سرائیکی بولتے ہیں تو آپ اسلام کیوں نہیں قبول کر لیتے؟ مجھے اُس کی معصومیت پر بہت پیار آیا اور میں نے اُس سے کہا ''بیٹے! اُردو یا سرائیکی صرف مسلمانوں کی زبانیں نہیں ہیں اور میں اگر اسلام قبول کر بھی لوں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑیگا۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ خدا نے ہمیں جس مذہب میں پیدا کیا ہے اُسی میں رہ کر ہم دیگر تمام مذاہب کا احترام کریں اور ہر مذہب کی اعلیٰ تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کریں۔ وہ بہت خوش ہوا اور اُس نے معذرت بھی کی گو اس کی ضرورت نہ تھی کیوں کہ بچے تو بھگوان کا روپ ہوتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے اُس کے سوال پر ذرا بھی ملال نہیں ہوا۔

پھر شام کو مخدوم صاحب ہی کی کار سے ہم لیّہ کے لیے روانہ ہوئے۔ دیر شام وہاں پہنچے تو میاں الٰہی بخش صاحب کے دوسرے بیٹے عزیزی امداد حسین اور میاں جی کے بھتیجے عزیزی شمشاد حسین سڑک پر ہی ہمارے منتظر تھے۔ ان کے ہمراہ ہم میاں جی کے دولت کدے پر پہنچے تو اُن کا نیاز حاصل کر کے میری آنکھوں سے بے اختیار خوشی کے آنسو چھلک پڑے۔ انھوں نے بھی نم آنکھوں سے مجھے گلے لگایا اور پھر دیر تک غور سے مجھے دیکھتے رہے۔ چند ماہ قبل ہی پہلے اُن کی جوان بیٹی عزیزہ شگفتہ بتول بیوہ ہوگئی اور پھر ان کے چھوٹے بھائی لقمۂ اجل ہوگئے تھے۔ انہیں جانکاہ صدمات کی وجہ سے اُن کی قوتِ گویائی چلی گئی تھی جس کے نتیجہ کے طور پر وہ بسیار کوشش کے باوجود کچھ بول نہیں پا رہے تھے۔ بس اُن کی بے بس آنکھیں ہی مجھ پر اُن کی شفقت نچھاور کر رہی تھیں۔ وہ کئی بار اسی عالم لاچارگی میں کبھی میرے سر پر ہاتھ پھیرتے اور پھر کبھی میرے سامنے ہاتھ جوڑ کر بیٹھ جاتے۔ مجھے اُن کی یہ ناچاری دیکھ کر اپنی مجبوریوں پر بے حد ندامت ہو رہی تھی کہ میں اتنے برسوں تک اُن کے بار بار بلانے پر بھی یہاں کیوں نہ آ پایا! غالباً یہ میری اُسی فروگذاشت کی سزا تھی کہ آج میں اُن کی شیریں کلامی سے محروم رہ کر بے بس ولاچار بیٹھا تھا۔ وہ بہت بولنے کی کوشش کرتے تو عزیزی امداد حسین جو تھوڑا کچھ سمجھ پاتے تھے مجھے بتا دیتے تھے لیکن میری تشنگی برقرار رہی اور میں نے اُن سے وعدہ کیا کہ آپ انشاءاللہ جب پھر سے بولنے لگیں گے تو میں خصوصی طور پر آپ سے ملنے کے لیے دوبارہ آؤں گا۔

رات کو کئی نادیدہ احباب ملنے کے لیے آ گئے جن میں سے بیشتر کے ساتھ میری خط وکتابت رہی تھی۔ ان میں ڈاکٹر گل عباس اعوان اور محمد سلیم اختر ندیم پیش پیش تھے۔ ڈاکٹر گل عباس اُردو وسرائیکی کے عالم ہیں اور وہ ہیں لیّہ کے گورنمنٹ کالج میں اُردو زبان وادب کے استاد ہیں۔ اُردو وسرائیکی کی کئی شعری ونثری کتابوں کے مصنّف ہیں اور بزم دانش (لیّہ) کے صدر بھی۔ جناب سلیم اختر ندیم ممتاز شاعر وادیب ہیں اور ''بین الاقوامی ادبی قبیلہ (رجسٹرڈ) لیّہ پاکستان'' کے مرکزی سیکرٹری جنرل ہیں۔ میاں الٰہی بخش صاحب اس تنظیم کے سرپرست ہیں اور ان کے عزیز بھتیجے شمشاد حسین سرائی اس کے چیئر مین ہیں، موصوف جانے مانے صحافی ہیں۔ ان کے علاوہ بہت پیارے عزیز عاقب خاں بھی وہاں دیر رات تک ہمارے پاس موجود رہے۔ عاقب خاں میاں امداد حسین کے نہایت قریبی دوستوں میں سے ہیں۔ ان تمام احباب نے ہمیں اطلاع دی کہ اگلے روز دوپہر بارہ بجے وہ اور ان کے دیگر کئی رفقاء ہمارے اعزاز میں ''بین الاقوامی ادبی قبیلہ'' اور ''بزم دانش'' کی جانب سے ایک شاندار تقریب کا اہتمام کر رہے ہیں۔ اور اُسی رات ان حضرات نے اس مجوزہ تقریب کے لیے دعوت نامے تیار کروا کے تقسیم کرنے شروع کر دئے۔

۲۶۔ اکتوبر ۲۰۱۰ء:

(لہٰذا اگلے روز) وہاں خان کالج آف کامرس لیّہ میں منعقد کی جانے والی اس یادگار تقریب میں شامل ہونے کے لیے تمام احباب ہمیں بروقت وہاں لے گئے جہاں پہنچنے پر گیٹ سے باہر ہی ہماری گل پوشی کی گئی اور نہایت محبت اور احترام کے ساتھ ہمیں اندر لے جا کر ڈائیس پر بٹھایا گیا۔ گیٹ سے لے کر ہال میں داخل ہونے تک دونوں اطراف سے کالج کے طلباء طالبات ہم پر گلاب کے پھولوں کی پتیاں نچھاور کر رہی تھیں۔ ہال میں سینکڑوں باذوق حضرات کا جم غفیر پہلے ہی سے موجود تھا جن میں سے کئی حضرات خط وکتابت کے ذریعے پہلے ہی سے میرے شناسا تھے جیسے ڈاکٹر مزمل حسین (جو مقامی گورنمنٹ کالج میں اُردو کے استاد ہیں) جناب ناصر ملک ڈائریکٹر آرٹ لینڈ، جناب برکت اعوان (سینئر صحافی) جناب جسارت خیالی وغیرہ۔ ان کے علاوہ وہاں اور بھی کئی اہلِ قلم حضرات سے ملاقات ہوئی جن میں منور بلوچ، مخدوم عامر، ملک صابر عطا تھہیم، علی عمران رضوی، یٰسین بھٹی، ماسٹر منظور بھٹہ اور حمید الفت ملتانی صاحبان کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اس تقریب کی صدارت اُستادالشعراء محقق وناول نگار امان اللہ کاظم صاحب نے فرمائی۔ اس محفل کی کاروائی دو حصوں میں منقسم تھی۔ پہلی نشست میں مہمان اعزاز یعنی خاکسار کے فن اور شخصیت پر چند مقالے پیش کئے گئے اور اسی دور میں حضرت شمشاد حسین سرائی، سلیم اختر ندیم، خالد ندیم شانی اور غلام قاسم عارض نے اپنے اپنے منظوم تحسین وتوصیف ناموں سے بھی اس خاکسار کی

پذیرائی کی۔ جلسہ کی نظامت ڈاکٹر گل عباس نے فرمائی جنھوں نے اپنی تقریر کے دوران راقم السطور کے لیے ایک استقبالیہ نظم بھی سرائیکی میں پیش کی۔

پہلی نشست کے اختتام پر خاکسار کو محترم میاں الٰہی بخش صاحب کے دست مبارک سے ایک بار پھر ۱۰۔۲۰۰۹ء کے ''نسیم لیّہ ایوارڈ'' سے سرفراز کیا گیا اور میرے دونوں ساتھیوں کو بھی توصیفی اسناد پیش کی گئیں۔

دوسری نشست محفل مشاعرہ پر مشتمل تھی جس میں پہلے کئی ممتاز مقامی شعراء نے اہلِ محفل کو محظوظ کیا۔ بعد میں باری باری ہم تینوں کو اپنے تاثرات کا اظہار کرنے کے لیے دعوت دی گئی۔ ہنس جی اور راقم السطور نے اپنا اپنا سرائیکی اور اُردو کلام بھی سنایا۔ اپنی جنم بھومی کو مخاطب کرتے ہوئے میں نے جب یہ نظم پیش کی تو پڑھتے پڑھتے کئی بار من بھر آیا اور حاضرین پر بھی ایک رقّت سی طاری ہوگئی۔ آخری بند میں بیان کی گئی اپنی دیرینہ آرزو کی آج تکمیل ہوئی تھی تو شدتِ جذبات سے آنکھوں سے خوشی کے آنسو چھلکنے لگے:

نذرِ کروڑ

مرے کروڑ کی پاکیزہ سرزمیں تجھ کو
ترے دیار کا شاعر سلام کرتا ہے
جھکا کے اپنی جبینِ نیاز تیرے حضور
زبانِ شعر میں تجھ سے کلام کرتا ہے

تری زمین پہ ولادت کا ہے شرف مجھ کو
تری فضاؤں سے رشتہ ہے میرے بچپن کا
ابھی تو بارہ بہاریں ہی میں نے دیکھی تھیں
کہ تجھ سے دور مشیت نے مجھ کو پھینک دیا

خدائی قہر تھا یا کھیل تھا سیاست کا
یہ میری کم سنی اُس وقت کچھ سمجھ نہ سکی
بڑا ہوا تو نیا وقت تھا۔ نئے حالات
مِری نگاہ تری دید کو ترستی رہی

نئے دیار میں جب جب ترا خیال آیا
تو ایک برق سی قلبِ حزیں پہ لہرائی
میں تجھ سے پوچھتا ہوں اے مرے عزیز وطن!
تجھے بھی کیا کبھی بچھڑے ہوؤں کی یاد آئی

نہیں۔ نہیں۔ نہیں تو بھی ملوُل ہے اب تک
ہے تیرے دل میں بھی قائم ابھی مری تصویر

یہ تیری دید کی حسرت جو آج تک ہے جواں
تری فضاؤں کی جذب وکشش کی ہے تاثیر

وہ گھر، وہ کوچے، وہ گلیاں، وہ رہ گذار ترے
ہیں دل پہ نقش، اِنھیں کس طرح بھلاؤں میں؟
نصیب ہو ترا دیدار، بس دعا ہے یہی
جبیں پہ خاکِ مقدس تری سجاؤں میں!

مرے کروڑ کی پاکیزہ سرزمیں! تجھ کو
ترے دیار کا شاعر سلام کرتا ہے
جھکا کے اپنی جبینِ نیاز تیرے حضور
زبانِ شعر میں تجھ سے کلام کرتا ہے

قریب چار بجے اس حسین اور یادگار تقریب کی کاروائی اختتام پذیر ہوئی جس کے فوراً بعد ڈاکٹر گل عباس ہمیں اپنے دیرِ دولت پر لے گئے جہاں انھوں نے نہایت پُر تکلف طعام سے ہماری میزبانی کی اور اپنی اُردو و سرائیکی کی چند تصانیف بھی ہمیں مرحمت فرمائیں۔ اس سے قبل بھی اعزازی تقاریب کے دوران کئی احباب نے ہمیں اپنے اپنے نثری و شعری مجموعوں سے نوازا تھا۔

ملتان سے لے کر میانوالی بلکہ اُس سے بھی کچھ آگے کا علاقہ ادبی لحاظ سے بے حد مُردم خیز واقع ہوا ہے۔ منشی تلوک چند محروم، جگن ناتھ آزاد، آزاد گلاٹی، رام لعل، ہرچرن چاولہ، امیر چند بہار، شباب للت، راجندر بالی، گوپی چند نارنگ، اشند لال فقیر، جعفر بلوچ، کشفی ملتانی، نسیم لیّہ، اُودے بھان ہنس، کمار پاشی، سروجنی پریتم، جیمنی سرشار، ستیہ پال بیدار، ناز سونی پتی، بھگوان داس اعجاز، تبسم علی پوری، فکر تونسوی، طاہر تونسوی، سرور تونسوی، نقش صحرائی، پورن کمار ہوش، اُتم چند شرر، شہید علی پوری، ہیرانند سوز، آزاد سونی پتی، رانا گنوّری، درویش بھارتی، انگر شہانی، منوّر سرحدی، کمار پانی پتی، کرشن نندہ کرشن، آتش بہاولپوری، مہر گیرہ، بودھراج ظفر اور بیتاب علی پوری وغیرہ شعراء و ادباء کا خاصا لمبا کارواں ہے، جس کا وطن مولود خاکسار کی طرح یہی سرائیکی خطہ ہے۔

اپنے علاقوں کی اس سیاحت کے دوران جو خاص بات ہم نے دیکھی وہ یہ ہے کہ اب اس سرزمین پر اُردو کی نسبت سرائیکی میں زیادہ ادب تخلیق کیا جا رہا ہے۔ سرائیکی زبان کی باقاعدہ تعلیم اور تحقیق کے معاملے میں بھی پاکستان کے کئی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اس کی سہولیات فراہم کی جا رہی ہیں۔ اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے تمام کالجوں میں بی۔ اے تک اور یونیورسٹی ہٰذا میں ایم۔ اے تک کی تعلیم کے انتظامات ہیں۔ بہاؤالدین ذکریا یونیورسٹی ملتان میں بھی سرائیکی میں ایم۔ اے تک کی باقاعدہ تعلیم دی جا رہی ہے۔ اسی طرح علامہ اقبال انٹرنیشنل اوپن یونیورسٹی اسلام آباد اور پنجاب یونیورسٹی لاہور

میں سرائیکی زبان وادب میں پی۔ایچ۔ڈی تک کی تعلیم کی سہولیات دستیاب ہیں۔ملک کی تقسیم کے بعداب ان اسباب کی فراہمی سرائیکی زبان کی مقبولیت، ہردل عزیزی اورفروغ کے ارتقامظہر ہیں۔

دیرشام ہم لوگ برادرم سلیم اختر ندیم کی دعوت پران کے ہاں حاضر ہوئے جہاں اُن کی اہلیہ نے چائے اور پکوڑوں سے ہماری خاطر داری کی۔اُن کی بیٹی حمیرہ جواکثر ٹیلی فون پر مجھ سے باتیں کیا کرتی تھی اورمیری بھرپوردعائیں لیا کرتی تھی اُن دنوں ایک شادی کے سلسلے میں کہیں دوسرے شہرگئی ہوئی تھی۔لہٰذا اُس سے ملنے کی حسرت رہی۔بعد میں عزیزہ نے بھی ٹیلی فون پررابطہ کر کے مجھ سے نہ مل سکنے کے لیے اظہارتاسف ومعذرت کیا۔

رات کے کھانے کے لیے ہمیں امان اللہ کاظم صاحب نے اپنے ہاں مدعو کیا ہوا تھا۔لہٰذا ندیم صاحب اوراُن کے اہلِ خانہ سے رخصت لے کر ہم ڈاکٹر گل عباس اعوان کے ہمراہ کاظم صاحب کے دولت خانے پر حاضر ہوئے جہاں ڈِنر کے ساتھ ساتھ ان سے سیر حاصل علمی وادبی گفتگو بھی ہوتی رہی۔امان اللہ صاحب بہت علیم وفاضل اور محقق ادب ہیں۔متعدد کتابیں تصنیف وتالیف کر چکے ہیں۔اپنی دوتین کتابوں کے نسخے بھی اُنھوں نے ہمیں عنایت فرمائے۔

اُسی شام برادرم ڈاکٹر مزمل حسین اور اُن کے کچھ دیگر احباب نے ہمارے اعزاز میں ایک گفتگو،مشاعرہ اور محفل موسیقی کا اہتمام کیا تھا جس میں وہ اس ناچیز کی دستار بندی بھی کرنا چاہتے تھے۔میں نے وہاں حاضر ہونے کے لیے اُن سے وعدہ بھی کررکھا تھا لیکن بوجوہ ہم لوگ اس میں شامل نہ ہوسکے جس کا مجھے انتہائی ملال رہا اور ڈاکٹر مزمل حسین کو بجا طور پر مجھ سے شکایت بھی رہی۔بہرحال اپنی مجبوریوں کے تحت ہم نے ان سے معذرت بھی کر لی تھی حالاں کہ ڈاکٹر صاحب اس وجہ سے دوتین دن بہت دل گرفتہ رہے۔

۲۷۔اکتوبر ۲۰۱۰ء:

(یعنی اگلی صبح) ہم لوگ منّور بلوچ صاحب کے ساتھ اُن کی کار میں میری زیارت گاہ یعنی کروڑ لعل عیسن کے لیے روانہ ہوئے۔یہی وہ سرزمین ہے جہاں آج سے ۷۵ سال قبل میں نے جنم لیا تھا اور پھر ۱۹۴۷ء میں مجبوراً اسے خیر باد کہہ کر بھارت آنا پڑا تھا۔ملک کے بٹوارے کے وقت کے خونیں مناظر آج بھی جب کبھی یاد آجاتے ہیں تو رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں اوردل رو اُٹھتا ہے۔بہرکیف آج ۶۳ سالوں کے بعد اپنی جائے ولادت کا دیدار کرنے اور یہاں کی مقدس خاک کو اپنے ماتھے سے لگانے کی دیرینہ حسرت پوری ہونے جارہی تھی اس کے خوش گوار احساس سے قلب وروح سرشار ہوئے جارہے تھے۔لیّہ سے کروڑ کوئی پچیس تیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔وہاں جانے کے لیے دوراستے ہیں اور میری درخواست پر منّور بلوچ صاحب ہمیں اُس راستے سے لے کر گئے جس پر سری گاڑھولال جی کا مندر اور حضرت راجن شاہ بخاری کا مزار ہے۔یہ دونوں زیارت گاہیں ایک دوسرے کے بہت قریب واقع ہیں۔

سری گاڑھولال جی کا مندر سولھویں صدی کی پہلی دہائی میں تعمیر کیا گیا تھا بعض روایات کے مطابق اٹھارویں صدی میں اس کی تعمیر کا کام مکمل ہوا تھا اور برہمن زادہ گاڑھولال جی نے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا تھا۔ان کے بعدان کی اولاد بھی اسی نام سے جانی جاتی ہے۔پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد یہ مندر محکمہ اوقاف کی نگرانی میں آ گیا اور یہ جگہ فدا حسین نامی ایک شخص نے پٹے پر لے لی تھی۔مندر کی عمارت اورچار دیواری اس وقت قدرے خستہ حالت میں ہیں حالاں کہ مندر کے دروازے کے اوپر اُن کے نام کا پتھر ابھی تک صحیح و سلامت ہے۔مندر کے اندر تعمیر کے دیگر نقوش کے علاوہ ہندوؤں کے مقدس دیوی دیوتاؤں کی کچھ مورتیاں بھی ابھی تک موجود ہیں۔گاڑھولال جی کی گدّی کو ان کے پیروکاروں نے بھارت میں آنے کے بعد پانی پت (ہریانہ) میں قائم کیا تھا جو اس وقت مکان نمبر ۳۲، تحصیل کیمپ، نزد فتح پوری چوک وٹھن حلوائی، پانی پت میں واقع ہے۔

مہنت وید پرکاش گوسائیں موجودہ گدّی نشین ہیں جو دھرم سیوا میں لگے رہتے ہیں۔(ان کا ایک مندر اولڈ فرید آباد میں بھی ہے) ہم لوگ ابھی اُس مندر کو باہر ہی سے دیکھ رہے تھے کہ منّور بلوچ صاحب مندر کے اندر جا کر آلتی پالتی مار کر دھیان میں بیٹھ گئے ہم اندر داخل ہوئے تو اُنھیں اس عالم میں دیکھ کر نہایت خوش گوار حیرت ہوئی۔بعد میں اُنھوں نے ہمیں بتایا کہ وہ ہر ماہ کم از کم دوبار یہاں ضرور حاضر ہوتے ہیں اور اُنھیں یہاں بیٹھ کر دلی سکون حاصل ہوتا ہے سری گاڑھولال جی صاحبِ کرامات بھی تھے۔

یہاں پر سجدہ گزاری کے بعد ہم آگے بڑھے تو تھوڑے ہی فاصلے پر عظمتوں کے امین حضرت علی راجن شاہ بخاری المعروف ''سدا بھاگ'' کے مزار پر حاضر ہوئے۔موصوف سید جلال الدین اُچوّی بخاری کی اولاد میں سے تھے۔ اس درگاہ کی عمارت رنگین اور بہت شاندار ہے۔حضرت راجن شاہ کی ولادت ۹۵۰ ہجری میں اُچ شریف میں ہوئی تھی اور اُن کے والد محترم کا نام سید حامد کبیر ثانی تھا۔ان کے آباواجداد اُچ شریف سے ہجرت کر کے یہاں کوٹ کروڑ (کروڑ لعل عیسن) کے پاس آ بسے تھے۔حضرت راجن شاہ نے اپنا یہ مزار اپنی حیات ہی میں بنوالیا تھا۔یہاں اُن کے عقیدت مندوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔کہتے ہیں کہ محرم کے موقع پر تو زائرین کو یہاں کھڑے ہونے کی جگہ بھی نہیں ملتی۔حضرت راجن شاہ ۱۰۰۰ ہجری میں واصل بحق ہوئے تھے۔اُس دور کے مغل بادشاہ ہمایوں بھی حضرت کے علم وعرفان کے معتقد تھے۔

مزار پر سجدہ ادا کر کے ہم پھر کروڑ لعل عیسن کی طرف عازم سفر ہوئے اور قریب آدھ گھنٹے بعد اس مقدس سرزمین پر پہنچ گئے جسے دیکھنے اور بوسہ دینے کے لیے آنکھیں برسوں سے ترس رہی تھیں۔

ڈاکٹر گل عباس کی رفیقۂ حیات کا تعلق بھی کروڑ سے ہے اور اسی لیے وہاں اُن کے کئی احباب وشناسا موجود ہیں۔ڈاکٹر عباس وہاں اپنے ایک

کرم فرما جناب عیسےٰ خان زرگر (سابق کونسلر) کو پہلے ہی سے ہماری وہاں آمد کی اطلاع دے چکے تھے۔ کروڑ کے ہمارے آبائی مکان میں عیسےٰ خاں صاحب ہی سب سے پہلے قیام پذیر ہوئے تھے۔ کچھ سال بعد وہاں مکان کے ایک حصے میں آگ لگ گئی تھی اور انھوں نے یہ مکان کسی اور شخص کو بیچ دیا تھا۔ عیسےٰ خان صاحب نے پہلے چائے ناشتے سے ہماری تواضع کی اور بعد دوپہر کا کھانا بھی کھلایا جس سے قبل وہیں ان کے دیرِ دولت پر ایک مختصر سی شعری نشست بھی منعقد ہوگئی تھی۔

بعدازاں وہ مجھ سے پوچھنے لگے کہ کیا آپ کو یہاں اپنے مکان کا حدود اربعہ وغیرہ بھی کچھ یاد ہے؟ میں نے مسکرا کر جواب دیا کہ یہ سب کچھ ابھی تک میرے دل و دماغ پر نقش ہے اور میں بغیر کسی کی مدد لیے خود ہی اسے ڈھونڈ کر آپ کو دکھاؤں گا۔ پھر میں نے انھیں بتایا کہ یہاں صدر روڈ پر ایک اسپتال تھا اور اس سے متصل صدر تھانہ تھا۔ پھر وہاں سے تھوڑا اِدھر ایک سرکاری اسکول تھا جس کے سامنے والی گلی میں بائیں طرف آخر سے دو گھر چھوڑ کر ہمارا سہ منزلہ مکان تھا۔ وہاں موجود سبھی لوگ یہ سن کر بہت حیران بھی ہوئے اور خوش بھی۔ پھر وہ کہنے لگے کہ ''وہ گلی تو یہاں سے بالکل قریب ہے ہم آپ کو وہاں لے جائیں تو آپ اپنا گھر ڈھونڈ لیں گے کیا؟'' میں نے پورے اعتماد کے ساتھ ''ہاں'' میں جواب دیا تو وہ سب ہمارے ساتھ چل کر مجھے اُس گلی میں لے گئے اور میں سیدھا اپنے مکان کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ دل کی دھڑکن تیز ہوگئی آنکھوں میں بے اختیار خوشی کے آنسو اُمڈ آئے اور عقیدت کے ساتھ سر جھک گیا۔ آج بھی ہمارے گھر کے صدر دروازے کے اوپر وہ پتھر موجود ہے جسے میرے والد (مرحوم) نے ۱۹۳۴ء میں مکان کی تعمیر کے وقت لگوایا تھا اور جس پر میری بڑی ہمشیرہ کے نام پر وہاں اُردو اور ہندی میں ''پریم نواس'' لکھا ہوا ہے۔ دروازے پر تالا لگا ہوا تھا کیوں کہ نئے مالک مکان کہیں پاس کے قصبے میں رہتے ہیں۔ بہرحال عیسےٰ خاں صاحب نے اُن سے چابی منگوا کر اپنے پاس محفوظ کر لی تھی۔ وہ تالا کھولنے لگے تو میں نے اُنھیں روکتے ہوئے بتایا کہ مجھے اس گھر کے اندر کا سارا نقشہ بھی پوری طرح یاد ہے کہ اندر داخل ہوتے ہی بائیں طرف غسل خانہ تھا جہاں ایک ''ہینڈ پمپ'' (Hand Pump) بھی لگا ہوا تھا اور دائیں طرف ہماری بیٹھک (ڈرائنگ روم) تھی۔ اندر صحن تھا جس کے ایک طرف کچن اور سٹور تھے اور اس کے پیچھے ایک بڑا ہال تھا جس کے عقب میں دو کمرے۔ صحن میں بائیں طرف غسل خانے کے پیچھے اُوپر جانے کے لیے ایک زینہ تھا جہاں اُوپر کی پہلی منزل پر ہماری ماڑی (بالائی کمرہ) تھی اور پھر باہر کافی کشادہ چھت تھی جس کے دائیں طرف ایک اور سیڑھی تھی جو تیسری منزل تک جاتی تھی جہاں صرف ایک ''پڑچھتی'' بنی ہوئی تھی اور باہر کی طرف کی دیوار پر چینی کے بنے ہوئے کالے رنگ کے کچھ گملے لگے ہوئے تھے۔ عیسےٰ خاں صاحب اور اُن کے ساتھ آئے حضرات کو مزید خوش گوار حیرت ہوئی اور پھر جب انھوں نے گھر کا تالا کھولا اور ہم لوگ اندر داخل ہوئے تو بالکل وہی نقشہ تھا گو لگ بھگ تمام چھتیں گرائی جا چکی تھیں کہ مکان کے نئے مالک اب اس کا تجدّد کروانے جا رہے ہیں۔ نم آنکھوں سے میں نے ایک لفافے میں اپنے آبائی مکان کی مٹی محفوظ کر لی جسے یہاں آنے کے بعد میں نے اپنے پوجا گھر میں سجا دیا ہے۔

بادل ناخواستہ وہاں سے باہر نکلے تو کئی اور حضرات وہاں موجود تھے جن میں خاص طور پر ڈاکٹر اشولال فقیر کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ اشولال جی کی ولادت بھی یہیں کروڑ ہی میں ہوئی تھی۔ ان کا اصل نام محمد اشرف ہے۔ ان کی والدہ محترمہ بخت بی بی بچپن میں پیار سے انھیں ''میرا لال اشو'' کہہ کر بلاتی تھیں اور بعد میں یہی نام ان کی مستقل پہچان بن گیا۔ اشولال ایک نہایت ذہین اور فعّال طالب علم تھا۔ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کرنے کے بعد یہ سرکاری ملازمت میں آگئے اور تحصیل کروڑ میں بطور ڈپٹی ڈسٹرکٹ آفیسر (ہیلتھ) تعینات ہوگئے۔ سرائیکی زبان میں ان کی بہت سی لوڑھیاں، کافیاں اور لوک گیت زبان زدِ عام ہیں۔ ملاقات کے دوران انھوں نے خاکسار کو اپنے دو سرائیکی شعری مجموعے بھی عطا فرمائے۔ دریائے سندھ سے انہیں خاص لگاؤ ہے اور اس کا ذکر یہ اپنے اشعار میں جا بجا بہت پیار اور عقیدت کے ساتھ کرتے ہیں۔

اپنے آبائی مکان کو ایک بار پھر الوداع کہتے ہوئے میں نے ان تمام حاضرین کو بتایا کہ یہاں ہمارے گھر کے سامنے ہی ماسٹر بھوجہ رام حیرت رہائش پذیر تھے جو پنجابی اور سرائیکی کی ملی جلی زبان میں بہت عمدہ شعر کہتے تھے۔ اور یہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک کنواں تھا جسے ''حونصلا کھُو'' کہتے تھے۔ (سرائیکی میں حوصلہ کو حونصلا اور کنویں کو پنجابی میں کھُو کہتے ہیں) اس کنویں کے پاس ہی ایک مندر بھی تھا اور اُس گلی کا نام بھی ''حونصلا گلی'' تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ اُس کنویں کا نام ''حونصلا کھُو'' اور اُس گلی کا نام ''حونصلا گلی'' کب اور کیوں رکھا گیا تھا۔ گو اُن تمام احباب کے لیے یہ نام نئے تھے لیکن وہ مجھے اُس گلی میں لے گئے اور وہ کنواں اور اُس مندر کی عمارت بھی دکھائی۔ وہیں سے تھوڑے فاصلے پر بازار تھا وہاں پہنچے تو میں نے اُنہیں بتایا کہ یہاں سامنے ہی ایک سوڈا واٹر کی دکان تھی جس کے برابر میں مُرلا نام کا ایک حلوائی تھا جو ہر شام پکوڑے بناتا تھا۔ وہ لوگ میری یادداشتوں پر ایک بار پھر حیران ہوئے حالاں کہ ان باتوں کی تصدیق کرنے والا وہاں کوئی نہیں تھا۔

ازاں بعد ہم نے ڈاکٹر اشولال عیسےٰ خاں صاحب و دیگر حضرات کے تئیں اظہارِ تشکر کرتے ہوئے اُن سے اجازت لی اور وہاں سے سیدھے حضرت مخدوم شیخ لعل عیسن کے مزار مبارک پر حاضری دینے کے لیے پہنچے جو اسپتال اور صدر تھانہ سے تھوڑا ہی آگے دائیں طرف واقع ہے۔ اس مزار کی عمارت اور اس متبرک نام کا نقش بھی میرے ذہن و دل میں آج تک موجود و محفوظ ہے اور مجھے یہ بھی یاد ہے کہ یہاں ہر سال (بھادوں کی چودہ تاریخ کو) چودھویں کا میلہ لگتا تھا جس میں دُور دُور سے لوگ شرکت کے لیے آتے ہیں۔

جناب ناصر ملک کی سرائیکی کتاب ''لیّہ دی تاریخ''، اور جناب مہر نور تھند کی اُردو کتاب ''اولیائے لیّہ'' کے مطابق حضرت لعل عیسن کا اصل نام شیخ محمد یوسف تھا اور اُن کے والد بزرگ وار حضرت مخدوم بہاؤالدین خانی اپنے وقت کے صاحبِ علم مردِ مومن اور صاحب کرامات تھے۔ اپنے والد کی وفات کے بعد آپ نے ملتان سے ہجرت کر کے کروڑ کو اپنا مسکن بنالیا۔ ویسے بھی ان کے آباؤ اجداد کسی زمانے میں اسی سرزمین پر قیام پذیر رہے تھے۔ کہتے ہیں کہ حضرت مخدوم شیخ محمد یوسف کو حضرت شاہ عیسیٰ بلوٹ سے بہت محبت اور عقیدت تھی اور وہ پیار سے آپ کو لعل کہہ کر پکارتے تھے۔ جب حضرت شاہ عیسیٰ بلوٹ نے اس دارِفانی سے کوچ فرمایا تو لوگ آپ کو لعل ہی کہنے لگے جو بعد میں اُن کے مرشد کے نام کے ساتھ جڑ کر ''لعل عیسن'' بن گیا اور آپ کے اسی معروف نام کی وجہ سے ہی کوٹ کروڑ ''کروڑ لعل عیسن'' کے نام سے مشہور ہو گیا۔ ۱۵۴۵ء میں آپ جب کوٹ کروڑ میں تشریف لائے تو دیکھا کہ پورا علاقہ قحط سالی کا شکار ہے اور مخلوق بھوک کے ہاتھوں نڈھال ہے۔ دریائے سندھ میں پانی نہ ہونے کے برابر تھا کیوں کہ دو تین سال سے بارش نہیں ہوئی تھی۔ لوگوں نے جب اُنھیں اپنی بپتا بتائی تو حضرت نے اللہ پاک کی بارگاہ میں دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی۔ دعا قبول ہوئی اور دریائے سندھ پانی سے بھر گیا اور اس میں بہت سی مچھلیاں بھی آ گئیں جو اس وقت خوراک کا بہت بڑا ذریعہ ہوتی تھیں۔ حضرت شیخ لعل عیسن کی دعا کے وسیلے سے لوگوں کے سروں سے مصیبت ٹل گئی اور اُن میں یہ کہاوت مشہور ہو گئی کہ:

لالن آیا کچھی
ہک حصّہ پانی تے ڈُو حصّے مچھی

یعنی حضرت لعل عیسن کچھی میں آئے اور اُن کی برکت سے دریا میں ایک حصہ پانی اور دو حصے مچھلی آ گئی۔ (پنجابی اور سرائیکی میں کچھ بغل کو کہتے ہیں۔ یہاں کچھی سے مُراد ہے دریا یعنی سندھ کے بغل کا علاقہ) اُن کے نام سے اور بھی بہت سی کرامات منسوب ہیں۔

اس مزار مقدس پر اپنا سجدہ نیاز ادا کرنے کے بعد ہم کروڑ کے ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہوئے جہاں سے برسوں پہلے ہم نے بذریعہ ریل اپنی پیاری جنم بھومی سے ہجرت کا سفر اختیار کیا تھا۔ مجھے بچپن ہی سے یاد ہے کہ شہر سے ریلوے اسٹیشن کی طرف جاتے ہوئے سڑک کے دونوں طرف گھگل اور شریں کے بے شمار درخت لگے ہوتے تھے جو آج بھی وہاں موجود تھے گو گھگل کے یہ پیڑ میں نے بھارت میں کہیں نہیں دیکھے۔ اسٹیشن پر پہنچے تو پھر کئی پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے تقسیم وطن سے قبل اس ریلوے اسٹیشن پر شہر کا پورا نام لکھا ہوتا تھا یعنی ''کروڑ لعل عیسن''، لیکن اب اردو اور انگریزی میں صرف کروڑ ہی لکھا تھا۔

شام ہو گئی اور منور بلوچ صاحب بھی ہماری خواہش کے پیش نظر صبح ہی سے اپنی کار میں ہمیں لیے پھر رہے تھے لہٰذا ہم واپس لیّہ جانے کے لیے عزم سفر ہوئے۔ راستے میں کار کسی وجہ سے خراب ہو گئی لیکن دو تین کار اور بائیک سے جانے والے مسافروں کی بھرپور توجہ اور فوری امداد کے طفیل ہم پاس کے ایک قصبے میں پہنچ گئے جہاں سے گاڑی ٹھیک کروا کے قریب نو بجے ہم لیّہ پہنچ گئے۔ رات کا کھانا کھایا جس کے بعد کئی احباب ملنے کے لیے تشریف لے آئے اور دیر رات تک ہم ان کے ساتھ محوِ گفتگو رہے۔ ازاں بعد اپنا سامان باندھنا شروع کیا کیوں کہ اگلے روز ہمیں واپسی کے لیے لیّہ روانہ ہونا تھا اور یہ سفر ہم نے بذریعہ ریل طے کرنے کا فیصلہ کیا کیوں کہ میں اور ہنس جی اپنے بچپن کی کچھ اور حسین یادوں کو تازہ کرنا چاہتے تھے۔ تقسیم وطن سے پہلے اپنی کم سنی کے دور میں گرمی کی چھٹیوں میں ہم کلور کوٹ، ضلع میانوالی (جہاں میرے والد ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے) سے پہلے شہر کروڑ لعل عیسن کو اسی ریل کے ذریعے ہی آتے تھے۔ اُس وقت ریل کے ڈبوں پر NWR یعنی North Wastern لکھا ہوتا تھا اور اب ان پر ''PR'' درج ہے (یعنی پاکستان ریلوے) گو ان ڈبوں کی شکل و شباہت اب بھی ویسی ہی ہے۔ مجھے آج تک کلور کوٹ سے کروڑ تک بیشتر اسٹیشنوں کے نام اور کسی حد تک ان کی ترتیب بھی یاد ہے۔ کلور کوٹ، میبل، شاہ عالم، پنج گرائیں، دریا خان، کوٹلہ جام، بکھر، نوتک بہل، کروڑ، کلور کوٹ کے اسی ہائی اسکول میں میرے والد سے پہلے منشی تلوک چند محروم بھی ہیڈ ماسٹر رہے تھے اور انہوں نے کلور کوٹ کی آندھی کے عنوان سے ایک نظم بھی کہی تھی۔ آج کے بین الاقوامی سطح تک مشہور پچرنگا آچار والوں کی شروعات بھی مرلی دھر رام نارائن کے نام سے ایک چھوٹی سی دکان کی شکل میں اسی شہر کلور کوٹ سے ہوئی تھی۔

۲۸۔ اکتوبر ۲۰۱۰ء:

بہر حال لیّہ کے تمام احباب اور کرم فرماؤں خصوصاً حکیم میاں الٰہی بخش اور اُن کے تمام عزیزان کی ہزار ہا محبتیں اور نوازشات دل میں سمیٹے ہوئے اگلے روز بہ چشم نم ہم اُن سب کو خدا حافظ کہہ کر وہاں سے رخصت ہوئے۔ عزیزان امداد حسین، شمشاد حسین اور ثاقب خاں ہمیں لیّہ ریلوے اسٹیشن پر لے آئے جہاں سے ہم نے کوٹ اَدّو کے لیے روانہ ہونا تھا۔ عزیزی شمشاد حسین ہمارے لیے وہاں سے کوٹ ادّو تک کے ٹکٹ خرید کر لے آئے اور عزیزی امداد حسین تو ضد کر کے ہمارے ساتھ ہی ہو لیے اور ہمیں کوٹ ادّو تک پہونچا کر ہی دوسری ریل سے واپس لیّہ کے لیے روانہ ہوئے۔ ریل کا سفر کافی آرام دہ تھا اور ہماری بچپن کی کئی یادوں کو تازہ کر رہا تھا۔ راستے میں ایک اسٹیشن پر اُردو کے ساتھ ساتھ اس ریلوے اسٹیشن کا نام ہندی میں بھی لکھا ہوا پایا تو حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی۔

کوٹ اَدّو ریلوے اسٹیشن پر عزیزی ارشد نیازی ہمارے منتظر تھے۔ ہمارا سامان ایک موٹر گاڑی میں رکھوا کر وہ ہمیں اپنے ایک عزیز دوست

کے دفتر میں لے گئے وہاں XEN تھے (مجھے اب ان کا اسم گرامی یاد نہیں آ رہا)۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ہمیں اُن کے گھر لے گئے جہاں ہم نے کھانا کھایا اور پھر وہیں ایک مخصوص ادبی نشست کا انعقاد ہو گیا جس میں ہنس جی اور میں نے اپنا اردو و سرائیکی کلام پیش کیا۔ اور پھر ارشد نیازی صاحب نے پہلے بانسری پر اپنے فن کا جادو جگایا اور بعد میں نہایت پرسوز ترنم میں اپنا کلام بھی پیش کیا۔ ارشد صاحب کا قیام تو دائرہ دین پناہ میں ہے لیکن وہ کوٹ اَدّو کے ایک اسکول میں موسیقی کے استاد ہیں۔ بہت پیارے انسان ہیں اور عظیم فنکار بھی۔ اسی مجلس میں ایک نوجوان گلوکار عزیزی قیصر خاں نے بھی اپنی نہایت سریلی آواز میں کچھ سرائیکی غزلوں اور گیتوں سے اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور ہم تینوں کو اپنے مدھر گیتوں کی ایک ایک سی ڈی کیسٹ بھی پیش کی۔

اسی دوران دائرہ دین پناہ سے جناب ذوالفقار علی خاں مخدوم بھی تشریف لے آئے جو ہمیں اپنی کار سے ہماری اگلی منزل تک لے جانے والے تھے۔ لہٰذا مخدوم صاحب کے ہمراہ ہم شام کو مظفر گڑھ پہنچ گئے جہاں رات کا قیام و طعام ہنس جی کے ایک پرانے دوست راؤ کامران یقین صاحب کے ہاں تھا۔ یقین صاحب اور ان کے بیٹوں کی وہاں مظفر گڑھ کی فیصل مارکیٹ میں جبران گارمنٹس کے نام سے کئی دکانیں ہیں۔ مخدوم ہمیں خدا حافظ کہہ کر رات کو ملتان چلے گئے۔

۲۹۔ اکتوبر ۲۰۱۰ء:

ملتان میں مخدوم صاحب ہمیں سیدھا سرائیکی روزنامہ ''جھوک'' کے دفتر میں لے گئے جہاں اخبار ہذا کے مالک و مدیرِ اعلیٰ جناب ظہور احمد دھریجہ اپنے تیس چالیس باذوق رفقاء کے ساتھ ہماری راہ دیکھ رہے تھے۔ چائے پانی کے بعد وہاں ایک خوبصورت محفل کا اہتمام کیا گیا۔ جہاں ہمارے علاوہ وہاں کے چند مقامی شعراء نے بھی حاضرین کو محظوظ کیا۔ جلسے کے دوران تھوڑی دیر کے لیے یہ ناچیز وہاں سے اُٹھ کر دھریجہ صاحب کے دفتر میں جا بیٹھا۔ میرے پیچھے پیچھے ہی ایک صاحب وہاں میرے پاس آ کر بیٹھ گئے اور مجھ سے بات چیت کرنے لگے۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ اُن کا اسم گرامی چوہدری غلام سرور ارائیں ہے۔ تقسیم ملک سے قبل ان کے والد چوہدری عبدالغفور ضلع انبالہ کے ایک گاؤں اُودھیور کے نمبر دار ہے۔ اور اب وہ لوگ ملتان کے ایک قریبی قصبہ رنگیل پور میں رہتے ہیں۔

اپنے بچپن کی یادوں کی بنا پر میرے ذہن میں محفوظ تھا کہ ملتان کا سوہن حلوہ بہت مشہور ہوا کرتا تھا۔ میں نے غلام سرور صاحب سے یونہی سرسری پوچھا یہاں پاس میں اس مٹھائی کی کوئی اچھی دکان ہے؟ اسی اثنا میں میرے پاس کوئی اور صاحب آ کر بیٹھ گئے اور چوہدری غلام سرور کہیں غائب ہو گئے۔ قریب پندرہ بیس منٹ بعد وہ پھر تشریف لائے تو اُن کے ہاتھ میں سوہن حلوہ کے دو تین ڈبے تھے جو اُنھوں نے از راہِ محبت مجھے پیش کیے۔ میں نے انھیں ان کی قیمت دینا چاہی لیکن وہ راضی نہ ہوئے اور کہنے لگے کہ میری طرف سے آپ کے لیے حقیر تحفہ ہے۔ مجھے بعد میں خفت بھی ہوئی کہ انہیں میری وجہ سے خواہ مخواہ زیر بار ہونا پڑا لیکن یہ تو پاکستانی عوام کی بے پناہ محبت اور خلوص بیکراں ہی کی زنجیر گل کی ایک اور کڑی تھی جس میں ہم پچھلے ہفتہ بھر سے جکڑے ہوئے سرتاپا ممنون و مسحور تھے۔

تقریب کے بعد ہم نے دھریجہ صاحب کے ہاں رات کا کھانا کھایا اور پھر وہ ہمیں اپنے دولت کدے پر لے گئے جو ''جھوک'' کے دفتر سے ملحق ہے۔ وہاں انھوں نے ہمیں اپنی اہلیہ محترمہ اور اپنے عزیزان سے ملوایا۔ اُن کی ایک دختر نیک اختر عزیزہ عاصمہ ظہور جو میڈیا سے وابستہ ہیں نے ہمیں اپنی تصنیف کردہ کتاب بھی پیش کی ''سرائیکی، اردو، انگریزی بول چال''۔ بعد ازاں دھریجہ صاحب ہمیں جھوک کے دفتر کے باہر ہی واقع اپنے کتب خانے میں لے گئے جہاں ''جھوک'' کے اپنے اشاعتی ادارے کی بہت سی کتب کے علاوہ کئی اور بھی بیش قیمت کتابیں موجود تھیں۔ دھریجہ صاحب نے اپنی شائع کردہ تین چار کتابیں بھی ہمیں عطا فرمائیں جن میں سے ایک گراں قدر نسخہ ''دیوانِ فرید'' کا تھا اور دوسرے معروف سرائیکی شاعر شاکر شجاع آبادی کا شعری مجموعہ ''کلام شاکر'' تھا۔ شاکر صاحب گو جسمانی طور پر کسی حد تک معذور ہیں لیکن سرائیکی خطے میں اپنی سرائیکی شاعری کے لیے بے حد ممتاز و مقبول ہیں۔

رات کو گیارہ بجے کی بس سے لاہور کے لیے ہماری ریزرویشن ہو چکی تھی لہٰذا ساڑھے دس بجے کے قریب دھریجہ صاحب نے ہمیں اُسی Daewoo Express بس اڈے پر جانے کے لیے ہمارا انتظام فرمایا۔ ہم نے ملتان کے ان بے حد شفیق اور بے پنا محبت سے نوازنے والے احباب کو الوداع کہی اور بروقت وہاں پہنچ کر بس میں سوار ہو گئے۔ بس کا یہ واپسی سفر بھی نہایت آرام دہ تھا گو رات کی مسافت ہونے کی وجہ سے ہمیں زیادہ دیر تک سونے کی مہلت نہ مل سکی۔

۳۰۔ اکتوبر ۲۰۱۰ء:

بہرحال اگلی صبح پونے پانچ بجے کے قریب ہم واپس لاہور پہنچ گئے۔ تھوڑی دیر بعد عزیزی شعیب بلوچ ہمیں لینے آ گئے۔ راستے میں ہم سب نے ایک ریسٹورنٹ میں ناشتہ کیا اور پھر اُسی گیسٹ ہاؤس میں آ کر مقیم ہو گئے جہاں ۲۲۔ اکتوبر کو پاکستان میں اپنی آمد پر ہم نے شب بسر کی تھی۔

کچھ دیر آرام کیا پھر نہا دھو کر تیار ہوئے تو ہنس جی کو اُن کے ایک دوست لینے آ گئے لہٰذا وہ تو اُن کے ساتھ چلے گئے۔ جین صاحب اور میں نے وہاں سے آٹو کیا اور سیدھا پرانی انار کلی کی بھگوان سٹریٹ میں آ گئے جہاں ماہ نامہ ''تخلیق'' کا دفتر ہے۔ ''تخلیق'' کے مدیر و مالک جناب اظہر جاوید سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے روزنامہ ''نوائے وقت'' اور ''جنگ'' کے دفاتر میں فون کیے اور ہماری آمد کی اطلاع دی۔ چند منٹوں میں جناب خالد بہزاد ہاشمی تشریف لائے۔ خالد بہزاد صاحب ''نوائے وقت'' کے سینئر نائب مدیر ہیں اور کالم نویس

بھی۔انھوں نے ہمارا انٹرویولیا وار اُن کے ہمراہ آئے ہوئے فوٹو گرافر نے ہماری کچھ تصاویر بھی لیں۔ کچھ عرصہ پہلے خالد بہزاد صاحب نے دلّی میں مقیم میرے ایک فاضل دوست اور معروف ادیب جناب وسیم احمد سعید کی ایک نادر اور گراں قدر تاریخی کتاب ''کالا پانی'' پر ڈاکٹر انور سدید صاحب کا ایک لاجواب تبصرہ بھی شائع فرمایا تھا لہٰذا اس کے بارے میں بھی اُن سے گفتگو رہی۔ اس دوران میں اظہر جاوید صاحب نے ہمارے لیے کھانا بھی منگوالیا تھا۔لنچ کے بعد ابھی خالد صاحب سے ہماری بات چیت چل رہی تھی کہ جین صاحب کو پاکستان کرکٹ ٹیم کے سابق کیپٹن اور ''تحریک انصاف'' تنظیم کے بانی اور صدر عمران خان کے پی اے کا ٹیلی فون آ گیا جو جین صاحب کے شناسا تھے۔ لہٰذا اظہر صاحب اور بہزاد صاحب سے بعد میں آنے کا وعدہ کر کے ہم وہاں سے عمران خاں صاحب کے دولت کدے پر جانے کے لیے اُٹھے تو اظہر جاوید صاحب بھی ہمارے ساتھ باہر سڑک تک آ گئے اور اُنھوں نے نہ صرف ہمارے لیے آٹو کا انتظام کیا بلکہ ہمارے منع کرنے کے باوجود آٹو والے کو اپنی جیب سے پیشگی کرایہ بھی دے دیا۔عمران خاں صاحب سے ملاقات کے دوران جب میں نے انھیں بتایا کہ میرا تعلق ضلع لیّہ سے ہے اور میں اپنے علاقے اور اپنے آبائی قصبے کی زیارت کر کے آ رہا ہوں تو وہ کہنے لگے کہ ''آپ نے مجھے پہلے بتایا ہوتا تو میں خود آپ کو ساتھ لے کر اپنے علاقے میانوالی تک کی سیر کراتا'' میں نے کہا کہ میں نے تو سنا ہے آپ کا تعلق جالندھر سے ہے تو انھوں نے بتایا کہ اُن کی والدہ تو جالندھر کی پٹھانی تھیں لیکن اُن کے والد میانوالی کے ہیں۔

بہرحال گھنٹہ بھر اُن کے پاس گزار کر ہم لوگ شام کو واپس اظہر جاوید صاحب کے دفتر میں آ گئے تھوڑی دیر میں خالد بہزاد صاحب دوبارہ وہاں تشریف لے آئے اور اُن کے ساتھ مزید گفتگو کا دور چلتا رہا۔ بعد ازاں ہم نے اظہر صاحب سے اجازت چاہی تو اُنھوں نے مجھے ''تخلیق'' کے دو تازہ شمارے اور دو تین کتابیں بھی عنایت فرمائیں۔

وہاں سے رخصت ہو کر جین صاحب اور میں کچھ دیر انارکلی بازار میں گھومتے رہے اور پھر آٹو لے کر واپس گیسٹ ہاؤس آ گئے۔ ہنس جی بھی ہم سے پہلے وہاں پہنچ چکے تھے۔تھوڑی دیر بعد عزیزی شعیب بلوچ بھی اپنے ایک رفیق جناب عرفان الحق کے ساتھ تشریف لائے اور کچھ دیر تک ان کے ساتھ بات چیت رہی۔ ڈنر کے بعد ہم سو گئے۔

ہمارے سفر پاکستان کے دوران لگ بھگ ہر روز مجھے گلزار جاوید صاحب مدیر ماہ نامہ ''چہارسو'' (راولپنڈی) کا ٹیلی فون آتا رہا تھا۔گلزار صاحب میرے دیرینہ کرم فرما ہیں اور جو لوگ اُن سے متعارف ہیں وہ اُن کی بھرپور محبتوں کے معترف و مداح ہیں۔ اُس روز بھی یعنی ۳۰۔ اکتوبر ۲۰۱۰ء کی شام اُن کا فون آیا تھا جس میں انھوں نے اطلاع دی تھی کہ وہ اگلے روز یعنی ۳۱۔ اکتوبر کو خاکسار سے ملنے کے لیے لاہور تشریف لا رہے ہیں۔ راولپنڈی سے لاہور تک کا سڑک کے ذریعہ ایک طرف کا سفر لگ بھگ چار سو کلومیٹر ہے۔ میں نے اس فاصلے کے پیش نظر اُن سے گزارش بھی کی کہ وہ اس قدر زحمت نہ اٹھائیں مگر گلزار جاوید تو گلزار جاوید ہیں۔ انھوں نے میری درخواست کی پروا نہ کی اور ساتھ میں یہ بھی کہہ دیا کہ ہم کل دوپہر کا کھانا ایک ساتھ کھائیں گے۔قریب آدھ گھنٹہ کے بعد اُن کا پھر فون آیا کہ کھانا ایک ساتھ کھانے کا مطلب یہ ہے کہ ہم سب کا لنچ اُن کی طرف سے ہوگا۔ یااللہ! اس بے پناہ محبت کا جواب کوئی کہاں سے لاسکتا ہے!

۳۱۔ اکتوبر ۲۰۱۰ء:

(اگلے روز) قریب پونے بارہ بجے گلزار جاوید صاحب اپنے دو فرزندان ارجمند عزیزی افتخار جاوید (فاری شا) اور عزیزی عمّار جاوید کے ہمراہ ہمارے پاس گیسٹ ہاؤس میں پہنچ گئے۔ اُن سے بغل گیر ہوئے تو ایک دیرینہ حسرت پوری ہوئی حالاں کہ مجھے اب بھی ایک عجیب سی وحشت اور ندامت کا احساس ہو رہا تھا کہ مجھ حقیر انسان کی خاطر انہیں ایک ہی دن میں اتنی لمبی مسافت (سات سو کلومیٹر سے بھی زائد) طے کرنا پڑ رہی ہے لیکن دل میں بے پناہ مسرّت کا احساس بھی ہو رہا تھا۔

کچھ دیر وہاں باتیں ہوئیں۔گلزار صاحب میرے لیے کئی نادر اور بیش قیمت کتابیں بھی ساتھ لائے تھے جو انھوں نے مجھے عطا فرمائیں۔ پھر ہم سب اُن کی کار کے ذریعے قریب کے ہوٹل میں گئے جہاں ہم نے دوپہر کا کھانا کھایا۔ ازاں بعد عزیزی عمّار کہیں پڑوس سے ہم سب کے لیے کھیر لے آئے جو مٹی کے کاسوں میں بند تھی۔ کھیر کا لطف اُٹھایا تو گلزار صاحب اور عزیزان ہمیں کئی جگہوں کی سیر کراتے ہوئے مینار پاکستان تک لے آئے۔ وقت کافی ہو چکا تھا اور ابھی انھوں نے واپسی کا طویل سفر بھی طے کرنا تھا لہٰذا ایک بار پھر ہم نے ان سب سے گلے مل کر اُنہیں رخصت کیا اور مینار پاکستان کے کھلے کمپاؤنڈ میں چلے گئے۔ کچھ تصویریں لیں اور پھر سڑک کے اُس پار شاہی مسجد دیکھنے کے لیے آ گئے۔

شاہی مسجد کے گیٹ سے تھوڑا پہلے مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سمادھی ہے جس کے کشادہ احاطے میں ایک چھوٹا سا گررودوارہ بھی ہے۔ لہٰذا ہم پہلے وہاں حاضر ہوئے اور کچھ مزید تصاویر لیں۔ وہاں ماتھا ٹیکنے کے بعد ہم باہر آئے اور شاہی مسجد کے وسیع احاطے میں داخل ہوئے جو بہت کشادہ بھی ہے اور سبزہ زاروں اور پھولوں سے مزّین بھی۔ اسی احاطے میں مسجد کی سیڑھیوں کے ایک طرف علامہ اقبالؔ کا مزار بھی ہے جس کی زیارت سے ہماری لاہور کی یہ مختصر لیکن نہایت خوشگوار سیاحت اختتام پذیر ہوئی۔ واپسی پر ہم تھوڑا انارکلی بازار میں گھومے اور پھر گیسٹ ہاؤس آ گئے۔ کھانا کھایا اپنا سامان وغیرہ یکجا کیا اور سو گئے۔

یکم نومبر ۲۰۱۰ء:

یعنی اگلی صبح نہا دھو کر ناشتہ کیا اور واپسی کی تیاری میں جُٹ گئے۔ قریب گیارہ بجے عزیزی شعیب بلوچ تشریف لائے۔ وہ ہم تینوں کے لیے کچھ قیمتی تحائف بھی لائے تھے۔ شعیب وہاں پاکستان کے کسٹم ڈیپارٹمنٹ میں

باقی صفحہ ۱۱۶ پر ملاحظہ فرمائیے

''سرمۂ نورِ یقیں''

''بیوٹی پارلر''

پروفیسر خیال آفاقی
(کراچی)

چھپ نہیں سکتا کبھی افلاس کے پردے میں نُور
بے زبان ہوتا نہیں، بے نور چہروں کا سبب
بات یہ ہے، بجھ گئے ہیں ان کے سینوں کے چراغ
ڈھونڈتے پھرتے ہیں جو تاریک راتوں کا سبب
اصل نور حسن ہے چہروں کا مِنۡ اثرِ السُّجود
بیوٹی کہتے ہیں جس کو ہے وہ کوئی اور چیز
گر نہیں چشم دروں میں سرمۂ نور یقیں،
کر نہیں سکتی نظر پھر حُسنِ صورت میں تمیز
سرخی رُوپوش ہو، غازہ ہو نادیدہ مگر
چہرگی رکھتی ہے خود اپنی نظر کا اعتبار،
دل ہے وہ زینت گہۂ آرائش محفل خیالؔ
روح سجتی ہے جہاں، کرتی ہے خود اپنا سنگھار

○

Brontosaurus

برانٹوسورس

شاہین
(کینیڈا)

برانٹوسورس کی دُم پر
ضرب تو کاری پڑی ہے
لیکن اُس کا جسم ہے شہ زوراب تک
چُور ہے اپنے نشے میں
اُس کا اک اک پور اب تک
لیکن اُس کی ہڈیوں میں
زہرسی اک شے اترتی جارہی ہے
نبض اُس کی
دھیرے دھیرے
اُس کے رہزن خون کو
بدرنگ کرتی جارہی ہے
کوئی دَم بس اور
اُس کی آنکھ میں وحشت نہ ہوگی
پاؤں میں طاقت نہ ہوگی
بھاگنے کی بھی اُسے مہلت نہ ہوگی

○

خاموش رہے

عرشی ملک

(اسلام آباد)

ہر سُو تھا انجانا ڈر خاموش رہے
شہر کے سارے دانش ور خاموش رہے

اپنی اپنی غرض و انا کے قیدی تھے
اس کارن سب اہلِ نظر خاموش رہے

سچ کہنا تو زہر پیالہ پینا تھا
سارے کر کے اگر مگر خاموش رہے

قوم پھنسی تھی ظلم و جہل کی دلدل میں
دڑ وٹ کر لیکن رہبر خاموش رہے

ظلم کے ساتھی گلیوں گلیوں دھاڑے ہیں
عدل کے سب ہمدرد مگر خاموش رہے

اپنے حق میں کوئی نہ آواز اُٹھی
ہمسائے اور بام و در خاموش رہے

حق کی خاطر کچھ نہ بولے گونگے لوگ
بہرے بھی کہلائے پر خاموش رہے

اپنے گھر کا صحن اٹا تھا لاشوں سے
پر قانون کے بازی گر خاموش رہے

ہم نے اپنی آہ دبا لی سینوں میں
جب حاکم اور چارہ گر خاموش رہے

جھوٹ اور سچ کا فرق بتائے کون یہاں
موند کے دیدے، دیدہ ور خاموش رہے

دیکھ کے لچھن دین کے ٹھیکیداروں کے
بے دیں، دروازے ڈھو کر خاموش رہے

لاکھوں اپنے دیس میں ہی پردیسی ہیں
باقی ہو کر ملک بدر خاموش رہے

خود تاریخ لکھے گا وقت مورّخ ہے
کیا غم ہے جو زید و بکر خاموش رہے

یاں مرگِ انبوہ بھی کھیل تماشا ہے
حکم ہوا ہے نوحہ گر خاموش رہے

قدموں کا ہر نقش گواہی دیتا ہے
گرچہ سُونی راہ گذر خاموش رہے

ہے آواز خلق خُدا کا نقارہ
ناداں اس کو بھی سُن کر خاموش رہے

رب کی لاٹھی بھاری ہے پر بے آواز
پل میں توڑے لاکھوں سر خاموش رہے

اپنا رب رحمان ہے کیسے ممکن ہے؟
دیکھ کے یہ اندھیر نگر خاموش رہے

دنیا میں سقراط بھی تھے منصور بھی تھے
سچ سے سب کو آج حذر خاموش رہے

کون ہے ابراہیم جو کودے شعلوں میں
اپنے عہد میں سب آزر خاموش رہے

بے مہری کی برف جمی تھی جذبوں پر
کیا کیا نہ دیکھے منظر خاموش رہے

چوک میں ماں نے چاروں بچے بیچ دیئے
پڑھ کر قاری یہ بھی خبر خاموش رہے

کون لکھے گا نوحہ گُھپ اندھیرے کا
گر اس دور کے نغمہ گر خاموش رہے

ہم نے جبر کے موسم میں بھی شعر کہے
عرشی جب سارے شاعر خاموش رہے

○

خلا ہر لمحہ بڑھتا جارہا ہے

پرتپال سنگھ بیتاب
(جموں کشمیر)

لڑکپن میں اَور نوجوانی میں
مجھے اپنے والِد کی اکثر باتیں
خاص طور سے نصیحتیں
بوسیدہ اَور فرسُودہ معلوم ہوتی تھیں
بباطن بغاوت رہتی تھی
بظاہر اِظہار مگر کم کم تھا
آج مَیں اپنی بیٹی سے
قریب قریب وہی سب کہتا ہوں
جو میرے والِد کبھی مجھ سے کہا کرتے تھے
میری بیٹی بغاوت کو اندر دبائے نہیں رکھتی
بلکہ اُگل دیتی ہے
کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ مجھ میں
میرے باپ کی رُوح داخل ہوچکی ہے
اور میری بیٹی میں میری روح
لیکن پھر یاد آتا ہے
کہ میرے والد کی نصیحتوں میں
گرمی نسبتاً زیادہ تھی
اور میری بیٹی کی بغاوت میں
گرم جوشی نسبتاً زیادہ ہے

ہمارا کیا ہے

کرامت بخاری
(لاہور)

ہمارا کیا ہے،
ہماری عادت سی ہوچکی ہے،
شفق کی بے خواب وادیوں میں بھٹکتے رہنا
گئی بہاروں کو یاد کرنا
فریب خوردہ ساعتوں کے فسوں میں رہنا
افق میں تحلیل ہوتے رنگوں کو رتجگوں میں تلاش کرنا
تمام اجڑے ہوئے دیاروں میں خاک ہوتے ہوئے مزاروں پہ جا نکلنا
اور اپنے گزرے ہوئے دنوں کو حساب کرکے کتاب کے ملول ہونا
ملول کرنا۔
ہمارا کیا ہے،
ہماری عادت سی ہوچکی ہے،
حروف قرطاس سے الجھنا الجھتے رہنا
خیال کی بے پناہ وسعت میں گرد ہوتی ہوئی مسافت کی چاپ سننا
کہیں کہیں پہ قیام کرنا، کلام کرنا
خلا کی نیلی ردا پہ جو کچھ رقم ہوا ہے،
اُسے سمجھنا، سمجھ کے دنیا میں عام کرنا،
اور آنے والی تمام نسلوں کے نام کرنا۔
ہمارا کیا ہے۔

Breaking News

تحیر، خوف، دہشت
بربریت اور انوکھے ظلم کو
مانوس لفظوں کی قبا پہنا کے
جب بھی میڈیا سے نشر کرتے ہیں
بریکنگ نیوز، کہلاتی ہے
اور اِس نیوز میں کوشش یہ کی جاتی ہے
کہ وحشت ذدہ ماحول میں
ویڈیو کوئی ایسی بنا کر پیش کی جائے
کہ جس کو دیکھ کر دل کو یقیں آئے
بہت نایاب اب روشن سویرے ہیں
جہاں میں بس اندھیرے ہی اندھیرے ہیں
کہیں جگنو نہیں ملتے
کہیں پر گُل نہیں کھلتے
بریکنگ نیوز کی اک دوڑ جاری ہے
کہ پہلے کون سا چینل
دلوں میں درد بھرتا ہے
لہو کو سرد کرتا ہے
میں سب سے پوچھتی ہوں
میری دنیا میں کوئی ایسی خبر
جو آنکھ میں آنسو نہ بن پائے
جو دل کو خوف کے رستے نہ لے جائے
کسی انسان کی نیکی
کسی بچّے کی ایسی مسکراہٹ
جو فرشتوں جیسی لگتی ہے
دیارِ عشق کی تسخیر
یا پھر وہ مسرت
جو بہت سے آنسوؤں کے بعد ملتی ہے
تقدس سے بھرا کردار
سچائی، وفا، ایمانداری، صبر، ہمدردی
بریکنگ نیوز، آخر کیوں نہیں بنتی

حمیرا راحت
(کراچی)

شوخیٔ رندانہ

فیصل عظیم
(کینیڈا)

ایک تھا شاعر
غزلیں کہتا، نظمیں لکھتا
جانے کس کس صنف میں وہ شہکار بناتا
لیکن داد نہیں ملتی تھی
کوئی تو سننے والا ہوتا
کوئی تو پڑھنے والا ہوتا
کوئی تو ہوتا
رمز و کنائے جاننے والا
اس کے فن کو ماننے والا
لفظوں کو پہچاننے والا
کوئی تو ہوتا
بات یہی تھی، حدِّ نظر تک کوئی نہیں تھا
پھر بحریں ایجاد ہوئی تھیں
تب اس نے وہ شعر کہے تھے
جن کی دھڑکن اپنے ہی آہنگ میں ڈوبی
خود ہی داد میں ڈھل جاتی تھی
مصرعوں کی اس ''تا تک تھیّا'' کے نشّے میں
شاعر خود بھی جھوم اُٹھتا تھا
اور زمین بدل جاتی تھی

○

آصف رضا

(یو۔ایس۔اے)

دو دنیائیں

طوطے کے گرداں دو دیدے
گھوم گھوم کر دیکھ ہم کو جتلائیں
کہ اک دنیا ہے اُس کی
جو ہے سبزی کی
اور دوسری
ہم انسانوں کی

دو گردش کرتی دنیائیں
جو گرتی جاتی ہیں ہر دم
ہستی سے عدم کی سخت خلاؤں میں پیہم
انساں چکراتا جاتا ہے اور چیختا ہے
وہ اپنے سبز ابد میں اِک ٹہنی پہ بیٹھا ٹھنکتا ہے

بھوت

محسوس ہوتا ہے اُسے
کہ مرگئی ہے اس کے اندر کوئی شے
مرنے سے جس کے
گھٹ رہی روشنی دن کی
بڑھ رہی ہے تیرگی شب کی

وہ آئینوں سے بچ کے چلتا ہے کہیں
ثابت نہ ہو جائے کہ وہ انساں نہیں
اک بھوت ہے
سینے میں جس کو وہ اٹھائے پھر رہا ہے
دل نہیں
تابوت ہے

منظر راز بلندی پر

اختر رضا سلیمی

(اسلام آباد)

میں کھڑا ہوں وادیِ خوش خواب میں
اور میرے چار جانب دور تک پھیلی ہوئی ہے
منظروں کی کہکشاں
اور منظروں پر ثبت ہیں
ان دیکھنے والوں کی نظروں کے نشاں
جو یہاں سے جا چکے ہیں
منظروں کی دوسری جانب
جہاں سے لوٹ کر کوئی کبھی آیا نہیں
وہ جا چکے ہیں
اپنے ہونے کی مکمل داستاں ان منظروں پر ثبت کر کے
میں بھی اک منظر پر اپنا آپ لکھنے آیا ہوں
لیکن کہاں لکھوں
یہاں
سب منظروں پر گرد ہے
گزرے ہوئے لوگوں کی بینائی کی گرد
میں کسی شفاف منظر پر
نظر سے دستخط کر کے ابد آثار ہونا چاہتا ہوں
ایسے اک منظر پہ جو
پہلے کسی بھی آنکھ پر اترا نہ ہو

○

قطعات

تشنہ بریلوی

(کراچی)

منزل

کبھی جو ختم ہو یارو یہ وہ سفر ہی نہیں
کہاں کا قصد ہے رہبر کو خبر ہی نہیں
جو رہگزر ہمیں منزل کی سمت لے جاتی
ہمارے پاؤں تلے اب وہ رہگزر ہی نہیں

نقشِ عبرت

دوستوں یہ تو بتاؤ غور کب فرماؤ گے
کتنے دھوکے اور کھا کر ہوش میں تم آؤ گے
اب ذرا کچھ عزم اور ہمّت دکھاؤ ورنہ تم
نقشِ عبرت ساری دنیا کے لئے بن جاؤ گے

شاعر کی شبِ عروسی

کردوں گا آج رات تجھے خوش مری دُلہن
مجھ میں ہے یہ کمال بھی پہلے غزل تو سُن
مطلع مچل رہا ہے مرے لب پہ جانِ من
ہوجائیگا وصال بھی پہلے غزل تو سُن

چھیڑ چھاڑ

دُلہن ہے پُر شباب تو دولہا تہہِ خضاب
کہتی ہے ناز سے کہ مجھے خوش کرو کبھی
یہ چھیڑ چھاڑ منزلِ مقصود تو نہیں
تم چھیڑ چھاڑ سے بھی آگے بڑھ کبھی

○

گیت

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

(بھاگلپور،بھارت)

چھن چھن......چھن چھن چھن
یہ راتوں کا بوجھ دن کی تھکن
منوا کی پیاس انکھین کی جلن
دل کی لگن میرے دل کی لگن
چھن چھن......چھن چھن چھن
تن کے اجلے من کے کالے
دھن میں سدھ بدھ کھوئے
اوپر اوپر باٹ بتائیں
یہ کیسا ہے پاگل پن
چھن چھن ......چھن چھن چھن

○

سفر جبر

ڈاکٹر علی کمیل قزلباش

(کوئٹہ)

شہر سے کوچ کر گئے جو لوگ
ان کی یادوں کے لفظ۔
حرف ان کے
اب بھی دیوار و در پہ گھر گھر کے
ثبت ہیں یوں
کہ رنگ صد بدلے
دست و بازو بھی تھک چکے ہیں اب
ذہن و دل کی تھکن۔
الگ غم ہے۔
اور جتن سو طرح کے کرتے ہیں
مگر وہ حرف محو ہوتے نہیں
مگر وہ لفظ مٹ نہیں پاتے

دوہے

بھگوان داس اعجاز

(دہلی، بھارت)

باپُو جی تصویر کی
ڈھیلی ہوگئی کیل
جج کو اندھا کر رہا
دھوکے باز وکیل!

پیش کرو اگلا گواہ
دی جج نے آواز
اندھے نے پہچان لی
قاتل کی آواز!

اُلٹا پلٹا ہوگیا
باپو تیرا پاٹھ
گاؤں غلامی کر رہا
شہر مارتا ٹھاٹ!

بیٹھا گاندھی گھاٹ پہ
کرے کبیرا مانگ
تو اپنا لٹھ دے مجھے
میں بھی دھاروں سوانگ!

تھی باپو کی آرزو
وہ دن دوڑے آئیں
لوگ بھری چوپال پہ
اک تھالی میں کھائیں!

دلّی آیا گاؤں سے
پوچھے ایک اہیر
کپڑا بنتے بیچتے
دیکھا کہیں کبیر!

''تتلی''

شگفتہ نازلی

(لاہور)

یارب......!
جتنے رنگ تتلی کے......
اُتنے ہی رنگ پیار اخلاص کے......
گر لوگوں میں ملتے ہوں......
دھنک کے موسم رہتے ہوں......

پھولدار دوپٹے پر......
تتلی یوں آ بیٹھی تھی......
جیسے اوڑھنے والی نے......
پھُول سے بال سنوارے تھے......

ہم انجانے میں کبھی کبھی......
ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں......
جیسے تتلی کے چھونے سے......
رنگ پوروں میں رہ جاتے ہیں......

تیری چُنری پہ نثری نظم لکھی......
تتلی کے سنگ سنگ اُڑتی گئی......
وہ ہوا کتنی شاعرانہ تھی......

○

آج بھی

(نذرِغالب)

طالب زیدی

(میرٹھ، بھارت)

ذہن پر آج بھی افکار کی یورش ہے وہی
وہی احساس وہی تشنہ لبی آج بھی ہے
شہر یاروں کی طرف پھر وہی نظریں پیہم
وہ کم مائیگی احساس کے پردے میں عیاں
پھر وہی بھیس فقیروں کا بنا کر ہم لوگ
کچھ نہیں پائیں مگر اپنا تماشہ دیکھیں
کبھی دنیا ہمیں دیکھے کبھی دنیا دیکھیں
وہی پیراہن کاغذ ہے کہ جس پر تحریر
اپنے ناکردہ گناہ، کردہ خطاؤں کا ہجوم
آگ برساتی ہوئی پھر وہی نظریں پیہم
پھر سلگتا ہوا احساسِ اَنا کا خیمہ
پھر وہی دھوپ وہی دشت وہی تنہائی
آج بھی ذہن میں زندہ ہے یہ غالب کا سوال
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

○

ایک خودغرض مسلمان کا نوحہ

کہیں لبنان و فلسطین و عراق و افغان
کہیں کشمیر، کہیں چیچن، کہیں بھارت و سوڈان
اور میں کیا ہوں بھلا ایک شاعر بدنام
میں پاکی، میں عربی، میں خودغرض مسلمان
میں رات کو سوتے میں کوئی خبر سنوں یا
صبح کے کھانے پر اخبار پڑھوں تو
پھول کی پتیوں کی طرح مسلے ہوئے بچے دیکھوں
ان کے ہاتھوں میں سسکتی ہوئی مائیں دیکھوں
اور دودھ پانی کو ترستے ہوئے چہرے دیکھوں
خون میں لتھڑی ہوئی کتابیں اور کھلونے دیکھوں
خاک میں ملتے ہوئے سوکھے ڈھانچے دیکھوں
گدھ کی طرح نوچے گئے انسانی لاشے دیکھوں
اور پھر مغموم سے لہجے میں کچھ آنسو بہا کر
اپنے بھائیوں کی حالتِ خستہ دیکھوں
پھر ایک بے بس خودغرض انسان کی مانند
اخبار کو تہہ کر کے کہیں کام پہ نکلوں
یا پھر جذبات میں آ کر خودنمائی کے لئے
یا اپنی سسکیوں کی کاغذ پہ رونمائی کے لئے
یا اپنے خیالوں کی وہاں تک رسائی کے لئے
اس بے حس قلم کو اپنے لہو میں ڈبو کر
بچھڑنے والوں کی یاد میں ایک نوحہ لکھوں
میں جو انسان ہوں بھلا کیا، بدنام شاعر......
خوشیوں کی امیدوں کے سہارے لڑنے والو!
اپنی ماؤں، بہنوں اور بچوں سے بچھڑنے والو!
اپنی دھرتی کی بقا کے لئے کٹ مرنے والو!
اس شاعرِ بدنام، خودغرض مسلمان کے بس میں
تم جیسے شاہینوں اور بے باک سفینوں کے لئے
ایک نوحہ لکھنے کے سوا اور تو کچھ نہیں لیکن
ہونٹوں پہ حرفِ دعا جاری ہے ابھی تک

وقار مسعود خان (خانیوال)

فکرِ فردا

''نئے کعبے کے آثار''

صفوت علی صفوت

(یو۔ایس۔اے)

قسط......۲

بحرالکاہل میں ایک بہت ہی گہری اور طویل خندق پائی جاتی ہے۔ اسے انگریزی میں ''ماریاناٹرنچ'' کہتے ہیں۔ یہ کتنی عمیق ہے، اسکا اندازہ یوں لگائیں اگر ہمالہ کی چوٹی تک جو 29 ہزار فٹ بلند ہے اُٹھا کر اس خندق میں سمودیا جائے تو پھر بھی چوٹی کے اوپر سات(۷) ہزار فٹ پانی باقی رہے گا۔یعنی ہمالہ کے ڈوبنے کا اندازہ بھی نہ ہوگا۔یعنی خندق کی گہرائی تقریباً ۳۶ ہزار فٹ ہے۔

اب اسکا اندازہ بھی لگائیں کہ اس گہرائی میں سمندری دباؤ کتنا ہوگا۔ سطح سمندر پر ہوا کا دباؤ پندرہ (15) پی ایس آئی (15PSI) ہے۔ جبکہ کہ ماریاناٹرنچ کی نچلی ترین سطح پر سمندری دباؤ (15000PSI) ہے۔ یوں سمجھئے کہ اگر ایک چھوٹے سے ٹماٹر پر موٹا تازہ آدمی کھڑا ہوجائے تو ٹماٹر پھٹ کر ریزہ ریزہ ہوجائے گا۔سو یہی حال ہمارا اس گہرائی میں ہوگا۔مضبوط سے مضبوط آبدوز بھی اک دباؤ کو برداشت نہ کر پائے گی۔لہٰذا وہاں پہنچنا اور وہاں کی ''مٹی'' پر ریسرچ کرنے کے لیے خاص آبدوز بنوائی گئی۔مگر ہمارا یہاں آبدوزوں کی ساخت پر کچھ لکھنے کا مقصد نہیں۔ہم تو صرف خدا کی قدرت کی بات کرتے ہیں کہ اس گہرائی میں جہاں نہ تو سورج کی روشنی پہنچتی ہے نہ ہی سورج کی حرارت ہے وہاں بھی ''زندگی'' موجود ہے۔واحد سیل (Cell) کی صورت میں تقریباً چار ہزار اقسام میں ''زندگی'' موجود ہے۔اسکی وجہ زمین کے کور کی حرارت ہے۔ انگریزی میں ایسی زندگی کو Foraminifera کہتے ہیں۔

اہرامِ مصر کے تین بڑے مقبرے کئے ہزار سال پہلے تعمیر کئے گئے اور ایک عجوبے کی حیثیت رکھتے ہیں۔انکی تین چوٹیاں کئی نوری سالوں کے فاصلہ پر واقع ہماری کہکشاں سے دور ''آراین بلٹ'' کے تین بڑے ستاروں پر منطبق ہیں۔ ان کی یعنی اہرام مصر کی جیومیٹری میں سورج سے فاصلہ۔زمین کا قطر اور کتنے حسابی نکات موجود ہیں۔اس علم کا ضائع ہونا انسانی بدقسمتی ہے۔اگرچہ اب کی سائنس ان تمام چیزوں کو بہتر سمجھتی ہے تاہم اس علم کا اپنے وقت پر ختم ہونے ہمارے علم کی وسعت پر زبردست فرق پڑا ہے۔خدا جانے ہماری فطرت میں وہ کیا عنصر ہے کہ جب علم آگے تیزی سے بڑھنے لگتا ہے تو ہمارے درمیان ''خانہ جنگی'' بھی بڑھنے لگتی ہے۔حقیقت ہے کہ اگر ''ربِّ زدنی علما'' پر عمل ہوتا تو ہم آج مریخ سے آگے، یہاں تک کے، نظام شمسی کے باہر کئی انسانی آبادیاں بسا چکے ہوتے۔تاہم اب اس سانحہ پر آنسو بہانے کی بجائے تعمیری کام میں لگ جائیں اور انسانیت اس بات پر عہد کرے کہ وہ جنگ وجدل سے اجتناب کرے گی۔

وہ دن زیادہ دور نہیں جب انسان مریخ پر آباد ہونے والا ہے۔ہمیں دنیا کے مختلف ممالک سے پوری امید ہے کہ وہ یہ کام آئندہ تیس سے چالیس برسوں میں (میری اپنی زندگی میں؟؟) مکمل کردیں گے۔

ہم اُترنے کو ہیں ارضِ مریخ پر اور اُس پر بسانے کو گھر بار ہیں
پھر خلافت کو صحرا ہیں پھیلے ہوئے پھر سجودِ ملائک پُر اسرار ہیں

یہاں خود بخود ایک بات ذہن میں پیدا ہوتی ہے۔لگتا ہے کہ جیسے ایک بہت بڑا خلائی جہاز ہے جس کا قطر ہماری زمین سے بھی کئی گنا ہے۔آئیں ہم اسے پیار سے ''فردوس'' کا نام دیتے ہیں۔اس میں بسنے والے ایک گروہ نے خلائی جہاز کے کمانڈر کی حکم عدولی کی ہے۔اس خلائی جہاز کے قوانین کے مطابق اس گروپ کو ''فردوس'' سے خارج کرنا ہے۔اسمیں نصب بڑی بڑی سکرینوں پر ایک بریکنگ نیوز آتی ہے۔ ''اِھبطو'' یعنی اُتر جاؤ۔خلائی جہاز کرۂ ارض پر گردش کرتا ہے اسی جملے میں پھر دوسری خبر آتی ہے ''بعضکم لبعضٍ عدو'' یعنی تم سے بعض دوسروں کے دشمن ہونگے۔گویا اس گروہ کو تنبیہ کی جاتی ہے کہ ہوشیار ہوجاؤ تم ایک دوسرے کو قتل بھی کرسکتے ہو۔لیکن اس حکم عدولی کی سزا موت کی سزا نہیں۔کمانڈر مہربان معلوم ہوتا ہے اور رحم دل نظر آتا ہے۔لہٰذا جملے کے آخر میں ایک بات اور کہتا ہے۔ ''ولکم فی الارض مستقر ومتاع الیٰ حین'' یعنی یہ کرہ ارض تمہارا ٹھکانہ ہے۔اس میں تمہارے لئے کھانے پینے اور دوسری ضرورت کی چیزیں موجود ہیں۔ایک مدت کے لیے۔جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔یہ بقرہ کی ۳۶ ویں آیت کے الفاظ کو اپنے ذہن میں ڈھالنے کی کوشش ہے۔

قارئین اب یوں سمجھئے کہ جس ''مُدت'' کا تذکرہ ہے وہ مدت اب ختم ہورہی ہے۔اور اب ہمیں اپنے زورِ بازو پر ایک دوسرے کوکب (Planet) پر اُترنا ہے۔یہ زمین میرے نزدیک ایک بہت بڑا قید خانہ ہے۔مگر ہے یہ قید خانہ ہی۔یہاں سے اُڑ کر ہمیں اُس ''فردوس'' کو تلاش کرنا ہے جس کا تذکرہ ہم بچپن سے سنتے آئے ہیں۔میں اوپر دوج کئے شعر میں ''ارض'' کی بجائے ''سطح'' کا لفظ بھی استعمال کرسکتا تھا مگر میرے نزدیک ''ارض'' سے مراد صرف کرہ ارض ہی نہیں۔ ہر وہ جگہ جہاں ہم کھڑے ہوسکتے ہیں۔جہاں ہم بیٹھ سکتے ہیں جہاں صحرا اور وادیاں ہیں۔جہاں زمین کو تقسیم کیا جاسکتا ہے۔جہاں وراثت قائم ہوسکتی ہے وہیں خلافت قائم ہوگی۔عربی میں لفظ ''ارض'' فرش کے معانی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔غیر زمینی اجسام کے لیے انگریزی میں لفظ terrestrial یعنی ''Silicate Composition'' بھی استعمال ہوتا ہے۔یہاں ایک شعر اور ذہن میں آتا ہے۔

کچھ مجد دخلاباز ہیں ساتھ میں غیر ذی ذرع وادی ہے قدموں تلے

پھر صفا اور مروہ کی ہے جستجو، اک نئے ہم پہ کعبے کے آثار ہیں

لفظ مجدّد کا انگریزی ترجمہ Revivalist کیا جائے گا۔ میرے نزدیک مریخ کو فتح کرنے والے ہم سب ہی کو مجدد کہا جا سکتا ہے۔ مریخ کے لق ودق صحراؤں جہاں کے ریت کے طوفان مہینوں چل سکتے ہیں، الفاظ ''غیر ذی زرع'' حضرت ابراہیمؑ کی اُس دعا میں موجود ہیں۔ ربّنا انی اسکنت...... بوادٍ غیر ذی زرعٍ......'' لہٰذا ایسے صحرا میں اُترنے کے بعد صفا اور مروہ کی جستجو ہمارا فرض بنتا ہے۔ اک نئے کعبے کی بات اس لئے کی ہے کہ مریخ کی سطح پر کھڑے ہوئے زمین نظر نہیں آئے گی۔ اور نہ یہ زمین کھڑے ہونے والوں کے قدموں میں ہوگی۔ وہاں مریخ کا فرش ہی ''دینا'' ہوگا یعنی سب سے نچلی جگہ۔ اور حقیقت یہ ہے کہ زمین وہاں کے آسمانی ''تاروں'' میں کبھی کبھار نظر آ سکتی ہے مگر ہمیشہ نہیں۔ یہ سائنسی حقائق ہیں۔

اگرچہ ''ناسا'' (NASA) کی قیادت میں انسان نے بہت ترقی کی ہے اور انسان نہ صرف چاند پر اُتر چکا ہے۔ بلکہ خلا میں ایک مستقل انٹرنیشنل سٹیشن قائم ہو چکا ہے۔ ISS پر بہت سے ممالک کے سائنسدان جا چکے ہیں اور تجربات جاری ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے پروب (Probe) یعنی بغیر انسان راکٹ وغیرہ مریخ اور اس کے آگے بھی بھیجے جا چکے ہیں۔ جن سے بے شمار سائنسی حقائق انسان کے سامنے آئے ہیں دو (۲) Rubots اس وقت بھی مریخ کی سطح پر موجود ہیں اور کام جاری ہے۔ تاہم اصل جدوجہد انسان کے مریخ پر اُترنے کی ہے۔ میں یہ بات افسوس کے ساتھ کہتا ہوں کہ ''ناسا'' کا بجٹ امریکی ٹوٹل بجٹ کے تناسب میں بہت کم ہے اور دوسرے ممالک کا ایسا بجٹ تو بہت کم ہے۔ بلکہ نہ ہونے کے برابر۔ جب ترقی یافتہ ممالک کا یہ حال ہو تو ہم برصغیر کے متعلق کیا شکایت کریں۔

جن لوگوں کو تھوڑی بہت دلچسپی ہے اُنکی معلومات یقیناً میرے لئے اُمید افزاء ہیں۔ یہاں صرف یہ کہوں گا۔ کہ ایک عام آدمی کو۔ فاصلوں کو اندازہ نہیں۔ روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ ہے۔ سورج کی روشنی ہم تک 8 منٹوں میں پہنچتی ہے۔ یعنی اگر کوئی طاقت سورج پر اچانک پردہ ڈال دے تو زمین والوں کو 8 منٹ بعد پتہ لگے گا۔ اب اگر مریخ سورج کے مشرق اور زمین سورج کے مغرب میں اور یہ دونوں کو کب ایک دوسرے سے دور ترین فاصلے پر ہوں تو روشنی کی رفتار سے ''ہلو'' Hellow کہتے ہیں 20 منٹ لگ جائیں گے۔ دور ترین فاصلہ 250 ملین میل ہے۔ یعنی 250,000,000 میل۔ ایسی صورت میں قارئین یہ سوال کر سکتے ہیں کہ آخر ایسی کیا آفت آئی ہے جو زمین کو چھوڑ کر مہینوں سفر کر کے مریخ پر پہنچا جائے۔ آپ کو اس سوال کا جواب معلوم ہے اور حقیقت یہ ہے کہ

جو لگن ہے ہم کو بہشت کی تو اُڑان کا ہے یہ سلسلہ
کہ ہزار پشت سے یاد ہے ہمیں گھر پہنچنے کا راستہ

بہشت کتنی دور ہے مجھے معلوم نہیں مگر اتنا یقین ہے کہ مریخ پر پہنچنا اور اُسکو فتح کرنا بہشت کی جانب پہلا قدم ہے۔ میں یہاں اسلامی عقیدے کی بات نہیں کر رہا۔ یہاں بہشت سے مُراد Cosmos ہے۔ لیکن جو لوگ اسلامی عقیدے سے سوچنا چاہتے ہیں اُنہیں بہشت مرنے کے بعد ملے گی۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ فقہا کے ہاں وقت کے حساب سے عقائد میں بتدریج مسلسل بہتری کا اصول بغیر بتائے ہوئے قائم رہا ہے۔ لہٰذا ممکن ہے کہ لامحدود وقت کو سمجھنے کے بعد انسانی علم بھی لامحدود طریقے سے بڑھتا جائے اور ایک وقت ایسا آئے کہ ہم اپنے زورِ بازو سے اپنے علم کی وسعت کی بنا پر (جو خدا کی نعمت ہوگی) بہشت پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں۔ آمین۔

مریخ سے متعلق بہت سے حقائق ایسے جو کہ آنے والی مشکلات کا پتہ دیتے ہیں۔ سب سے پہلا مسئلہ سانس لینے کا ہے۔ مریخ کی فضا میں آکسیجن نہ ہونے کے برابر ہے۔ پھر یہ کہ ہوا کا دباؤ زمین کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ لہٰذا کسی خلائی سوٹ کے بغیر سطح مریخ پر گھومنے پھرنے کا فی الحال سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ مریخ کی کشش ثقل زمین کے مقابلے میں 38% ہے۔ یہ بھی ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ تاہم ان تمام مشکلات کے باوجود سائنسدانوں کا خیال ہے کہ مسلسل جدوجہد کے بعد اس کرّہ کو بھی آہستہ آہستہ ''آباد'' کیا جا سکتا ہے۔

مریخ کے دو (۲) چاند ہیں تاہم یہ دونوں چاند زمینی چاند سے مختلف ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ ہم ایک چاند کی تعریف کرتے نہیں تھکتے پھر اگر دو (۲) ہوئے تو کیا ہوگا۔ تعریف کرتے ہوئے عجیب سا لگے گا۔ اسکے علاوہ یہ دونوں چاند دراصل حال ہی میں (حال سے مُراد کئی ملین سال) مریخ کی کششِ ثقل سے گرفتار ہوئے ہیں۔ نزدیکی چاند تو صرف 3 ہزار میل اوپر ہے۔ جبکہ زمینی چاند کوئی ڈھائی لاکھ میل دور ہے۔

چاند ہیں اسکے دو آسماں پر سجے ایک اُنمیں نکلتا ہے دو بار شب
اک نئے حُسن سے یہ چمکدار ہیں اک نئے عشق میں یہ گرفتار ہیں

اسکے علاوہ ایک اور اچھی بات یہ ہے کہ یہاں کا دن ہمارے دن سے تھوڑا بڑا ہے۔ تقریباً 40 منٹ۔ جبکہ مریخ کا سال ہمارے تقریباً دو (۲) سالوں کے برابر ہے۔ اب اگر ہم اپنی عمر مریخی سالوں میں ماپنے لگیں تو ایک پچاس سالہ خاتون صرف پچیس برس کی رہ جائیں۔ کیا غزل کی بات ہے۔

یوم چوبیس گھنٹوں سے ہے کچھ بڑا سال اسکا قریباً ہے دو سال کے
خط لگتا ہے جیسے قریب آ گئی نوجوانی کے پھر یوم وادوار ہیں

غرضیکہ ہم جب بھی مریخ کے بارے میں سوچتے ایک اُمنگ سی دل میں بیدار ہونے لگتی ہے۔ اگر ہم اس زمینی قید خانے سے آزاد ہو جائیں اور کہکشاں میں دور دراز ستاروں اور اُنکے گرد گھومنے والے سیاروں میں زندگی کی تلاش میں نکل کھڑے ایسی زندگی کو تلاش کر لیں تو ہمارے ارتقائی منال کیا ہونگی۔ کیا ہماری ارتقاء میں تیزی آ جائے گی؟ کیا ہم پھر بھی انسان ہی کہلائیں گے؟

☆

''جوش کے انقلابی مرثیے''

پروفیسر قیصر نجفی
(کراچی)

جوشؔ کے باب میں بیشتر قلمکاروں کا رویہ عموماً قابل افسوس رہا ہے۔ بعض نے انہیں الفاظ کے ڈھیر پر بیٹھا کران کی تصویر کھینچ لی ہے۔ جبکہ بعض نے انہیں جذبات شباب کے الاؤ میں غوطہ زن مصوّر کر کے جوشؔ شناسی کا سہرا سر پر سجالیا ہے۔ کیا صرف یہ کہہ دینا کہ لغت جوشؔ کے گھر کی کنیز تھی؟ یا یہ کہ وہ زمانۂ شباب میں نمو پانے والے حسیّات تک شعوری طور پر رسا تھا۔ ان کی شاعری، شخصیت اور فن سے انصاف ہے؟ ہرگز نہیں۔ جوشؔ ملیح آبادی نے زبان اور رومان کے محلات کے علاوہ بھی ایک ایوان فکر وفن آباد کیا ہے۔ جو شاید اس مکان سے مماثل ہے جس کا تصّور مرزا غالب کے ذہن میں تھا:

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا لیتے　　　عرش سے پرے ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

یہ ایک سنگین المیہ ہے کہ جوشؔ ایسا یگانۂ روزگار بعض معلوم ونامعلوم وجوہ کی بنا پر ہمیشہ متنازع فیہ رہا اور زندگی میں ہی نہیں موت کے بعد بھی اس التفات وتوجہ سے محروم رہا، جو ان کا استحقاق تھا۔ اس تجاہل عارفانہ کی یہاں تک نوبت پہنچی کہ ایک آدھ استثناء کے علاوہ کوئی ایسی مثال نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہو کہ کسی محقق نے جوشؔ جیسے زودنویس، بسیار گو بلکہ نغز گو شاعر کے کلام کی تحقیق وتدقیق کی ضرورت محسوس کی۔ جوش کے محقق اعظم ڈاکٹر ہلال نقوی کل کی طرح آج بھی اس صورت حال سے شاکی ہیں۔ اس حوالے سے انہوں نے جو تحقیق کی ہے اس کا ذکر ''جوشؔ شناسی'' کے پانچویں شمارے کے اداریے میں ان الفاظ میں کیا ہے۔

''اگر جوش صاحب کا دفاع نہ کیا جائے تو ان کے بارے میں برملا یہ بات تو یقیناً کہی جاسکتی ہے کہ انہوں نے اپنے مخالفوں اور دشمنوں کی تعداد بڑھانے میں خود بھی ایک کردار ادا کیا۔ لیکن ذرا تحمل سے سوچئے کہ وہ کیا کردار تھا۔ آپ الزام تراشیوں کے کتنے ہی دبیز پردوں میں لپیٹ کر گھما دیں، لیکن الزام صرف ایک ہی سامنے آئے گا اور وہ ہے ان کی صاف گوئی۔ سیاست، مذہب، رومان، تاریخ، ادب، سب کے بارے میں ان کی صاف گوئی ہی انہیں نقصان پہنچانے کا سبب قرار پائی۔۔۔۔ بلکہ اس سے بھی دو قدم آگے بڑھ کر مسلمات شکن بے باکی۔۔۔ لیکن جوشؔ صاحب ہی کیا، انسانی تاریخ کے بڑے مفکرین، فلسفی او اہل قلم شخصیات کا اکثر وبیشتر یہی وطیرہ رہا۔''

بہر حال یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ جوشؔ کی نایاب، گم شدہ اور غیر مطبوعہ تحریروں کی بازیافت اور ان سے متعلق تجزیاتی مطالعوں کے حوالے سے اب تک جن محققین ونقادانِ فن کے نام سامنے آئے ہیں، ان میں معتبر ترین نام ڈاکٹر ہلال نقوی کا ہے۔ ڈاکٹر صاحب جوشؔ کے ارادت مند بھی ہیں اور ان کے فنی شعور اور شعری وادبی دانش کے عارف بھی۔ ہماری معلومات کے مطابق انہیں اوائل عمر سے ہی جوشؔ شناسی کا سودا رہا ہے اور اب تو بلاخوف تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر ہلال نقوی کی علمی، ادبی اور تحقیقی مساعی نے جوشؔ شناسی کو ایک باقاعدہ تحریک کی شکل دے دی ہے اور اس تحریک کا حلقۂ تاثر آئے دن وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جارہا ہے۔ اس کی زندہ مثال جریدہ ''جوش شناسی'' ہے۔ جس کے قلمکاروں میں اردو دنیا کے بیشتر ممتاز ومعروف ناقد وادیب شامل ہیں۔ گزشتہ دو برسوں کے دوران میں اس کہکشاں کے ستاروں میں معتد بہ اضافہ ہوا ہے۔

جوشؔ ایسے ہمالۂ فن کی طرف آنکھ اٹھانے سے پہلے دستار سنبھالنی پڑتی ہے۔ لیکن ڈاکٹر ہلال نقوی نے جوشؔ کی فکری وفنی بلندیوں کو چشم شعور میں یوں سمویا ہے کہ خود سر بلند ہوگئے ہیں۔ اس امر کی دو وجوہ نمایاں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ جوشؔ کی علمی وادبی آغوش تربیت میں پروان چڑھے ہیں، دوسرے تخلیقی استعداد کے ساتھ ساتھ تحقیق وتدقیق کی صلاحیتیں بھی ان میں فطری طور پر پائی جاتی ہیں۔ مزید برآں انہوں نے جدید مرثیے کے علاوہ جس موضوع پر ارتکاز فکر سے کام کیا ہے وہ جوشؔ کی مرثیہ نگاری اور ان کا عرفانی ورثائی کلام ہے۔ جدید مرثیے کے موضوع پر تو ''بیسویں صدی اور جدید مرثیہ'' کے عنوان سے ان کا پر مغز مقالہ (جس پر انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوئی) 1994ء میں شائع ہوا تھا۔ البتہ جوشؔ کی مرثیہ نگاری اور ان کے عرفانی ورثائی کلام پر ڈاکٹر صاحب کی کتاب حال ہی میں منظر عام پر آئی ہے۔ جسے ''جوشؔ کے انقلابی مرثیے مع عرفانی ورثائی کلام'' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی تحقیق وتدوین میں ڈاکٹر ہلال نقوی نے جس عرق ریزی ومحنت شاقہ سے کام لیا ہے اس کی مثالیں خال خال ملتی ہیں۔ تحقیق ایک مشکل فن ہے جس کے تقاضے پورے کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں، یہ ادب کا ہفت خواں ہے، جسے طے کرنے کے لئے جنوں درکار ہے۔ ڈاکٹر ہلال نقوی فن تحقیق پر خیال آرائی کرتے ہوئے کتاب کے مقدمے میں رقم طراز ہیں۔

''کسی موضوع پر ایک اچھی تحقیق، محقق سے خون جگر طلب کرتی ہے۔ یہ تلاش کی ایک ایسی گردش ہے جو زمین کی گردش سے مماثل ہے کہ جس میں گردش زندگی ہے۔ یہی گردش محقق کی تلاش کا جغرافیہ ہے۔ ہر حوالے، ہر ماخذ او خزینے تک رسائی کے لیے محقق کو بے راستہ دفینوں میں بھی راستہ پیدا کرنا پڑتا ہے۔''

محولا بالا عبارت فن تحقیق کے حوالے سے ڈاکٹر ہلال نقوی کے تحقیق وجدان پر دال ہے۔

کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے جس چیز کا بطور خاص احساس ہوتا ہے۔ وہ تحقیق کے حوالے سے ڈاکٹر ہلال نقوی کی مستعدی اور دیانت ہے۔ بالخصوص جوشؔ کے مرثیوں اور عرفانی ورثائی کلام کی تحقیق وتدوین میں انہوں نے جس حزم واحترام بلکہ بیداری وخبرداری کا التزام کیا ہے وہ جوشؔ ایسے فاضل اجل وشاعر بے بدل کی شان اور مزاج کے عین مطابق ہے۔ ڈاکٹر ہلال نقوی سے زیادہ جوش کا مرتبہ دان ومزاج آشنا اور کون ہوسکتا ہے۔ لہٰذا انہیں جب ضمیر اختر

نقوی کی مرتب کردہ کتاب ''جوش ملیح آبادی کے مرثیے'' میں تحقیق وتدوین کی کمزوریاں اور تسامحات نظر آئے تو پیش نظر کتاب کے مقدمے میں ان کی نشان دہی کئے بغیر نہ رہ سکے۔ ہمارے خیال میں آج اگر جوش بقید حیات ہوتے تو ڈاکٹر ہلال نقوی سے زیادہ شدید ردعمل کا اظہار کرتے۔

ہر چند کہ ''جوش کے انقلابی مرثیے مع عرفانی ورثائی کلام'' کے دیگر مشمولات کی اہمیت وافادیت میں بھی کوئی کلام نہیں، مگر کتاب کا مقدمہ خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ کسی کتاب کا مقدمہ لکھنا ایک دقت طلب کام ہے چہ جائیکہ اپنی کتاب کا۔ اپنی کتاب کا مقدمہ قلم کے ساتھ ساتھ ظرف کو بھی آزماتا ہے۔ انسانی وجود میں چہرے کی جو اہمیت ہے مقدمے کو کتاب میں وہی اہمیت حاصل ہے۔ مقدمہ کتاب کے مجموعی تاثر میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ اس ادبی رمز سے ڈاکٹر ہلال نقوی بخوبی آگاہ ہیں۔ یہی سبب ہے کہ انہوں نے مقدمہ لکھنے میں بھی اسی بلاغت فکر ونظر سے کام لیا ہے، جو ان کی تحریروں کا طرّہ امتیاز ہے۔ یہ مقدمہ جہاں جوش کے رثائی کلام پر کئے گئے تحقیقی کام کا ایک بھرپور تنقیدی جائزہ پیش کرتا ہے وہاں ان کے مزاج وطبیعت کے عیاں ونہاں گوشے بھی سامنے لاتا ہے۔ دراصل اس مقدمے میں ڈاکٹر ہلال نقوی نے بیک وقت جوش ملیح آبادی کے فن کا تجزیہ بھی کیا ہے اور ان کی تحلیل نفسی بھی کی ہے۔ کسی مقدمے میں فن وشخصیت کا اس قدر حسین امتزاج ہماری نظروں سے کبھی نہیں گزرا۔

- جوش ملیح آبادی طبعاً اور طبیعتاً کوئی مذہبی آدمی نہیں تھے۔ لیکن مذہب اور اس کے زیر اثر دیدہ ونادیدہ حقیقتیں اور تصورات ان کا بہت گہرا موضوع رہے ہیں۔
- ان کی شاعری ہی دراصل ان کا طرز حیات ہے۔
- ان کی پوری زندگی اس حقیقت سے عبارت ہے کہ وہ تلفظ کی غلطی پر کسی کو معاف نہیں کرتے تھے۔
- آپ اسے کوئی بھی نام دیجیے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جوش صاحب اپنی کتابوں کی اشاعت کی اجازت، حقوق اور رائلٹی کے بارے میں کسی تکلف کے روادار نہیں تھے۔ لین دین کے معاملے میں بالکل صاف آدمی تھے۔
- مرثیے لکھتے ہوئے انہیں اپنے روشن خیال دوستوں اور ترقی پسند نقادوں کی عدالت میں کوئی شرمندگی نہیں ہوئی۔
- احوال اسباب تو یہی بتاتے ہیں کہ اپنے شعری سرمائے کی ترتیب و طباعت سے متعلق جوش صاحب کی ترجیحات میں یہ پہلو ہمیشہ شامل رہا ہے کہ ان کے مرثیے، ان کی زندگی میں ان کی اپنی نگرانی میں بہت احتیاط اور اہتمام کے ساتھ منظر عام پر آجائیں۔
- وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ ہم اپنے خونِ جگر سے کتاب تیار کرتے ہیں۔ لیکن اس خون کی سرخی پبلشر کے چہرے پر جھلکتی ہے۔ 1947ء میں بمبئی سے ان کا شعری مجموعہ ''سنبل وسلاسل'' شائع ہوا۔ اس میں ناشرین کے حوالے سے یہ رباعی شامل تھی۔

چاندی کا ورق ہے کہ گہر بار جبیں   ارباب قلم کے ملک ہیں زیرنگیں
خون شعراء کا روئے گلگوں پہ ہے رنگ   کیوں قبلۂ عالم! آپ ناشر تو نہیں

جوش کے کلام کا اپنا ایک نشہ ہے اور اس نشے کی جس کو بھی عادت پڑ جائے پھر اس پر کسی اور کی صہبائے کلام کا خمار نہیں چڑھتا۔ یہ کلام بیک وقت کیف وسرور بھی دیتا ہے اور حرارت وتوانائی بھی بخشتا ہے۔ کیف وسرور دل ودماغ میں خود اعتمادی کے روزن کھولتے ہیں اور حرارت وتوانائی انقلاب آفریں فکر کے در وا کرتے ہیں۔ جوش کی خرد افروزی شعلۂ تجسس کو ہوا دیتی ہے اور قاری اپنے اندر حیات وکائنات کے رازہائے سربستہ کو جاننے اور سمجھنے کی اکساہٹ محسوس کرتا ہے۔ یہ محرک وانگیخت جوش کے بیشتر کلام کا اختصاص ہے۔ البتہ اس چراغ کی لَو ان کے رثائی کلام خصوصاً مرثیوں میں زیادہ بلند ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر ہلال نقوی نے ان کے مرثیوں اور عرفانی ورثائی کلام کو اپنی تحقیقی کاوشوں کا مرکز ومحور بنایا ہے۔

ڈاکٹر ہلال نقوی نے جوش جیسے عہد ساز شاعر کے سب مرثیوں اور تمام تر عرفانی ورثائی کلام کو یکجا کر کے بلاشبہ ایک کارنامہ انجام دیا ہے۔ یہ کون نہیں جانتا کہ جوش ایک قادر الکلام، زودنویس اور بسیار گو شاعر تھے۔ ان کے بے پناہ بکھرے ہوئے کلام کی اصل، درست اور مکمل صورت میں تحقیق وتلاش اور ترتیب وتدوین ایک بہت بڑا چیلنج تھا، ایک عظیم ذمہ داری تھی۔ جس سے ڈاکٹر ہلال نقوی جیسا عاشق جوش ہی عہدہ برآ ہوسکتا تھا۔

''جوش کے انقلابی مرثیے مع عرفانی ورثائی کلام'' دوحصوں پر مشتمل ہے۔ ایک حصہ جوش کے مرثیوں سے مختص ہے۔ دوسرے میں ان کا تمام تر عرفانی ورثائی کلام شامل ہے۔ دونوں حصے تحقیق وتلاش کے ایک نئے اسلوب، ترتیب وتدوین کے ایک نئے جمال اور پیش کش وتعارف کی ایک طرز نو سے متعارف کراتے ہیں۔ اوّل تو تحقیق کی کسوٹی پر حرف حرف کی دقت نظر سے جانچ کی گئی ہے۔ دوم ہر تحقیق خاص کر ہر مرثیے کو ایک تحقیقی نوٹ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ بادی النظر میں تحقیقی نوٹ ایک آئینہ لگتا ہے جو مرثیے کے نقش ونگار کا سطحی عکس دکھاتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ ایک خوردبین کا کردار ادا کرتا ہے اور قاری کی رسائی مرثیے کے داخلی وخارجی، تحقیقی وتخلیقی اور فکری وفنی گوشوں تک نہایت آسان بنا دیتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ تحقیقی نوٹ جوش کے مرثیوں کے حوالے سے اٹھنے والے سوالات کا شافی جواب اور پیدا ہونے والے اشکال کا دافع ہے تو زیادہ مناسب ہوگا۔

کتاب کے آخر میں ''جوش کی مرثیہ نگاری اور رثائی خدمات'' کے عنوان سے ڈاکٹر ہلال نقوی کے ڈاکٹریٹ کے مقالے ''بیسویں صدی اور جدید مرثیہ'' کا ایک باب شامل اشاعت ہے۔ یہ باب ایک آئینہ خانہ ہے جس میں جوش کے فن وشخصیت کے متنوع عکس دیکھے جاسکتے ہیں۔ ''جوش کے انقلابی مرثیے مع عرفانی ورثائی کلام'' ڈاکٹر ہلال نقوی کا بڑا کام ہے اور ایک بڑے کام کی تکمیل پر ہم انہیں دلی مبارک پیش کرتے ہیں۔

ایک صدی کا قصہ

محبوب خان

دیپک کنول

(ممبئی، بھارت)

آج سے 103 سال قبل کی بات ہے۔ریاست گجرات میں بلمورا نام کاایک گاؤں تھا۔(جو آج بھی ہے)4000 نفوس پر مشتمل یہ گاؤں بڑا ہی پسماندہ تھا۔لوگوں کا ذریعہ معاش کھیتی باڑی تھا۔اسی گاؤں کے ایک غریب مسلم گھرانے میں ایک بچے نے جنم لیا جسکا نام ماں باپ نے رمضان خان رکھ دیا۔یہ بچہ مفلسی کے عالم میں پلا بڑھا۔گاؤں کے ایک مولوی سے دینیات کی تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اُسنے تھوڑی بہت اُردو انگریزی بھی سیکھ لی۔عام اصطلاح میں اسے کام چلاؤ تعلیم کہا جا سکتا ہے۔رمضان نے جب ہوش سنبھالا تو ماں باپ کی تنگی ترشی دیکھ کر وہ بڑا اُداس اور افسردہ ہو جایا کرتا تھا۔وہ اپنے والدین کو غریبی کی اس دلدل سے نکالنا چاہتا تھا پر کیسے؟ یہ ایک ایسا سوال تھا جو اُسے بار بار پریشان کر دیتا تھا۔اُسکے یار دوست اُسے بمبئی شہر کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں سنایا کرتے تھے۔کچھ ٹاٹا برلا کی اور کچھ فلمی ہستیوں کی۔اُنکا کہنا تھا کہ بمبئی ایک ایسا شہر ہے جہاں لوگوں کی تقدیریں بدل جاتی ہیں۔جہاں بن مانگے ہی مرادیں پوری ہو جاتی ہیں۔یہ وہ شہر ہے جہاں ہر طرف دھن برستا ہے۔ان کی باتیں سن کر رمضان کا معصوم دل مچلنے لگتا تھا۔اُس کے من کی ڈالیوں پر اُمیدوں کے شگوفے پھوٹنے لگتے تھے۔وہ اُس چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن کی طرف بھاگتا تھا جو اُنکے گاؤں کے بیچ واقع تھا اور یہاں پر وہ گھنٹوں بیٹھ کر کھلی آنکھوں سے آنے والے کل کے بڑے بڑے سپنے دیکھا کرتا تھا۔وہ اُس پٹری کو حسرت بھری نگاہوں سے تکتا رہتا تھا جو اس چھوٹے سے گاؤں کو اُسکے خوابوں کے شہر بمبئی سے ملاتی تھی۔

رمضان بڑا خوبرو بچہ تھا۔اُسکی ماں اس سے بہت پیار کرتی تھی۔وہ اُسے اپنی نظروں سے پل بھر کے لئے بھی اوجھل ہونے نہیں دیتی تھی۔اُسے گاؤں سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔رمضان گاؤں میں رہ کر گھٹن سی محسوس کر رہا تھا۔وہ آکاش کی بلندیوں کو چھونا چاہتا تھا پر ماں باپ کی بندشیں آڑے آرہی تھیں۔ایک طرف اُسکے سنہرے سپنے اور دوسری طرف ماں کی ممتا۔وہ ان دونوں کے بیچ پھنس کر رہ گیا تھا۔اُسکے خواب اُسے رات دن بے چین و پریشان کرنے لگے۔وہ اپنے آپ کو پنجرے میں قید پنچھی کی طرح محسوس کرنے لگا۔وہ اس قید سے نکل کر اپنے خوابوں کی نگری میں پہنچ جانا چاہتا تھا جو اُسکے گاؤں سے محض 135 میل دور تھی اور وہ اُڑ کر اس طلسماتی شہر میں پہونچ کر اپنے دلدّر دور کرنا چاہتا تھا مگر اُس کے گھر کے حالات، سقیم الحالی اور ماں کا پیار اُسکے پاؤں کی بیڑیاں بن کر اُسے روکے ہوئے تھیں اور وہ چاہ کر بھی ان بیڑیوں کو توڑ نہیں پا رہا تھا۔ایک دن جب اُسکے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو اُس نے ان سارے بندھنوں کو توڑ ڈالا اور وہ ریل میں سوار ہو کے اپنے منزل کی جانب چل دیا۔ یہ 1927 کا سال تھا اور اُسکی جیب میں صرف تین روپے تھے۔

بمبئی پہنچ کر وہ کام کی تلاش میں کئی روز تک اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا۔قسمت اُسے امپیریل اسٹوڈیو کے پھاٹک تک لے گئی جہاں پر ایکسٹراؤں کی بھرتی ہو رہی تھی۔وہ بھی اندر جا کر قسمت آزمانا چاہتا تھا پر اسٹوڈیو کے اندر جانا ممکن نہیں تھا۔گیٹ پر ایک داڑھی والا پٹھان جسکی صورت جلاّدوں جیسی تھی ایک ٹانگ پر کھڑا پہرہ دے رہا تھا۔وہ بڑا بے مروّت اور بے رحم آدمی تھا۔اُسکے ہوتے ہوئے کوئی اسٹوڈیو میں جھانک کر بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔رمضان نے پٹھان کو پٹانے کی ایک ناکام کوشش کی۔ پٹھان تو کسی کو پاس پھٹکنے بھی نہیں دیتا تھا۔ رمضان بڑا پریشان ہوا۔وہ کسی بھی حالت میں امپیریل اسٹوڈیو کے مالک اردشیر ایرانی سے مل کر کوئی کام حاصل کرنا چاہتا تھا۔اردشیر ایرانی کو خان بہادر کا لقب ملا تھا اور وہ اسی نام سے پہچانا جاتا تھا۔اُسنے ادھر اُدھر کھوج خبر کی۔اُسے پتہ چلا کہ ایک ریلوے افسر کی اردشیر ایرانی سے دعا سلام ہے۔اُسنے اُس آفیسر تک رسائی حاصل کی اور اُسے اپنی معصوم ادا اور شیریں باتوں سے اس حد تک قائل کر لیا کہ وہ رمضان کو اردشیر ایرانی سے ملانے کے لئے بلا کسی تامل کے فوراً راضی ہو گیا۔

جب رمضان اردشیر ایرانی کے سامنے کھڑا ہوا تو اُسے ایک نظر دیکھ کر اردشیر ایرانی برافروختہ ہو کر غرّایا۔''لو ایک اور پاگل آن پہونچا۔تم یہاں کیوں آئے ہو۔جاؤ جا کر اپنے باپ کا ہاتھ کھیتی میں بٹاؤ۔کچھ محنت اور ایمانداری کا کام کرو۔یہاں کیا رکھا ہے؟''

رمضان کی گھگی بندھ گئی۔وہ کچھ بولنا چاہتا تھا پر وہ لاکھ کوشش کے باوجود بھی کچھ بول نہ پایا۔ایسا لگا جیسے زبان تالو سے چپک گئی ہو۔اس سے پہلے کہ اُسے نامراد ہی لوٹ جانا پڑتا اُسی وقت پاس کی ایک مسجد سے اذان کی آواز گونجی۔بدحواس رمضان کو جیسے ایک بشارت ملی۔اُس نے اپنے حواس یکجا کئے اور سیٹھ سے کہا۔''سیٹھ میں پہلے نماز پڑھ کے آتا ہوں پھر آپ کے سوال کا جواب دوں گا'' یہ کہہ کر وہ پٹھان واچ مین کی کوٹھری کی طرف بھاگا اور واچ مین کے ساتھ نماز ادا کرنے لگا۔اس واقعے کا سیٹھ کے دل پر تھوڑا بہت اثر تو ہوا اور رمضان کو ایک ایکسٹرا کے طور پر کمپنی میں بھرتی کر لیا گیا۔سات سو اسٹوڈیو

ورکروں کی بھیڑ بھاڑ میں معصوم سا رمضان کہیں کھو کر رہ گیا۔سیٹھ اردشیر ایرانی نے رمضان کو ملازم تو رکھا تھا مگر اُسکی تنخواہ کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں لیا تھا اسلئے جب پہلی تاریخ کو سب ورکر تنخواہ لینے کے لئے لائن میں کھڑے ہوئے تو رمضان بھی لائن میں لگ گیا۔جب اُس کا نمبر آیا تو یہ دیکھ کر اُسکے دل کو بڑا گہرا دھچکا لگا کہ تنخواہ تو دور ملازموں کی لسٹ میں اُسکا نام تک شامل نہ تھا۔اُنہوں نے اُسے اپنا ملازم ماننے سے ہی انکار کر دیا۔دراصل سیٹھ اردشیر ایرانی اس لڑکے کے بارے میں اپنے اسٹاف کو اطلاع کرنا بھول گئے تھے۔اُنکی یہ چھوٹی سی بھول رمضان خان کے لئے کتنی بھاری ثابت ہوئی تھی یہ تو اُسی کا دل جانتا تھا۔

رمضان نے بڑے مشکل دن دیکھے۔اُس کے پاس نہ پیٹ بھرنے کو روٹی اور نہ سر چھپانے کی جگہ تھی۔وہ کئی کئی روز تک ریلوے پلیٹ فارموں پر سوتا رہا کبھی ریلوے اسٹاف آجاتا تھا اور اُسے وہاں سے بھگا دیتے تھے۔وہ خاموشی سے یہ ذلّت برداشت کر رہا تھا۔ایک دن قسمت سے اُسکی ملاقات ایک ہم عمر اسٹرگلر سے ہوئی جس نے اپنے دل کے دروازے اُسکے لئے کھول دئے اور اُسے اُس آڑے وقت میں سہارا دیا جب کہ وہ اندر سے بالکل ٹوٹ چکا تھا۔اُسنے نہ صرف اپنا کھانا بلکہ اپنا بستر تک اُسکے ساتھ بانٹا۔

ایک دن ایک ڈائرکٹر اُس پر مہربان ہوا اور اس نے اُسے اپنی فلم میں ایک چھوٹا سا رول دے دیا۔جب اُسکے چہرے پر میک اپ کیا گیا تو اُسکی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔اب وہ رمضان خان نہیں تھا۔اب وہ محبوب خان تھا۔اُسے فلم ''علی بابا چالیس چور'' میں ایک چور کا رول ملا تھا۔اُنہوں نے اُسے ایک بڑے سے مرتبان میں چھپنے کے لئے کہا اور اُسے باہر جھانکنے سے سختی سے منع کیا۔محبوب خان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ آخراُ سے اس مرتبان میں چھپا کر رکھنے کی کیا تک تھی۔

جبکہ وہ کیمرہ میں کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا وہ شاید یہ نہیں جانتا تھا کہ اسی مرتبان میں اُس کی تقدیر بند ہے جس دن یہ مرتبان کھلے گا ہر طرف اُس کا طوطی بولنے لگے گا۔

محبوب خان کو قسمت پھر سے امپریل اسٹوڈیو کے دروازے پر لے آئی۔اُسے ایک فلم میں ایکسٹرا کا رول ملا۔اس باراُس نے اپنے مولا سے دعا کی کہ فلم کا کیمرہ اُس پر مہربان ہو جائے اور اُسکی ایک جھلک کو اپنے اندر قید کرلے۔چار مہینے گزر گئے اُسے ایک پھوٹی کوڑی تک نہ ملی۔اب کے اُس کا صبر جواب دینے لگا۔وہ اپنے اُس مہربان ریلوے افسر سے ملا جس نے کئی باراُسکی مدد کی تھی۔وہ سیدھے اُسے اردشیر سیٹھ کے پاس لے گیا اور اُس سے جا کر شکایت کی۔سیٹھ حالانکہ بہت مصروف تھا تاہم اُسنے اپنے دوست کی بات غور سے سنی اور اُسی وقت یہ حکم جاری کیا کہ وہ آج سے محبوب خان کی تنخواہ تیس روپیہ مقرر کرتا ہے۔پچھلے چار مہینے کو تو وہ بھول ہی گئے۔اُن چار مہینوں کی پگار کا نہ ہی محبوب کی طرف سے کوئی تقاضا ہوا اور نہ ہی کمپنی نے کوئی ذکر کیا۔

پہلی بار جب محبوب کو تیس روپے کی پگار ملی تو اُس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔اُسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اُسے قارون کا خزانہ مل گیا ہو۔پچھلے چار مہینوں کی تنگی ترشی کو یاد کر کے اُس پر لرزہ طاری ہوتا تھا۔اُسنے سب سے پہلے ان تیس روپوں میں سے دس روپے اپنے غریب باپ کو منی آڈر کر کے بھیج دئے۔بیس روپے اپنے لئے رکھے۔وہ بیس روپیے سے اپنا گزارہ چلاتا رہا۔ پانچ وقت کے اس نمازی کی دعائیں اوپر والے نے سنیں۔امپریل کمپنی کے جنرل مینیجر آر۔جی۔ٹرونی کی نظرِ التفات اُس پر پڑی اور اُسنے اس نوجوان کو اپنی چھتر چھایا میں لے لیا اور اُسکے لئے اچھے اچھے سے رولز تلاش کرنے لگا۔اُسے خاموش فلموں میں کئی طرح کے رولز ملے۔وہ بھی خاموشی سے یہ رول ادا کرتا رہا۔

تین سال اسی طرح گزر گئے۔محبوب خان جے پور میں ایک فلم کی شوٹنگ کر رہا تھا۔اس فلم کا نام ''میواڑ۔نو۔موالی'' تھا۔سب سے مزے کی بات یہ تھی کہ اس بار محبوب اپنے مربی مسٹر ٹرونی کی ہدایت میں کام کر رہا تھا۔محبوب کو گھوڑے پر ایک شارٹ دینا تھا۔یہ گھوڑا کوئی معمولی گھوڑا نہ تھا بلکہ یہ جے پور کے مہاراجہ کا شاہی گھوڑا تھا جو بلمورا کے ایک نا پختہ اور خام کار گھڑ سوار کو اپنی پیٹھ پر بٹھانے کے لئے تیار نہ تھا۔شارٹ یہ تھا کہ محبوب گھوڑے کو مہمیز کر کے کیمرے کی سمت میں دوڑائے گا اور پھر ایک طرف نکل جائے گا۔گھوڑا بڑا اڑیل تھا۔گھوڑ سوار کی حرکتوں سے بپھرایا ہوا تھا۔محبوب کے لئے گھوڑے کو قابو کرنا مشکل ہو رہا تھا۔اچانک گھوڑا بدک گیا۔محبوب خان کو جان کے لالے پڑتے ہوئے نظر آنے لگے اس سے پہلے کہ وہ اپنی جان بچانے کی کوشش کرتا گھوڑا بدک کر تیر کی طرح نکل گیا اور کیمرہ کو پار کرتے ہوئے محبوب خان کو کہیں دور پھینک کے چلا گیا۔محبوب خان کو دن میں ہی تارے نظر آنے لگے۔شکر ہے کہ کوئی گہری چوٹ نہ لگی۔

خوش قسمتی سے کیمرے میں یہ پورا سین قید ہوا تھا۔جب ہفتہ عشرے کے بعد خان بہادر نے رشز دیکھے تو یہ سین دیکھ کر وہ اُچھل پڑا اور اُس نے محبوب خان کو دیکھ کر پوچھا۔''یہ لونڈا کون ہے'' تو ٹرونی نے فوراً جواب دیا۔''یہ اپنے محبوب سر ہیں'' سیٹھ نے حیران ہو کے پوچھا۔''کون محبوب سر؟'' ٹرونی نے اپنے ایک اسسٹنٹ سے کہا کہ وہ محبوب کو بلا کر لے آئے۔ایک پل میں حکم کی تعمیل ہوئی۔جب محبوب کو خان بہادر کے سامنے پیش کیا گیا تو وہ اُسے غور سے دیکھنے لگے اور سب سے پہلا سوال جو اُنہوں نے اُس سے پوچھا وہ تھا۔''تمہیں کتنی پگار ملتی ہے؟'' محبوب نے بڑی انکساری سے جواب دیا۔''تیس روپے جناب'' خان بہادر نے اُسی وقت یہ حکم صادر فرمایا کہ آج سے اسکی پگار میں دس روپے کا اضافہ کیا جائے'' پہلی بار محبوب خان کے کام کو اردشیر ایرانی جیسے فلم ساز نے سراہا۔اس ساری کامیابی کا محرک وہ بد مزاج شاہی گھوڑا تھا جس نے محبوب خان کو اللہ کے پاس ہی پہونچا دیا تھا۔محبوب

صاحب اللہ کے ساتھ ساتھ اُس گھوڑے کا بھی شکریہ ادا کرنا نہ بھولے جس کے اڑیل پن کی وجہ سے وہ خان بہادر کی نظروں میں آ گیا تھے۔

1931 تک محبوب صاحب کو ساگر موی ٹون میں اچھے خاصے رول ملنے لگے۔ان میں سے زیادہ تر ویلن کے رول ہوا کرتے تھے۔ یہ کمپنی امپریل فلم کمپنی سے ہی جڑی ہوئی تھی۔اب محبوب صاحب کی پگار میں تیس روپے کا اضافہ ہوا تھا۔محبوب صاحب کی منزل اداکاری نہیں تھی۔ وہ تو کچھ اور بننے آئے تھے۔ اُن کے دل میں کئی طرح کی آرزوئیں ہلکورے مار رہی تھیں۔پہلی بار اُنھوں نے فلم کی کہانی پر طبع آزمائی شروع کی۔اب اُنکے نئے باس ڈاکٹر امبالال پٹیل اور چمن بھائی ڈیسائی تھے۔

وہ اُنہیں اپنی کہانی سنانا چاہتے تھے۔اُن لوگوں نے محبوب صاحب کو 71 بار ملنے کا ٹائم تو دے دیا پر وہ ایک بار بھی نہیں ملے۔محبوب صاحب نے ہمت نہیں ہاری۔ آخر 72 ویں ملاقات میں وہ اُن سے ملنے میں کامیاب ہوئے۔محبوب صاحب نے کہانی سنا کر ڈاکٹر پٹیل کو قائل کر دیا۔وہ اس کہانی پر پیسہ لگانے کے لئے تیار ہوئے۔اگلے مہینے اُن کی فلم سیٹ پر تھی۔اس فلم کا نام ''الہلال''یعنی "JUDGEMENT OF ALLAH" تھا۔

جب فلم بن کر بمبئی میں ریلیز ہوئی تو ڈاکٹر پٹیل اور چمن لال ڈیسائی تھیٹر کے باہر فلم میگزین ''فلم انڈیا'' کے ایڈیٹر بابوراؤ پٹیل کا فیصلہ سننے کے لئے دل تھامے کھڑے تھے۔بابوراؤ پٹیل ایک معتبر فلمی ناقد تھا جسکی رائے کی بڑی قدر و اہمیت ہوا کرتی تھی۔جب بابوراؤ فلم دیکھ کر باہر آیا تو ان دونوں نے دھڑکتے دل سے اُس سے پوچھا۔

''فلم کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے بابوراؤ؟''

''تم اس لونڈے کو کہاں سے پکڑ کر لے آئے ہو۔ایسا نہیں لگتا کہ یہ ڈائرکٹر کی پہلی فلم ہے۔میری بات گرہ میں باندھ کے رکھ لو یہ ڈائرکٹر بہت آگے جائے گا۔''

بابوراؤ کی پیش گوئی حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی۔مار دھاڑ سے بھر پور ''الہلال'' نے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دئے۔اُسکے بعد محبوب صاحب نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔اُنھوں نے ساگر موی ٹون کے لئے کئی فلمیں ڈائرکٹ کیں جیسے 1936 میں ''منموہن'' 1937 میں ''جاگیر دار'' 1938 میں ''ہم تم اور وہ'' اور ''وطن'' 1939 میں ''ایک ہی راستہ'' 1940 میں ''علی بابا'' اور ''عورت'' 1941 میں ''بہن'' 1942 میں ''روٹی''۔1942 میں ہی محبوب صاحب نے ''محبوب اسٹوڈیو'' کی نیو ڈال دی۔محبوب فلمز کے بینر تلے اُنہوں نے 1943 میں اپنی پہلی فلم ''نجمہ'' پرڈیوس اور ڈائرکٹ کی۔اُسکے بعد 1945 میں ''ہمایوں'' 1946 میں ''انمول گھڑی'' 1947 میں ''اعلان'' 1948 میں ''انوکھی ادا'' 1949 میں ''انداز'' 1952 میں ''آن'' 1954 میں ''امر'' 1957 میں ''مدر انڈیا'' اور 1962 میں ''سن آف انڈیا'' جیسی فلمیں بنائیں۔جس فلم نے محبوب خان کو عظمت بخشی وہ تھی ''مدر انڈیا''اس فلم کو آج بھی لوگ چاؤ سے دیکھتے ہیں۔اس فلم نے ملک کو زرعی انقلاب کی راہ پر ڈال دیا۔خاص طور سے پنجاب کی زرعی صنعت میں ایک طوفانی بدلاؤ آ گیا۔

''آن'' محبوب صاحب کی دوسری کامیاب فلم تھی جس نے بزنس کے سارے ریکارڈ توڑ دئے۔یہ فلم دنیا کی کئی زبانوں میں ڈب ہوئی۔ میں نے اپنی کتاب ''دلیپ صاحب'' میں ایک آرمینین خاتون کا ذکر کیا تھا جو یہ فلم دیکھ کر دلیپ صاحب پر فدا ہو گئی تھی۔اُس کی دیوانگی کا یہ عالم تھا کہ وہ کئی سالوں تک دلیپ صاحب تک پہونچنے کی ناکام کوشش کرتی رہی۔ ناکام اس لئے کہ فلم کا ٹائٹل ''منگلا'' کر دیا گیا تھا اور دلیپ صاحب کا نام آرمینین زبان کے حساب سے فلپ کمار رکھ دیا گیا تھا۔ایسے میں دلیپ صاحب تک پہونچنا کتنا مشکل تھا اس کا اندازہ آپ خود ہی لگا سکتے ہیں۔''آن'' کے تعلق سے ہی مجھے ایک قصہ یاد آ گیا۔ یہ قصہ مجھے دلیپ صاحب نے ہی سنایا ہے۔محبوب صاحب مزاج کے بڑے سخت تھے۔اُنکے سیٹ پر آتے ہی سناٹا چھا جاتا تھا۔ بڑے سے بڑا ایکٹر اُنکے سامنے سر جھکائے کھڑا رہتا تھا۔

''آن'' کی آوٹ ڈور شوٹنگ کے دوران مقری صاحب نادرہ پر لٹو ہو گئے تھے اور اُسے شیشے میں اُتارنے کی کوشش میں لگے تھے۔نادرہ جیسی شعلہ بدن حسینہ کو دیکھ کر کس کا ایمان نہیں ڈگمگاتا۔مقری صاحب کی کیا خطا۔ ایک دن نادرہ کو اچانک بخار آ گیا۔مقری صاحب کے لئے نادرہ کا بخار خوشی کا پیغام بن کر آیا۔وہ بہانے بہانے سے نادرہ جی کے کمرے میں جا کر اُنکے قریب آنے کی کوشش کرنے لگا۔شومئی قسمت رات کے بارہ بجے جب مقری نادرہ کے کمرے میں جا رہا تھا کہ محبوب صاحب کی بیگم سردار اختر اچانک کمرے سے باہر آ گئی۔اُس نے مقری کو اتنی رات گئے نادرہ کے کمرے میں جاتے دیکھا۔اُن کا ماتھا ٹھنکا۔اُنہوں نے جا کر محبوب صاحب کے کان تک یہ بات پہنچا دی۔ادھر مقری نے سردار اختر کو دیکھ لیا تھا۔وہ اس قدر بدحواس ہو گیا کہ ادھر اُدھر چھپنے کی بجائے وہ نادرہ کے کمرے کے کمرے میں ہی گھس گیا۔مقری وہاں کمبل پھینک کر دلیپ صاحب کے کمرے کی طرف بھاگا اور اُنکے بستر میں گھسنے کی کوشش کرنے لگا۔ دلیپ صاحب نے اُسے لات مار کر بیڈ سے نیچے گرا دیا۔مقری رونے لگا اور رو رو کر دلیپ صاحب کو سارا قصہ سنانے لگا۔یہاں یہ بتا تا چلوں کی دلیپ صاحب اور مقری بڑے قریبی دوست تھے۔اُنکی دوستی خالصہ کالج سے شروع ہوئی تھی جو مقری صاحب کے مرنے تک قائم رہی۔صبح جب ناشتے کی میز پر محبوب صاحب اور دلیپ صاحب ناشتہ کر رہے تھے تو محبوب صاحب مقری کی اس حرکت سے بیحد خفا تھے۔وہ اُنکے پروانہ راہ دارہ پر دستخط کر چکے تھے۔مقری صاحب کا اس فلم سے آوٹ ہونا طے تھا۔ناشتے کے دوران محبوب صاحب نے دلیپ صاحب سے کہا۔''تمہیں معلوم ہے رات بھر یہ ٹھگنو کیا کرتا رہا؟''

''ہاں جانتا ہوں میں'' دلیپ صاحب نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

''تمہیں اصل کہانی نہیں معلوم۔ یہ کمبخت نادرہ کے کمرے میں رات کے بارہ بجے گھستے ہوئے دیکھا گیا۔ یہ ٹھگنو قد کا جتنا چھوٹا ہے اُتنا ہی کھوٹا ہے۔ میں ابھی اس کا پیک اپ کروا دیتا ہوں۔''

''محبوب صاحب مقری نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔ وہ رات کو مجھے بتا کے نادرہ کے کمرے میں چلا گیا تھا۔ کسی غلط ارادے سے نہیں بلکہ اُسے کمبل دینے کیونکہ بخار کی وجہ سے اُسے کپکپی چڑھی ہوئی تھی۔''

دلیپ صاحب کے اس جھوٹ نے مقری کو بچا لیا نہیں تو اُسی دن اُس کا پیک اپ ہو جاتا اور وہ ''آن'' میں نظر نہ آتا۔ اصل میں محبوب صاحب کا دل خود نادرہ پر آ گیا تھا۔ وہ اُس کو بھی اپنے نکاح میں لینا چاہتے تھے۔ نادرہ دوسری عورت بن کر رہنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کا اعتراف اس نے موت سے چند سال قبل ایک ٹی۔ وی انٹرویو میں کیا تھا۔ محبوب صاحب کی شادی کے بارے میں کئی لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ بمبئی میں وارد ہونے سے پہلے اُنہوں نے گاؤں میں شادی کی تھی جس سے ایک بیٹا ہوا تھا۔ اس خبر کی تصدیق نہیں ہو پائی ہے۔ یہ تو سب لوگ جانتے ہیں کہ اُنہوں نے سردار اختر سے شادی کی تھی جس سے اُنکے تین بیٹے ہوئے۔ بڑے کا نام ایوب، منجھلے کا نام شوکت اور چھوٹے کا نام اقبال ہے۔ ایوب کا کئی سال پہلے انتقال ہو گیا۔ ایوب نے راحت نامی ایک ڈانسر سے شادی کی تھی جو زیادہ دنوں تک چلی نہیں۔

سائرہ بانو کا بھائی سلطان کا اپنی بہن کے ساتھ محبوب اسٹوڈیو آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اسی بیچ کب دونوں کی آنکھ لڑی، کب پیار پروان چڑھا، پتا ہی نہیں چلا۔ عقدہ تب کھلا جب بات بہت آگے بڑھی اور راحت نے ایوب خان سے طلاق لے کر سلطان سے نکاح کر لیا۔ سلطان بھائی سے شادی کرنے کے بعد اُسکے دو بچے ہوئے۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ آخری ایام میں وہ چلنے پھرنے سے معذور رہی اور اُسے ویل چیر پر ہی رہنا پڑتا تھا۔ ہم سب لوگ اُسے راحت بھابی کے نام سے بلاتے تھے۔ اقبال کی شادی دلیپ صاحب کی چھوٹی بہن سعیدہ خان سے ہوئی۔ اقبال خان بلا کے مے نوش تھے۔ اُن کی ازدواجی زندگی کافی تناؤ بھری رہی۔ سعیدہ کی زندگی میں کافی اُتار چڑھاو آئے۔ کئی بار تو معاملہ قابو سے باہر ہو گیا اور دلیپ صاحب کو مداخلت کرنا پڑی۔

محبوب صاحب کے کاروان کو اُنکے بچے آگے نہ لے جا سکے۔ آج محبوب صاحب کے ''محبوب اسٹوڈیو'' میں غلغلہ تو رہتا ہے مگر وہ آن بان شان دکھائی نہیں دیتی جو اس اسٹوڈیو کا طرہ امتیاز رہا ہے۔ محبوب صاحب کو ہم سے بچھڑے ایک زمانہ ہو چکا ہے مگر جب تک یہ دنیا قائم ہے محبوب صاحب کا نام ہمیشہ امر رہے گا۔

☆

بقیہ: جبینِ نیاز

Networt Administrator ہیں۔ اُس روز پیر کا دن تھا یعنی ورکنگ ڈے (**Working Day**)۔ وہ ہماری خاطر پہلے بھی اپنی کئی چھٹیاں خراب کر چکے تھے اور وقت بے وقت دن میں کئی کئی بار ہماری معاونت کے لیے حاضر رہتے تھے۔ لہٰذا میں نے انھیں کہا کہ ہمیں بارڈر تک جانے کے لیے ٹیکسی کا انتظام کروا دیجیے۔ لیکن وہ بضد تھے کہ نہیں ''میں خود آپ کو وہاں تک چھوڑ کر آؤں گا''۔ اُس پیارے عزیز کی اس محبت آمیز خواہش کے آگے ہمیں ہتھیار ڈالنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ لہٰذا ہم نے گیسٹ ہاؤس کا بل چکایا اور پھر دوپہر بارہ بجے کے قریب عزیزی شعیب کی کار میں اُن کے ساتھ واگھہ بارڈر کے لیے روانہ ہوئے۔

پاکستان بارڈر کے کسٹم آفس میں سعید صاحب سے ایک بار پھر ملاقات ہوئی۔ وہاں ضروری کاروائی سے فراغت پا کر گیٹ پر پہنچے تو سیکورٹی کے ایک جوان نے بتایا کہ وہاں ایک ملحقہ کمرے میں پاکستان کے کچھ ممنٹو و دیگر اشیاء دستیاب ہیں۔ ہمیں وہ دیکھنے کا اشتیاق ہوا اور اندر جا کر وہاں سے یادگار کے طور پر کچھ سامان خریدا اور پھر بھارت کی جانب کے گیٹ کے اندر داخل ہو کر متعلقہ دفتر میں اپنے پاسپورٹ دکھائے اور پھر یہاں کے کسٹم آفس میں پہنچے۔ میں نے قریب کی سٹیٹ بنک آف انڈیا کی ایک شاخ میں بچی ہوئی پاکستانی کرنسی واپس دے کر متبادلہ انڈین کرنسی حاصل کی۔ کسٹم کی کاروائی مکمل ہونے کے بعد ہم باہر آ گئے۔ دونوں ملکوں کے ان دفاتر کے عملے کا برتاؤ نہایت ہی پُر خلوص اور قابل تحسین تھا جسے دیکھ کر جی بہت خوش ہوا۔

باہر آ کر ہم نے امرتسر کے لیے ٹیکسی کی اور وہاں کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ کر میں نے اپنے لیے انبالہ کا اور اپنے دونوں رفیقان سفر کے لیے حصار کے دو ریل ٹکٹ خریدے۔ اپنا اپنا سامان اُٹھوا کر ہم اپنے اپنے متعلقہ پلیٹ فارموں پر آ گئے جہاں دونوں ٹرینیں (**Trains**) اپنے اپنے پلیٹ فارموں پر لگی ہوئی تھیں۔ باہم گلے ملنے کے بعد ہم اپنی اپنی سیٹوں پر جا بیٹھے۔ میری گاڑی سوا چار بجے چھوٹنے والی تھی جبکہ حصار کی ریل گاڑی رات کے سوا نو بجے روانہ ہونی تھی۔

اور اس طرح قریب دو ہفتے کے اس سفر کی بے شمار حسین یادیں اور نہایت خوش گوار تجربات اور محبتیں دامن میں سمیٹے ہوئے ہم اپنے اپنے گھروں کو لوٹ آئے۔

پاکستان کی اس مختصر سی سیاحت کے دوران جہاں جہاں بھی ہم لوگ گئے ہمارے تمام نادیدہ احباب کے علاوہ عوام نے بھی نہایت خندہ پیشانی سے ہمارا استقبال کیا، اپنے خلوص بیکراں، اپنی والہانہ محبت اور فراخ دلانہ میزبانی سے ہمیں اس قدر سرشار کیا کہ میں حیران ہوتا ہوں کہ تقسیم ملک کے وقت دونوں طرف وہ کون ظالم اور وحشی لوگ تھے جو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے اور جنھوں نے نہایت بے رحمی سے لاکھوں لوگوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا، عورتوں کی بے حرمتی کی اور معصوم بچوں تک کو نیزوں پر اُچھالا۔۔۔!!

مِٹھڑے یار میرے

فیض احمد فیض کی شاعری اُن کی فکر اور نظریے کا اظہار تھی جو کہ انہوں نے اردو زبان میں کی، لیکن تنویر ظہور جو کہ فیض احمد فیض کے مداحوں میں شمار ہوتے ہیں انہوں نے اردو کے ساتھ ساتھ فیض کی پنجابی زبان کے ساتھ وابستگی کو تلاش کر کے ایک شاندار ادبی کارنامہ سرانجام دیا ہے جو کہ پہلی مرتبہ کتابی شکل میں شائع ہو رہا ہے۔ تنویر ظہور نے ایک عالمگیر فیض احمد فیض کی پنجابی **Roots** تلاش کر کے تحقیق میں ایک منفرد کام کیا ہے مجھے یقین ہے کہ فضاؤں میں گھومتی فیض احمد فیض کی روح اپنے مداح تنویر ظہور کے لیے مسکراہٹوں کے ساتھ شاعری کے نگینے بکھیر رہی ہو گی۔ نمونے کے طور پر فیض احمد فیض کا پنجابی کلام پیشِ خدمت ہے............ **فرخ سہیل گوئندی** (لاہور)

پنجابی غزل

لمّی رات سی درد فراق والی
تیرے قول تے اساں وساہ کر کے
کوڑا گھٹ کیتی مِٹھڑے یار میرے
مِٹھڑے یار میرے، جانی یار میرے
تیرے قول تے اساں وساہ کر کے
جھانجراں وانگ، زنجیراں چھنکائیاں نیں،
کدی کنّیں مُندراں پائیاں نیں،
کدی پَیریں بیڑیاں چائیاں نیں،
تیری تاہنگ وِچ پٹ دا ماس دے کے
اساں کاک سدّے، اساں سینھ گھلّے
رات مُکدی اے، یار آوندا اے
اسیں تک دے رہے ہزار ولّے
کوئی آیا نہ بِناں ہُتامیاں دے
کوئی پُجّا نہ سِوا الاہمیاں دے
اج لاہ الاہے مِٹھڑے یار میرے
اج آ ویہڑے وچھڑے یار میرے
فجر ہووے تے آکھئے بسم اللہ
اج دولتاں ساڈے گھر آئیاں نیں
جیہدے قول تے اساں وساہ کیتا
اوہنے اوڑک توڑ نبھائیاں نیں

ربّا سچّیا

ربّا سچّیا توں تے آکھیا سی
جا اوئے بندیا جگ دا شاہ ہیں توں
ساڈیاں نعمتاں تیریاں دولتاں نیں،
ساڈا نیب تے عالیجاہ ہیں توں،
ایس لارے تے ٹور کد پچھیا ای
کیہہ ایس نمانے تے بیتیاں نیں
کدی سار وی لئی اُو ربّ سائیاں
تیرے شاہ نال جگ کیہہ کیتیاں نیں
کتے دھونس پولیس سرکار دی اے
کتے دھاندلی مال پٹوار دی اے
اینویں ہڈّ اس چ کلپے جان میری
جیویں پھاہی چ کونج کُرلاوندی اے
چنگا شاہ بنایا ای رب سائیاں
پولے کھاندیاں وار نہ آوندی اے
مینوں شاہی نئیں چاہیدی رب میرے
میں تے عزّت دا ٹکّر منگناں ہاں
مینوں تاہنگ نئیں، محلاں ماڑیاں دی
میں تے جیونیں دی نکّر منگناں ہاں
میری منّیں تے تیریاں میں مناں
تیری سونہہ جے اک وی گل موڑاں
جے ایہہ منگ نہیں پجدی تیں ربا!
فِر وی جاواں تے رب کوئی ہور لوڑاں؟

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وقار جاوید (راولپنڈی)

جنابِ گلزار جاوید صاحب! تسلیمات۔
کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ ہم اظہار کے لیے موزوں الفاظ تلاش کرتے رہ جاتے ہیں لیکن کامیاب نہیں ہو پاتے...... ''شکریہ''...... یہ ایک ایسا لفظ ہے جو صرف رسمی ہو کر رہ گیا ہے۔ جو اکثر جذبات سے عاری اور مشینی ہوتا ہے۔ اس لیے آپ کی نوازش کے لیے یہ لفظ کہنا آپ کے بے بہا خلوص کے ساتھ بے انصافی ہوگی۔ کبھی کچھ بھی نہیں کہہ کر بہت کچھ کہہ دیا جاتا ہے۔ اس لیے آپ کی عنایت کے لیے میں جو کچھ نہیں کہہ رہی ہوں اُمید ہے آپ وہ سب کچھ سن لینگے۔ اس اعزاز کے ساتھ آپ نے مجھ ناچیز کو چہارسو پہنچا دیا ہے۔ کئی فون اور ای میلس آ چکے ہیں۔ اس شمارے نے کچھ پرانی یادیں تازہ کر دیں جب برسوں پہلے جناب ضمیر جعفری صاحب وِنی پیگ (کینیڈا) تشریف لائے تھے ایک بین الاقوامی مشاعرے میں جس میں سحاب قزلباش صاحبہ اور خمار بارہ بنکوی صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ ضمیر جعفری صاحب کو میرا یہ شعر بہت پسند آیا تھا۔

کسے خبر تھی کہ پھولوں میں بھی ہنر ہے وہی
کس احتیاط سے کانٹوں سے بچ کے آئے تھے۔

اس موقعے کا ویڈیو آج بھی میرے پاس محفوظ ہے جو میرے لیے بہت قیمتی ہے۔ چند ماہ قبل جب آپ نے مجھ سے سوال نامے کا ذکر کیا تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ آپ مجھ پر یہ کرم فرمانے جا رہے ہیں۔ کیونکہ آپ نے اس کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا۔ دراصل آپ کی شخصیت (اردو دنیا میں) بہت غیر معمولی ہے بلکہ حیران کن۔ نہ رسالے کی کوئی قیمت نہ زرِ سالانہ اور دنیا کے ہر کونے میں ڈاک کے بے رحم اخراجات برداشت کر کے بھیجنا۔ اُردو کے لیے آپ کے یہ بے لوث جذبے، یہ لگن قابلِ ستائش ہیں۔ قرطاس اعزاز جدت سے بھرپور آپ کا انوکھا انداز ہے۔ سرورق کی تصاویر کا انتخاب میرے لیے بہت اہم اور یادگار ہے۔ Back Cover پر میری مصوری کی ترتیب بھی آپ نے خوبصورتی کے ساتھ دی ہے۔ خاص کر آپ کے بے لاگ سوالات جنھوں نے اُردو دنیا کے متعلق میری معلومات میں اہم اضافے کیے۔ آپ کے چند سوالات نے مجھے ایک بہت پرانی بات یاد دلا دی کہ اُردو کے ایک بہت معتبر شاعر، نقاد اور دانشور سے اُردو دنیا میں بے ادبی پر گفتگو ہو رہی تھی۔ جب میں نے اُن سے کہا کہ یہ ''بازیچۂ اطفال'' ہے تو اُن کا جواب تھا کہ ''بازیچۂ اطفال'' میں تو معصومیت ہوتی ہے دراصل یہ بازیچۂ مکّار ہے۔ آپ کی ممنون ہوں کہ آپ کے چند سوالات نے مجھے اردو دنیا کی کچھ ذہنی پستیوں سے روشناس کیا ہے۔ خوشی ہوتی ہے کہ ''چہارسو'' میں کتابت کی غلطیاں نہیں ہوتیں لیکن بے عیب تو صرف اللہ کی ذات ہے۔ برائے نام غلطیاں پھر بھی در آئی ہیں۔
زیرِ نظر شمارے کے تمام مشمولات بالخصوص افسانے بہت عمدہ لگے۔ روبینہ ناز کا افسانہ ''شہر ناپرساں'' بھی لاجواب ہے۔ ہر چند سرمایۂ جاں نے متاثر کیا ہے مگر میرے دل اور دماغ پر آپ کا مختصر ناولٹ ''فلم باقی ہے ابھی'' نقش ہو کر رہ گیا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ شاید ہی کسی اہلِ قلم نے اپنی مرحوم شریک حیات کو اس طرح سے خراجِ عقیدت پیش کیا ہو جس نے بے شمار لوگوں کو رونے پر مجبور کیا ہے۔

پروین شیر (کینیڈا)

جنابِ گلزار جاوید! اسلام علیکم۔
تازہ شمارہ ''چہارسو'' موصول ہوا۔ آپ بھی قرطاسِ اعزاز کے لیے کیسے کیسے لوگ تلاش کرتے ہیں جن کو معلوم کر کے پڑھ کر جی خوش بھی ہوتا ہے اور حیران بھی۔ ویسے پروین شیر کے علاوہ جو کچھ ''چہارسو'' میں ہے وہ تمام کا تمام خوب ہے بس ایک میری غزل نظرِ بد کے طور پر ہے اسے نہ بھی شامل کرتے تب بھی چہارسو میرے لیے اُتنا اہم اور خاص ہوتا جتنا اب ہے۔ خوش رہو اور اردو ادب کو اسی طرح باغ و بہار بنائے رکھو۔

مشکور حسین یاد (لاہور)

عزیز و مکرم گلزار جاوید صاحب! سلامِ شوق۔
اب کیا کیا جائے۔ محاورہ تو چھپا رستم ڈھونڈ نکالنے سے تعلق رکھتا ہے۔ آپ نے چھپی شیرنی ڈھونڈ نکالی۔ محاورہ غلط ہو گیا، کوئی مضائقہ نہیں۔ آخر کچھ ہاتھ تو آیاں ناں۔ یہ پروین شیر بلکہ شیرنی کہاں سے تلاش کر لی۔ آپ کے مجلّے میں اُن کی شاعری دیکھی تو کچھ اجلی اجلی سی لگی۔ دعا ہے کہ اُن کا مطالعہ ان کی شاعری کے مزید نکھار کا باعث بنے۔ آپ کا ''براہِ راست'' حسبِ معمول بڑے سلیقے سے مرتب کیا ہوا پایا۔ آپ کے اس فن پر بھی لکھنے کے لیے کسی چھپے رستم یا چھپے شیر کو تلاش کرنا پڑے گا۔ یہ فن بہت دھیرے دھیرے آگے بڑھتا ہے۔ پھر جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا کے کرتب دکھاتا بخیر و خوبی انجام پذیر ہوتا ہے۔ بعض مقامات ایسے بھی آتے ہیں کہ لگتا ہے کہ ابھی پانی پت کا میدان گرم ہوا کہ ہوا مگر اگلے ہی لمحے آپ مشّاق شمشیر زن کی طرح وار بچا کر بیک وقت یمین و یسار پر حملہ آور ہو جاتے ہیں۔ پھر بھی ''آپ کا خدا ہی حافظ'' کہنے کو جی چاہتا ہے کہ مدِ مقابل۔۔۔ لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں۔
مجھے پروین شیر کے مصوری کے چاروں نمونے زیادہ پُرکشش لگے۔ اُن کے رنگوں اور خطوط میں بہت اعتماد نظر آیا۔ اُن کا کینوس کشادہ دلی کا غمّاز دکھائی دیا۔ موضوع میں گہرائی بھی ہے اور وسعت بھی۔ اور اظہار میں

نفاست۔ بہ حیثیت مجموعی اُن کی مصوری اُن کی شاعری پر چھائی ہوئی ہے۔ بڑی شاعری کے لیے انتظار کرنا چاہیے۔ وی شانتارام پر دیپک کنول کا مضمون بہت اچھا لگا۔ وہ ہمارے ہی سینئر معاصرین میں سے تھا۔ قیامِ پاکستان سے پہلے کی بنائی ہوئی اس کی کم وبیش فلمیں میری دیکھی ہوئی ہیں۔ ''ڈاکٹر کوٹنیس کی امر کہانی'' اور ''شکنتلا'' تو میرے پاس آڈیو ویڈیو کیسٹ میں اب بھی موجود ہیں۔ ''دو آنکھیں بارہ ہاتھ'' سے محروم ہوں۔ شری کرشن کمار طور توجہ فرمائیں تو شاید بات بن جائے۔ میرے پاس پرانی منتخب فلموں کا ایک اچھا ذخیرہ موجود ہے۔ ''شکنتلا'' تو فلم نہیں، شاعری ہے جو سلولائیڈ پر اتر آئی ہے۔ دلّی میں نند کشور وکرم بھی تو موجود ہیں جو ''نیشنل آرکائیوز'' سے رجوع کر سکتے ہیں۔ وہ یوں یاد آئے کہ اُنھوں نے ایک بار مجھ سے اکبر حمیدی کی معرفت میرے مقالے ''پوٹھوہار، تاریخ وثقافت'' کی نقل منگوائی تھی۔ جانے یہ اُن تک پہنچی یا نہیں۔ مذکورہ مقالہ فنون (۱۹۹۰ء) میں شائع ہوا تھا۔ بعد میں انہوں نے اسے اپنی کتاب ''دلائل'' مطبوعہ سنگِ میل (۱۹۹۳ء) لاہور میں بھی شامل کر لیا تھا۔ دیپک کنول صاحب کو ہم ''بابوں'' کی یادیں تازہ کرتے رہنا چاہیے اور گلزار جاوید صاحب کو ہماری یادیں گلزار بنانے پر تھا پڑا۔

امین راحت چغتائی (راولپنڈی)

میرے گلزار، خوش رہو۔

سالِ نو کا اولیں شمارہ بابت ماہ جنوری فروری ۲۰۱۱ء باصرہ نواز ہوا اور چہارسو کی اعزاز کی قرطاس پر ایک اور ستارہ روشن ہوا۔ پروین شیر چہارسو کی گرفت میں، عظمیٰ صدیقی کی ''اب کے برس'' خوب آس واُمید لیے بھرپور نظم ہے اور نذیر فتح پوری کی ''دعا دیوانگی'' پروین شیر کے اعزاز میں خوب ہے۔ پروین کا آئینہ زیست سے نگاہ ہٹی تو آپ کے براہِ راست میں ایسے آ گھیرا کہ اُس پر ایک خوبصورت افسانے کا گمان ہونے لگا۔ آپ کے سوالات اور پروین شیر کے جوابات ایک ایسے خوبصورت سفر پر لے گئے جس کو پڑھ کر جی بے حد خوش ہوا اور جب فاری شانے اُن کے کلام سے روشناس کروایا تو جی اور خوش ہوا۔

ہے آسیبوں کا سایہ جہاں میں ہوں
شبِ دشتِ بلا میں بے اماں میں ہوں
ازل سے تابہ ابد سب کے سب اکیلے ہیں
تو پھر کس لئے یہ زندگی کے میلے ہیں
کہیں ہیں ٹوٹے کھلونے کہیں جلے بستے
ستم گروہ نے یہ کیسے کھیل کھیلے ہیں

ایک ایک شعر حالاتِ زندگی کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔ کہاں تک ذکر کروں۔ وارث علوی صاحب کا مضمون ''سرنگوں گنبد ومحراب'' کے زیر بچوں کے نام نظم اپنے اندر کتنا درد سمیٹے ہے۔ ستیہ پال آنند کا نہالِ دل پر سحاب جیسے، انور سدید کا کٹھن راہوں پر چلنے کا ہنر، پروفیسر رئیس قمر کا دیواریں حائل ہو رہی ہیں اور عبداللہ جاوید کا اب کسی سے محبت نہ کرنا پسند آئے۔ پروین شیر کا افسانہ نیلا لفاف دیر تک ذہن پر چھایا رہا۔ رخشندہ روحی کا ''قوسِ قزاح'' نے اپنا خزانہ لٹا دیا ''خوابوں کے پھندے'' کنیز نبوی پسند آئے اور آپ کا سرمایۂ جاں گو اس مرتبہ اپنی روش سے ہٹ کر ہے مگر آخری فقرہ مزہ دے گیا۔ حسن جس رنگ میں ہوتا ہے جہاں ہوتا ہے سوائے تازہ مٹی کے ڈھیر کے۔ اہل دل کے لیے سرمایۂ جاں ہوتا ہے۔ جتندر پرواز کا ''دُکھوں کا گھر'' اور پروفیسر خیال آفاقی کی غزل کے تمام تر اشعار پسند آئے اور اُن کی نظم جاں سوز بھی خوب ہے۔ کرشن گوتم کے ماہیے خوب ہیں اور دیپک کنول کا وی شانتارام پر تفصیل سے مضمون دلچسپ ہے۔ یہ سلسلہ آپ نے اچھا شروع کیا ہے اور اس مرتبہ سرورق کی پشت پر پروین شیر کی پینٹنگ کی اضافت بھی خوب رہی۔

یوگیندر بہل تشنہ (دہلی، بھارت)

برادرِ عزیز گلزار جاوید، محبتیں۔

''چہارسو'' کا تازہ ترین شمارہ نظر نواز ہوا۔ پروین شیر پر آپکا ترتیب دیا ہوا قرطاس اعزاز نہایت متاثر کن اور دلنواز ہے۔ پروین صاحبہ کی شخصیت اور فن ہی ایسا ہے کہ ان کے لئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ

رنگ باتیں کریں اور باتوں سے خوشبو آئے

انکی سوانحی گفتگو سے انکی زبان کی فصاحت، انکے خیالات کی پاکیزگی اور انکے فن کی رنگینی عیاں ہے۔ آپ نے اس سلسلے میں اپنا فرض خوب نبھایا اور ہم جیسے قارئین کو ان سے متعارف ہونے کا اہم اور قیمتی موقعہ فراہم کیا۔ پروین صاحبہ گزشتہ دنوں اردو مرکز کی دعوت پر لاس انجلز تشریف لائی تھیں اور اگرچہ میں ان محافل میں ہمیشہ سرگرمی سے شرکت کرتا ہوں مگر ان دنوں میں شہر سے باہر تھا اس لئے میں ان سے بالمشافہ ملاقات کرنے سے محروم رہا۔

چہارسو کے تمام مشمولات اعلیٰ معیار کے حامل ہیں اس لئے الگ الگ ہر تحریر پر اظہار ممکن نہیں پھر بھی افسانوں کے سیکشن میں مجھے شہناز خانم عابدی کے ''مکافات'' نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ یہ موجودہ حالات، یعنی پاکستان میں سیلاب کی تباہ کاریوں اور اس حوالے سے چند خبروں پر مبنی ایک بیحد متاثر کن تحریر ہے۔ اس کے علاوہ میرے خیال میں اس موضوع پر اردو کے کسی بھی جریدے میں شائع ہونے والی یہ پہلی کہانی ہے۔ میں چونکہ سندھ میں رہا ہوں اس لئے کہہ سکتا ہوں کہ اسکا پس منظر بھی انہوں نے خوب بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ نثار احمد صدیقی کا epitaph بھی اچھی تاثراتی تحریر ہے۔ کنیز نبوی کا ''خوابوں کے پھندے'' کا مرکزی خیال روائیتی ہے مگر انکا انداز بیان زوردار ہے۔ آپکا افسانہ ''سرمایہ جاں'' نے تو مزہ باندھ دیا۔ پہلے تو کیا چٹخارے لیتی زبان اور پھر نسوانی حسن کی کیا منظر نگاری۔ واللہ آپ نے تو واجدہ تبسم کی یاد تازہ کر دی۔ پھر زبان اس قدر رواں اور اس میں ان الفاظ کا استعمال (لونڈے لپاڑے) کہ ایسی 'دہلوی زبان' اب کہاں سننے یا پڑھنے کو ملتی ہے۔ اس

کے باوجود اس کہانی کا انجام بہت ہی چونکا دینے والا ہے اور اس کو پڑھ کر زندگی کی بے ثباتی اور انسان کے فانی ہونے کا تصور روح کو جھنجوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ بقول شاعر

موت کی پر زور آندھی جب اس سے ٹکرائے گی
یہ عمارت ٹوٹ کر پھر خاک میں مل جائیگی

شاعری کا حصہ بھی تسکین ذوق کا باعث ہوا۔ پروفیسر خیال آفاقی کی نظم نغمہ جاں سوز نے دل پر بہت اثر کیا۔ دیگر اشعار جو مجھے اچھے لگے۔۔

شگفتہ نازلی

دوسری جانب کوئی آسودہ سی دستک تو ہو
ورنہ کھڑکی کھول نے کو ایک لمحہ چاہیئے

سیفی سرونجی

سینکڑوں حادثے سڑکوں پہ ہوا کرتے ہیں
اب کسی موت پہ حیرت نہیں کرتا کوئی

مسجدیں شہر کی دن رات بھری رہتی ہیں
یہ الگ بات عبادت نہیں کرتا کوئی

مہندر پرتاب چاند

لاتی ہے کیا پیام نیا، دیکھئے، سحر
وحشت سی دل پہ چھائی رہی ہے تمام رات

جیفری ڈیور کی ایک طویل کہانی کو ثمینہ فرخ نے اردو کا روپ دیا ہے۔ یہ کہانی میری پڑھی ہوئی ہے۔ نہ صرف اسکا پلاٹ بہت پیچیدہ ہے بلکہ اسکی زبان بھی بہت مشکل ہے۔ یہ ایک محنت طلب کام تھا جو انہوں نے خوب نبھایا۔ نفسیاتی پس منظر میں جرم کی یہ کہانی دلچسپ لگی۔ میں اپنی سرگزشت کے متعلق کیا عرض کروں۔ آپ نے ایک ناچیز و گمنام شخصیت کو یہ اعزاز دیا ہے جس کے لئے میں ممنون ہو مگر اس سے بھی زیادہ میں ان قارئین کا شکر گذار ہوں جنکا دنیائے ادب میں اپنا ایک مقام ہے اور وہ میری اس کاوش کو قابل توجہ سمجھتے ہوئے اس پر تبصرے کر رہے ہیں میں اسکو اپنی عین خوش قسمتی سمجھتا ہوں۔

آخیر میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ ایک اعلیٰ ادبی جریدے میں مجھے سندھ کے چھوٹے شہروں، سکھر، میر پور خاص اور ٹنڈو آدم کے قلمکاروں کی تخلیقات دیکھ کر بے پایاں خوشی ہوتی ہے اس لئے کہ مجھے ایسا لگتا تھا کہ پاکستان کے تمام رسالے تحریر کی اپنی خصوصیت دیکھنے کے بجائے اس بنا پر اسکو شائع کرتے تھے کہ وہ کس ''بڑے شہر'' سے آئی ہے۔ یہ کریڈٹ بھی آپ کو جاتا ہے۔

فیروز عالم (یو۔ایس۔اے)

پیارے ''چہارسوٗ'' السلام علیکم۔

رسالہ چہارسو بہار ہی بہار ہے۔ اس میں پیارے پیارے بول سبھی بولتے ہیں آپ بھی جانتے ہیں۔ نظم (غزل بھی) افسانہ، مضمون اپنی اپنی جگہ خوب در خوب ہیں۔ رسالہ کا انتظار کرنا پڑتا ہے آپ کا بھلا ہوا انتظار رائیگاں نہیں جاتا۔ ''رس رابطے'' میں اب کے پھر پروین کمار اشک نے مجھے نوازا ہے ان کی محبتوں کا جواب نہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ دھرم شالہ (بھارت) سے کرشن کمار طور نے اپنا رسالہ ''سرسبز'' مجھے بھجوایا ہے۔ میرا ایڈریس انہیں کسی ڈائریکٹری سے ملا تھا، میں نے انھیں لفافہ بھجوایا ہے جس میں کلام بھی ہے اور ایک طویل خط بھی۔ لفافے میں ہزارے کے ملکی سطح پر نامور شعراء سلطان سکون اور امتیاز الحق امتیاز کی غزلیں بھی ڈالیں ہیں۔ تعجب ہے آپ ''دل مضطرب نگاہِ شفیقانہ'' ہی پر البتہ آمین کر لیتے ہیں۔ اسی پر بس نہیں آپ بسم اللہ کے گنبد سے نکلی ہوئی اخلاص میں ڈھلی ڈھلائی چیزیں بھی پیش کرتے ہیں۔ پروین شیر کا نام تو بہت سنا ہے۔ چہارسو میں ان کے ادبی اطراف واضح ہوئے۔ وہ شعر و نثر کی بلند پایہ مصوّر ہیں۔ ''چہارسوٗ'' کا جان پہچان کا یہ سلسلہ بہت پسند کیا جاتا ہے۔ آپ اسے بہار نے سنوارنے میں اپنی سی کر دیکھتے ہیں۔

آصف ثاقب (ایبٹ آباد)

جناب گلزار جاوید صاحب' السلام علیکم۔

چہارسو کا تازہ شمارہ جنوری فروری مل گیا۔ آپ کی اس کرم فرمائی کے لیے بے حد ممنون ہوں۔ چہارسو اردو ادب کے ان پرچوں میں ہے جو ادب کی نمائندگی کے اہل ہیں۔ حیرت کے ساتھ خوشی بھی ہوتی ہے کہ اس قدر کم وقت میں آپ یہ خاص نمبر کس طرح نکال لیتے ہیں۔ یہ نمبر نہیں کتاب کی صورت ہے۔ آپ کی یہ خدمت ادب کے باب میں ریکارڈ کی حیثیت رکھتی ہے۔ سید ضمیر جعفری ہوتے تو کس قدر خوش ہوتے۔ بیار ہوں لکھنا پڑھنا اب واجبی سا رہ گیا۔ پڑھنے کے بعد مضامین کے بارے میں اپنی رائے لکھوں گا۔ انشاءاللہ

حسرت کاسگنجوی (حیدرآباد)

برادرِ عزیز' السلام علیکم۔

''چہارسوٗ'' کا تازہ شمارہ پڑھ لیا۔ ابتداء میں عظمیٰ صدیقی نے ''اب کے برس'' کے تحت جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان خیالات کو اس سال بخیر و خوبی پورا کر دے۔ آمین۔ آپ کے ''براہ راست'' کا جواب نہیں۔ ہر بار ایک کامل تحریر پڑھنے کو ملتی ہے۔ بھائی! کبھی کبھار کسی پاکستانی کو بھی نشانے پر لے لیا کریں۔ شریف کنجاہی والے شمارے کے بارے عرض کی تھی۔ عطیہ سکندر علی نے ''حوصلوں کا امتحاں'' کے تحت اچھے خیالات جمع کئے ہیں۔ امین راحت چغتائی کی نعت بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ افسانے سارے ہی اچھے ہیں بہر حال کنیز نبوی کا ''خوابوں کے پھندے'' اور گلزار جاوید کا سرمایۂ جاں دل کو اچھے لگے۔ غزلوں کے چند اشعار۔

مگر یہ کیا کہ اندھیرے سے مطمئن تھے سبھی
اگرچہ جو بھی ملا، روشنی کا قائل تھا

امین راحت چغتائی

مِرے دل کی لگی سے باخبر کیسے کوئی ہوگا
میں ظاہر خود پہ بھی اپنا بھرم ہونے نہیں دیتا

سرور انبالوی

لفظ دیتے ہیں اگر کرب عذابوں کے سوا
مِرے کمرے میں دھرا کیا ہے کتابوں کے سوا

آصف ثاقب

لفظ بکھرے ہوئے ہیں پھولوں پر
آؤ دیکھیں کتاب کا موسم

پروفیسر زہیر کنجاہی (راولپنڈی)

گلزار بھائی، آداب۔

ہمیشہ پہلے چہارسو شروع سے لے کر آخر تک دیکھتی ہوں پھر پڑھتی ہوں۔اس بار نجانے کیا ہوا کہ چشمِ حیراں عنوان دیکھ کر اتنا متاثر ہوئی کہ پڑھنا شروع کر دیا پھر آئینۂ زیست نے آگے نہیں پڑھنے دیا۔اسے پڑھا تو براہِ راست نے جکڑ لیا اور آپ یقین مانیں کہ انٹرویو ابھی تھوڑا سا پڑھنا باقی ہے مگر مجھ میں اتنا صبر نہیں کہ میں پیر تک انتظار کروں یہ کہنے کے لیے کہ آپ نے محترمہ پروین شیر پر گوشہ نکال کر بہت بڑھیا کام کیا ہے۔وہ multi dimensional خوبیوں کی مالک ہیں۔شاعرہ، مصورہ اور موسیقار سب خوبیاں ایک میں اور انہوں نے کتنے خوبصورت انداز سے سوالوں کے جواب دیے ہیں، نثر میں شاعری ہے۔ہر لائن موسیقی اور غزل لگ رہی ہے۔اندازِ بیان نے ان کی خوبصورتی اور محبت کو لے کر جو تصویر کشی کی ہے اس سے میں بے حد متاثر ہوئی ہوں۔قدرت پسند، حسّاس دل عورت یقیناً بہت اچھی انسان بھی ہوں گی۔ایڈیٹر کو صرف شکریہ کرنا ہے (بھائی کو نہیں)۔

رینو بہل (چندی گڑھ بھارت)

برادرِ عزیز و مکرّم، تسلیم و نیاز۔

"چہارسُو" ملا۔تشکّر۔مدیر، نقّاد اور قاری سے بچنا مشکل امر ہے۔ لیکن دیکھا گیا ہے کہ ان سب پر بھاری مدیر ہی ہوتا ہے کہ اُسکی اجازت کے بغیر تو اسکے رسالے میں چڑیا بھی "چُوں" نہیں کر سکتی۔ہماری اُردو زبان کے بانی اور خالق تمام کے تمام مسلمان تھے جن کی تقلید میں ہندو، سکھ اور دیگر مذہبوں کے لوگوں نے اُردو میں بہترین تخلیق کاری کی۔میں یہاں نام نہیں لُوں گا کیونکہ خط طوالت کا شکار ہو جائے گا۔پھر مذہبی نفرت کی ایسی ہوا چلی کہ اُس نے انڈیا میں ہندی کو رائج کر کے اُردو کو دیس نکالا دے دیا۔ہندوستانی فلموں کے گیت، مکالمے، کہانی نویس جس مذہب سے بھی تعلق رکھتے تھے لیکن انہوں نے ادب عالیہ پیدا کیا۔اب تو ادبِ عالیہ (ہندوستانی) اداکاروں کے ساتھ عریاں تر ہوتا جا رہا ہے۔درست لفظ ہے "جناب" یہ مردوزن کے نام سے قبل اسی طرح رائج ہے۔"جنابہ" کے معنی ایک حمل سے دو بچے۔اسی طرح "شبنمیں" درست ہے "شبنمی" غلط ہے۔ہاں لکھنؤ والے گرمیوں میں اپنی چارپائیوں کے اوپر شبنم سے بچاؤ کے لیے ایک کپڑا تان لیتے ہیں اسکو بھی "شبنمی" کہتے ہیں۔لیکن "شبنمی" یعنی "شبنمیں" غلط ہے۔والد مرحوم (فضا جالندھری) کی ٹانگیں دبایا کرتا تھا تو وہ اُردو کے ایسے ایسے الفاظ سے آگاہی عطا فرماتے تھے کہ آج کے استاد تو بالکل کورے ہیں۔اسی طرح "مشکور" کی بجائے "ممنون" درست ہے۔پروین شیر کے ساتھ "شیر" بڑا خونخوار جوڑ ہے۔بہرحال اُن کے بارے میں جان کر بے حد خوشی ہوئی۔آپ نے بہت اچھا کیا جو اُن پر نظم اُن کی زندگی ہی میں شائع کر دی۔نجانے مدیران کیوں کسی کہنہ مشق شاعر یا ادیب پر نظم کے لئے مَرنے سے کیوں بدکتے ہیں جبکہ پاکستان میں زندہ پر P.H.D کا قانون ہی بہت تاخیر سے بنا۔"چہارسو" آپ کی مدیرانہ شبنم میں واقعی "شبستان" نظر آتا ہے۔

سید ضیا شبنمی (ملتان)

محترمی گلزار جاوید! تسلیمات۔

آپ کی عنایت سے "چہارسو" کا تازہ شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے۔ قرطاسِ اعزاز کی سج دھج آنکھوں کو خیرہ کرتی ہیں۔اس مرتبہ آپ نے ایک ایسی شخصیت کا تعارف پیش کیا ہے جنہوں نے فنون لطیفہ کے تین شاخوں پر اپنا آشیانہ بنایا ہے۔اردو زبان میں شاید اس کی مثال پیش جاسکے۔ان کے متعلق مشاہیر کی آراء سے جو تصویر میرے ذہن میں ابھرتی ہے۔کچھ یوں ہے:

قلم + موئے قلم + ساز = پروین شیر
حرف + رنگ + صوت = پروین شیر
شاعر کا دل + مصور کی آنکھ + مطربہ کے ہاتھ = پروین شیر

شہناز خانم عابدی کا افسانہ "مکافات" ہمیں حسبِ حال لگا۔محبت کی کسک لیے نثار احمد صدیقی کا افسانہ "اپی ٹاف" ہر انسان کے اندر ایک "نثار بھائی" چھپا ہوتا ہے۔حسن پرستی انسان کی جبلت میں ہے۔اس کے اظہار کے طریقے مختلف ہوتے ہیں۔آپ کا افسانہ "سرمایۂ جاں" اسی اظہار کی کہانی ہے۔ ثمینہ فرخ کا ترجمہ "برائے پیش کردہ خدمات" عورت کی وہ کہانی ہے کہ جس کی حقیقت کی تلاش میں پیاز کے پرتوں کے سوا کچھ بھی ہاتھ نہیں آتا۔پروفیسر خیال آفاقی کی نظم اور غزل دونوں خوب ہیں۔اس کے علاوہ "شانِ بھارتی" کی غزل بھی پسند آئی۔غالب عرفان کا دلیپ کمار کو خراجِ تحسین قابلِ قدر ہے۔

نجیب عمر (کراچی)

مدیر محترم، سلام و رحمت۔

"سالِ نَو" کی شروعات ادبی تناظر میں اسلئے خوشگوار لگیں کہ بہت دنوں بعد کسی خاتون کے لیے "قرطاسِ اعزاز" مختص ہوا۔پروین صاحبہ سے کچھ کچھ شناسائی "دنیائے ادب" کے توسط سے تھی اور حسنِ اتفاق کہ اوجِ کمال صاحب کا "تقریب رُونمائی ایڈیشن ۲۰۱۰ء ابوظہبی" بھی "چہارسو" کے ساتھ ہی

موصول ہوا۔ پروین صاحبہ کی سہ پہلو شخصیت (جو شخصی شعور کے ساتھ موسیقی سے بھی ہم آہنگ ہیں اور مصورانہ شناسائی بھی رکھتی ہیں) کا اعتراف وادراک سبھی دانشوروں ونقادوں نے اپنے اپنے اسلوب میں بہت خوب کیا ہے۔ ''براہ راست'' میں آپ کے اٹھائے گئے نکات وسوالات بہت برجستہ و برمحل تھے سچ تو یہ ہے کہ انٹرویو کے انداز کو آپ نے تیکھے زاویوں اور انوکھی جہتوں سے متصف کر کے منفرد و ممیّز شناخت واہمیت دی ہے۔ ''نیلا لفاف'' میں نریندر کے پتے کا پہلو تشنہ نہیں ہوتا تو بیانیے کا تاثر مزید ہوتا۔ غلام عباس صاحب کا ''کتبہ'' ہو یا نثار احمد صدیقی صاحب کا ''اپی ٹاف'' مختلف ومتضاد منظر وپس منظر کے باوجود بھی اپنے حزنیہ مرکزی موضوع پہ ماہرانہ گرفت ملول ورنجور کرتی ہے۔ نثار بھائی کے کردار کو حرف حرف رنگ وبو سے اُس ندرت ونفاست سے تخلیق کیا گیا ہے کہ تازہ مٹی کا ڈھیر ''ہو کے بھی دوسروں کے لئے سرمایۂ جاں'' بنے رہے۔ اقراء دلچسپ وعجیب مگر معلومات افزاء رہا۔ ''شام تجھے سلام'' اپنے تمام تر معنوی اوصاف کے ساتھ لائق مطالعہ سفرنامہ لگا۔ محسن تیرے بغیر پشاور اُداس ہے۔ سراپا تخلیقیت۔ یوسفِ ثانی، منظوم خراج تحسین ہماری خوب صورت تہذیبی وثقافتی روایات کے عکاس ہیں۔ نغمۂ جاں سوز، تیری آنکھ کھلنے والی ہے، ماہیے، بھری دوپہر، گیت، میں کہاں ہوں۔ جملہ شعری تخلیقات کے متنوع ذائقوں نے لطفِ مطالعہ دوبالا کیا۔ لسان العصر اکبرالہٰ آبادی شاعرانہ آفاقی سچائیوں کے ساتھ دورِ حاضر پہ بھی منطبق محسوس ہوتے ہیں۔

شگفتہ نازلی (لاہور)

بھائی گلزار جاوید' السلام علیکم۔

''چہارسُو'' کا نومبر دسمبر کا شمارہ (اپنی تمام تر ادبی خوبیوں سے مزّین) ملا۔ قرطاس اعزاز پروین شیر کو عطا کیا ہے۔ براہِ راست میں آپ کے سوالات اور محترمہ پروین شیر کے تفصیلی دلچسپ جوابات نے خاصا محظوظ کیا کچھ باتوں سے اختلاف کے باوجود اُن کی گفتگو میں ادب کا گہرا مطالعہ زبان کی نزاکتیں اور الفاظ کے استعمال نے اپنی گرفت میں لیے رکھا۔

گلزار بھائی آپ نے ''سرمایہ جاں'' میں ''نثار بھائی'' کا بڑی مہارت سے خاکہ کھینچا ہے اس کے اختتام نے اسے ایک اچھے افسانے میں تبدیل کر دیا ہے آپ نے نثار بھائی کا کردار اتنا خوبصورت پینٹ کیا ہے کہ لگتا ہے کہ یہ کردار آپ کے آس پاس کوئی حقیقی کردار رہا ہے۔ اگر آپ اپنے قریبی اور اہم دوستوں کے خاکے تحریر کریں تو کیا بات ہے۔ ''شہرِ ناپرساں'' ایک اچھا علامتی افسانہ ہے یہ ہمارے سماجی وسیاسی حالات کا عکس ہے۔ روبینہ ناز میں اچھا لکھنے کی بہت صلاحیت ہے مگر اب اس انداز کے افسانوں کا وقت گذر چکا ہے۔ کنیز نبوی کی کہانی ''خوابوں کے پھندے'' جاگیردارانہ سوچ اور جبر کی تصویر پیش کرتی ہے۔ وڈیروں، چودھریوں اور سرداروں کی حویلیوں میں ایسا ہونا کوئی نئی بات نہیں۔ ''کامی'' کا کردار پینٹ کرنے میں کنیز نبوی صاحبہ نے زبان اور لہجے کا خیال نہیں رکھا۔ ''کامی ایک شہری لڑکی کی صاف زبان بولتی نظر آتی ہے۔ فارم ہاؤس سے واپسی پر ڈرائیور کامی سے ہمدردی اور خاں صاحب کی ہوس پرستی کے حوالے سے بات کرتا ہے تو وہ حقیقت ہونے کے باوجود غیر حقیقی سی ہے ڈرائیور کو کامی کو لے جاتے وقت اشاروں کنایوں میں بات سمجھانی تھی جس سے کہانی بنت اور تکنیکی اعتبار سے مضبوط ہوتی۔ بہر حال کنیز نبوی لکھنے کا ہنر جانتی ہیں۔ نثار احمد صدیقی کی کہانی ایک جذباتی رومانی لہر میں لکھا جانے والا افسانہ ہے۔ غزلیات کے پہلے حصّے ''رفعتِ عالم'' سید مشکور حسین یاد، شبنم شکیل، بی ایس جین جوہر، آصف ثاقب، مہندر پرتاپ چاند، ڈاکٹر مناظر عاشق، دوسرے حصّے میں پروفیسر زہیر کنجاہی، کرامت بخاری، سید سعید نقوی، شگفتہ نازلی، شوکت جمال، انور جاوید ہاشمی، قیصر مسعود، شان بھارتی، سرفراز نواز اور سمیع نوید کی غزلوں میں غزل کی روایت سے جڑت بھی ہے اور جدید تقاضوں سے ہم آہنگی بھی۔ ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ کی غزل میں واقعہ نگاری کے ساتھ سوانح حیات کا لطف بھی ہے۔

پروین شیر کے فن (مصوری وشاعری) پر لکھے گئے مضامین بہت توجہ سے پڑھے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید کا مضمون ''کٹھن راہوں پر چلنے کا ہنر'' میں پروین صاحبہ کی کتاب ''کرچیاں'' کی روشنی میں اُن کی مصوری وشاعری کا تجزیہ خوب کیا ہے اور دونوں میں ''موسیقی'' کے عناصر کو نمایاں قرار دیا ہے۔ قمر رئیس صاحب کا مضمون دلچسپ ہے۔ عبداللہ جاوید، محمد علی صدیقی کے مضامین مختصر ہونے کے باوجود مفید ہیں۔ ستیہ پال آنند نے اپنی تحریر ''نہال دل پر سحاب جیسے'' میں پروین شیر کے فن کے تقریباً تمام پہلوؤں کی جھلک دکھانے کی کوشش کی ہے۔ پروین شیر کی غزلیں اور خصوصاً نظموں کا انتخاب زبردست ہے۔ مختصر نظموں میں نئے اور انوکھے انداز میں بات کہنے کی کوشش کامیابی سے کی ہے۔

میں نے آج تک پروین شیر کی کوئی کتاب نہیں پڑھی اور نہ ہی میرے پاس اُن کی کوئی کتاب ہے مگر اب اُن کی کتابیں پڑھنے کی خواہش ہے اور یہ کتابیں کہاں سے حاصل ہوں گی اس کا جواب گلزار بھائی یا محترمہ پروین شیر دیں گی۔ ''چہارسُو'' کے خطوط بھی بہت اہم ہیں۔ چہارسو کا ہر پرچہ اہم ہوتا ہے۔ جس کے لیے گلزار جاوید صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں۔

نوید سروش (میرپور خاص)

بھائی گلزار جاوید، آداب۔

اس بار بھی چہارسو اپنی دیرینہ روایات کے مطابق پوری اردو دنیا کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ شعری ونثری دونوں حصے بہت مضبوط ہیں۔ آپ کا بیباک قلم اپنے جلوے الگ بکھیرتا ہے۔ مجھے تو چہارسو بھارت سے نکلنے والے تمام معیاری رسالوں سے بہتر نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ پروف ریڈنگ بھی ایک دردِ سر ہے جبکہ چہارسو ان تمام عیوب سے پاک ہوتا ہے۔ میری جانب سے اس کامیاب پیشکش پر مبارکباد قبول فرمائیے۔

سریواستو رند (نوئیڈا' بھارت)

۔پاکستانی زبانیں۔

اس کتاب میں وطن عزیز میں بولی جانے والی زبانوں سے اہلِ وطن کو متعارف کرانے کی ایک کاوش کی گئی تا کہ لوگ جان سکیں کہ پاکستان ایک بڑے علمی وادبی وثقافتی ذخیرے سے مالا مال ملک ہے۔ چونکہ اس کتاب کا موضوع علمی وادبی تحقیق نہیں بلکہ صرف زبانوں کا تعارف حاصل کرنا مقصود ہے لہذا اس کتاب میں ان زبانوں کی تعریف، آغاز وارتقاء اور ادب کی مختصر جھلکیوں پر اکتفا کیا گیا ہے۔لسانی گروہ، قواعد وضوابط اور صرف ونحو کی باریکیوں میں جائے بغیر زبان کا ایک جامع مگر مختصر تعارف پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔لہٰذا اس کتاب کو لسانیات پر ایک مقالے کے بجائے مطالعہ پاکستان کا حصہ سمجھا جانا چاہیے.....**سید کاشف علی رضوی**

۔غرفۂ غیب۔

کرشن کمار طور کی غزل میں غیر معمولی شعری قوت اور تخیل کارفرما ہے۔**شمس الرحمٰن فاروقی۔**

آپ کے اشعار میں ایک نکتہ ہوتا ہے جسے عرف عام میں مضمون آفرینی کہتے ہیں۔**وارث علوی۔**

طور جیسے شعرا کا شمار اجتہادیوں میں ہونا چاہیے۔**ظفر اقبال۔**

طُور نے دعائیہ لہجہ اپنے داخل سے ابھار کر غزل کو عبادت کے مدار میں داخل کر دیا ہے۔محسوس ہوتا ہے کہ وہ جدید غزل کے خواجہ میر درد ہیں اور ہمیں کائنات دیگر سے متعارف کرا رہے ہیں۔**انور سدید۔**

میں آپ کے شعر کے ساتھ مسلسل سلسلۂ ترسیل میں منسلک ہوں۔**بلراج کومل۔**

آپ کی شعر گوئی کا انداز دوسرے شعراء سے مختلف اور آپ کی لفظیات جداگانہ ہیں۔**مغنی تبسم۔**

میں نے طور کا کلام اسی حیرت آمیز دلچسپی کے ساتھ پڑھا جس طرح پہلے پہل شکیب جلالی، شہریار، محمود شام اور اقبال ساجد کا کلام پڑھا تھا۔**محسن بھوپالی۔**

تم سچے اور پیارے شاعر ہو۔میری اپنی غزل مجھ سے بہت سے سوال کر رہی ہے میں اسے تمہارے سپرد کرتا ہوں۔**بشیر بدر۔**

طُور کا ڈکشن اور مضمون آفرینی حیرت افزا ہے اور انہیں صاحب طرز غزل گو ثابت کرتی ہے۔**قیصر نجفی۔**

۔تلخ نوائی۔

جب جناب فخر الدین کیفی کے چند کالم پڑھے تو میں ان سے بہت متاثر ہوا۔یہ نہایت سلیس، سادہ اور شستہ زبان استعمال کرتے ہیں۔کوزہ میں دریا بند کر دیتے ہیں۔ان کی تحریروں میں پاکستان اور پاکستانی عوام سے بے انتہا محبت کی جھلک نظر آتی ہے۔وہ زہر ہلاہل کو کسی قیمت پر بھی قند نہیں کہتے اور اپنا ضمیر صاف رکھتے ہیں۔عموماً کالم نگار کسی چھوٹی بات کو دُم چھلّے لگا کر پیچیدہ بنا دیتے ہیں۔فخر الدین کیفی صاحب بڑی بات کو مختصر الفاظ میں بیان کر کے آپ کی توجہ کو اس طرح مبذول کر لیتے ہیں کہ کالم ختم کئے بغیر آپ کی تسکین نہیں ہوتی.....**ڈاکٹر عبدالقدیر خان**

○

ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی

خواب کا رشتہ
(افسانے)
شہناز خانم عابدی
ذرا بارش کو تھمنے دو
بھاگتے لمحے
(افسانے)
عبداللہ جاوید